ماہنامہ

گھر کے ہر فرد کے لئے

پاکیزہ

کراچی

عید مبارک

نومبر 2012

نگران اعلیٰ
معراج رسول

عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ اختر
میمونہ خورشید، عطیہ عمر [illegible] آپ کے ذوق کی نذر



مدیرۂ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
انجم انصار

معاون
آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
فوٹو گرافر: موسیٰ رضا



جلد 40 • شمارہ 08 • نومبر 2012 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



حج مسلمانان عالم کے اتحاد کا عظیم مظہر ہے، جو اتحاد، اخوت اور یگانگت کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے اور ہمیں اتحاد، اتفاق اور امن و آشتی کا مکمل درس دیتا ہے۔

یہ ایک جامع عبادت ہے کیونکہ اس میں تمام عبادات کامل روحانیت کے ساتھ یک جا ہو جاتی ہیں۔

حج کی ادائیگی میں جہاں بے شمار حکمتیں پنہاں ہیں، وہیں اس کی ایک بڑی حکمت اتحاد امت مسلمہ بھی ہے

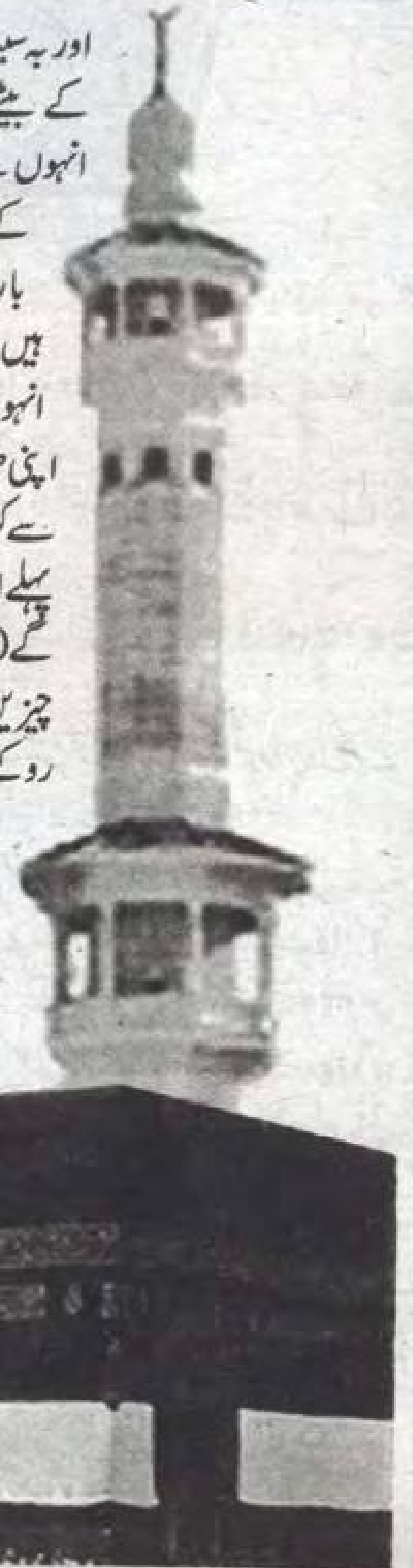
حج کے دنوں میں صبح شام ایک ہی صدا حرم کے اطراف میں گونجتی ہے جو تمام حاجیوں کے دل و زبان سے ادا ہوتی ہے۔

اے اللہ تیرے دربار میں، میں گناہ گار حاضر ہوں، تمام تر تعریف و حمد تیرا ہی حق ہے، احسان کرنا تیرا ہی کام ہے، تیرے اقتدار کی حقانیت، اس کی بزرگی و برتری اور وحدانیت کا اقرار اور غیر خداؤں سے انکار، خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے رب کے آگے سربہ سجود ہونے کا نام ہی درحقیقت حج ہے یہ نظارہ کس قدر روح پرور ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک سمندر ہے جو رو رو کر دعائیں مانگ رہا ہے۔ ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے، جلال کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔ سفید احرام میں...... سب رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ التجائیں ہیں، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ و استغفار ہے۔

یہ موقع زندگی میں خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے، کتنے ہی پیسے والے ہیں جو دنیا کا چپہ چپہ گھوما کرتے ہیں اور بار بار گھومتے پھرتے ہیں مگر حج ان کے نصیب میں نہیں ہوتا...... اس لیے جو وہاں پہنچ جاتا ہے...... وہ اللہ کا خاص مہمان ہوتا ہے...... سو وہاں پہنچ کر مانگ لو، دین کے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، کوئی آرزو، کوئی تمنا، کوئی مراد چھوٹ نہ جائے، یہ سب سے بڑے کریم کا دربار ہے جو یہاں آنے والوں کو محروم نہیں جانے دیتا۔ اس لیے دل کھول کر مانگیں کہ دینے پر قادر صرف وہی قادر مطلق ہے۔

یارب العالمین ہر مسلمان کو حج کی سعادت عطا فرما اور ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہم سب کو دونوں جہاں میں آسانیاں عطا فرما، آمین ثم آمین۔

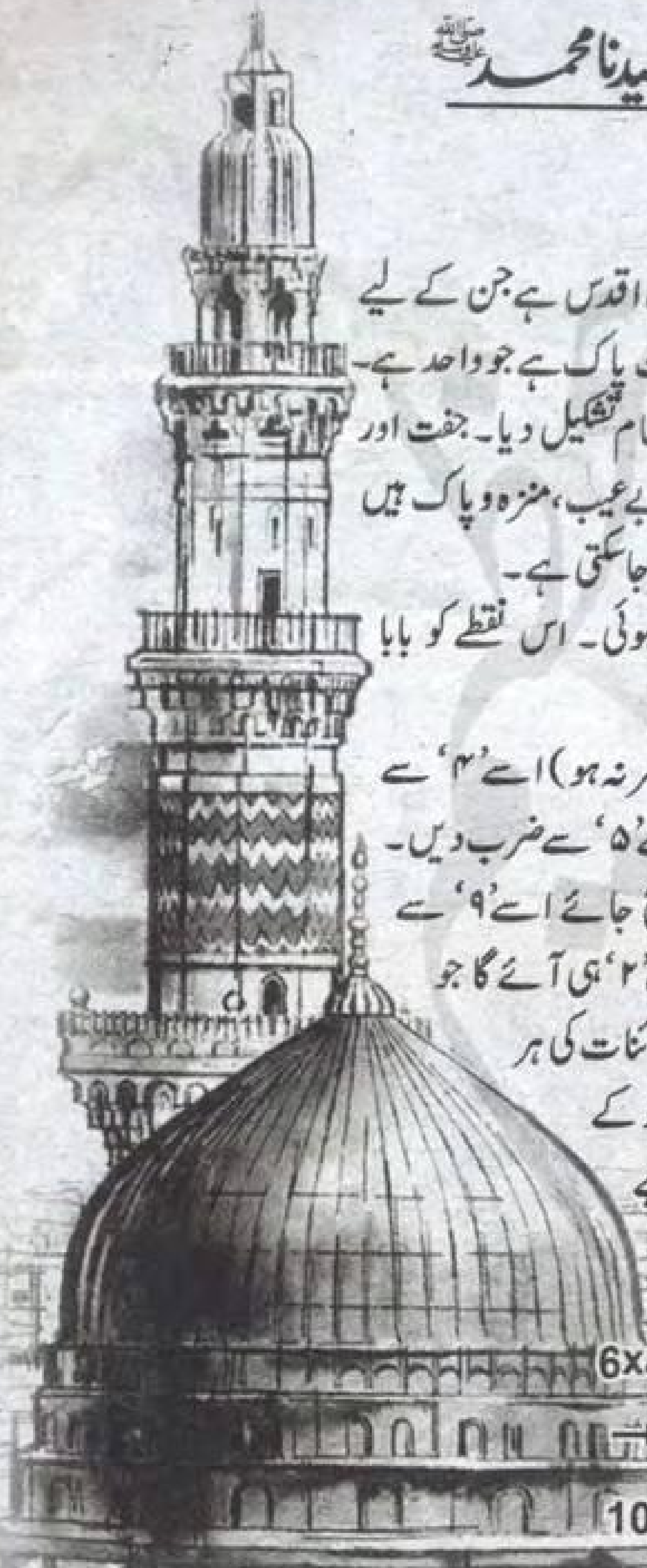
مدیرہ
انجم انصار



اور بہ سبب ان کے (اس) قول کے کہ بے شک ہم نے مسیح (یعنی) مریم کے بیٹے عیسیٰ (جو) اللہ کے رسول (تھے ان) کو قتل کر ڈالا حالانکہ نہ انہوں نے اس کو قتل کیا نہ اسے سولی دی لیکن ان کے لیے (دوسرا شخص مسیح کے) مشابہ کر دیا گیا اور بے شک جن لوگوں نے عیسیٰ (کے بارے) میں اختلاف کیا یقیناً وہ اس (کی طرف) سے شک میں ہیں سوا (اپنے) خیال کی پیروی کے انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں اور انہوں نے اسے بالیقین نہیں قتل کیا (۱۵۷) بلکہ اسے (تو) اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے (۱۵۸) اور اہل کتاب سے کوئی (اس وقت موجود) نہ ہوگا مگر یہ کہ اس پر اس کے مرنے سے پہلے ایمان لائے گا اور وہ (یعنی عیسیٰ) ان پر قیامت کے دن گواہ ہوں گے (۱۵۹) پس یہود کے گناہ کے سبب سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں حرام کر دیں بہ سبب ان کے روکنے کے اللہ کی راہ سے بہت لوگوں کو (۱۶۰) اور بہ سبب ان کے سود لینے کے حالانکہ وہ بے شک اس سے منع کیے گئے تھے اور بہ سبب ان کے لوگوں کا مال ناحق کھا لینے کے اور ان میں سے کفر پر (قائم) رہنے والوں کے لیے ہم نے درد دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (۱۶۱) لیکن ان میں سے جو لوگ علم (دین) میں ثابت قدم ہیں اور (جو لوگ) ایماندار (ہیں یعنی) جو کچھ (اے نبی ﷺ) تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو تم سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر (بھی ایمان لاتے ہیں) اور نماز پڑھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں یہی لوگ ہیں جنہیں ہم عنقریب بڑا (اچھا) بدلہ دیں گے (۱۶۲)

(سورۃ نسا آیت نمبر ۱۵۷ تا ۱۶۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ



والشفع والوتر ہ (۳۔الفجر)

ترجمہ: اور جفت اور طاق کی قسم۔''

یہاں جفت سے مراد حضور ﷺ کی ذات اقدس ہے جن کے لیے یہ کائنات تخلیق ہوئی اور 'طاق' اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے جو واحد ہے۔ تنہا ہے اور اسی اکیلے نے کائنات کا یہ سارا نظام تشکیل دیا۔ جفت اور طاق کی قسم اس لیے کھائی گئی کہ دونوں ہستیاں بے عیب، منزہ و پاک ہیں اور صرف پاک و بے عیب ہستیوں کی ہی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

یہ کائنات حضور ﷺ کے لیے تخلیق ہوئی۔ اس نقطے کو بابا گورونانک نے یوں بیان فرمایا ہے۔

''کوئی بھی مکمل عدد لیجیے (اس میں کوئی کسر نہ ہو) اسے '۴' سے ضرب دے کر اس میں '۲' جمع کر لیں اور پھر اسے '۵' سے ضرب دیں۔ حاصل ضرب کو '۲۰' پر تقسیم کریں اور جو عدد بچ جائے اسے '۹' سے ضرب دے کر اس میں '۲' جمع کر لیں تو جواب '۲' ہی آئے گا جو اسم محمد ﷺ کے حروف کا مجموعہ ہے اسی طرح کائنات کی ہر شے کے مکمل اعداد کا مجموعہ 'محمد ﷺ' کے عدد کے برابر آتا ہے اس لیے یہ کائنات محمد ﷺ کے لیے بنائی گئی ہے۔

مثلاً

6x4= 24+2= 26x5 130÷20

→ → → باقی بچا 10

10x9= 90+2= 1+1=2

→ → → 2 عدد حاصل ہوا

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



عکسِ ماہ

قسط 16

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہوجائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے، ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ خیر دین کے خاندان نے ایف آئی آر کے جواب میں ایک مقامی ایم پی اے کی مدد لی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے۔ خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے۔ ایبک فاطمہ سے کہتا ہے کہ اس کی ممی اس سے ملنا چاہتی ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ ایبک کی والدہ اسے کہتی ہیں کہ وہ اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھے فاطمہ کی روم میٹ خانزہ اسے بتاتی ہے کہ اس کی طرح ایبک کے بھائی ایزد نے بھی اس کی بہن سے اسی طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ 26 سال بعد اس شیشے کو وہی دیکھ کر ایبک رک گیا تھا۔ شیر دل حیران تھا کہ وہ عکس مراد علی کو پہچان نہیں پایا۔ عکس اسی گھر میں آگئی تھی لیکن وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا چاہتی تھی عکس مراد بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اس نے بغیر بتائے خیر دین کو بھی بلوا لیا تھا۔ چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے یہ بھی ان ہی سے ایک تھا۔ خیر دین کی طبیعت خراب ہونے پر شیر دل انتظام کر کے عکس کو سنگاپور سے پاکستان بھیجتا ہے اور اپنا موبائل بھی عکس کو دے دیتا ہے۔ موبائل پر شہر بانو کا میسج آتا ہے تو عکس فون آنے پر شیر دل کو بتا دیتی ہے۔ موبائل پر کسی منزہ فاروق کی کال آتی ہے اور وہ عکس کے نام بتانے سے پہلے ہی کہتی ہے کہ وہ عکس مراد علی ہے۔ عکس حیران رہ جاتی ہے اور شیر دل کا دوبارہ فون آنے پر اسے بتاتی ہے۔ شرمین مسز ایلفنس سے ملتی ہے اور ان کے سب بتانے پر شہباز سے پوچھتی ہے کہ اس نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا لیکن شہباز چڑیا کو جاننے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ بات اتنی بڑھتی ہے کہ شرمین شہباز سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ شیر دل منزہ سے کہتا ہے کہ انہوں نے شہر بانو سے شیر دل کے منع کرنے کے باوجود بات کی اور شہر بانو نے شرمین کو سب بتا دیا۔ شہر بانو، شرمین سے پوچھتی ہے کہ اس نے طلاق کیوں لی لیکن شرمین بات ٹال دیتی ہے۔ شہر بانو بتاتی ہے کہ اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خیر دین کی خرابی طبیعت کا سن کر حلیمہ بھی آجاتی ہے۔ عکس، حلیمہ سے جواد کے نہ ہونے اور خیریت نہ لینے پر افسوس کا اظہار کرتی ہے جواد کو فون کرتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کی ممی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ منزہ، بختیار شیر دل سے کہتی ہے کہ وہ عکس کو سسپینڈ کروائیں اور بختیار شیر دل یہ کام کر گزرتے ہیں۔ خیر دین کا دل عکس کے نکاح کی تقریب میں ویسے ہی خدشوں کا شکار تھا جیسے کسی بھی باپ کا اپنی بیٹی کی رخصتی کے وقت ہوتا ہے۔ شیر دل خیر دین کو دیکھنے اسپتال آتا ہے تو عکس اس کو منع کر دیتی ہے کہ وہ خیر دین کو کیس کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ شہر بانو واپس پاکستان آجاتی ہے شیر دل، بختیار شیر دل کو بتاتا ہے کہ شہباز حسین نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی جب وہ نو سال کی تھی اس لیے شہباز حسین نے خیر دین کو جاب سے نکال دیا تھا۔ عکس، غنی حمید کو بتاتی ہے کہ اس کی منگنی ختم ہو گئی ہے، غنی حمید کیس کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ خیر دین، بختیار شیر دل کو ایبک کے والد کے طور پر جانتا تھا لیکن اس کی بیوی کو دیکھ کر وہ چونک جاتا ہے۔ بختیار شیر دل، خیر دین سے معذرت کرتے ہیں۔ شہر بانو اور شیر دل کے درمیان عکس کی وجہ سے تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ خیر دین، عکس کو بتاتا ہے کہ بختیار شیر دل معذرت کے لیے آئے تھے۔ خیر دین، عکس سے کہتا ہے کہ اس نے بتایا نہیں کہ شیر دل کا تعلق شہباز حسین کے خاندان سے ہے اور نہ ہی اس کیس کے بارے میں۔ شہر بانو امریکا جانا چاہتی ہے تو شیر دل کہتا ہے کہ مثال اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ شہر بانو امریکن قونصلیٹ کی مدد حاصل کر کے مثال کو لے کر چلی جاتی ہے۔ عکس اور خیر دین، شہر بانو کے اس عمل پر حیران تھے۔ دس سال بعد اس گھر میں عکس مراد علی کی پوسٹنگ ہوئی لیکن اب وہ کمشنر کی حیثیت سے آئی تھی۔ شہر بانو کو ائرپورٹ پر شرمین اور فاروق لینے آتے ہیں۔ بختیار اور منزہ اپنا سفر ملتوی نہیں کرتے وہ بڑی مشکل سے شہر بانو کو ملاقات کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ خیر دین، عکس سے شیر دل اور شہر بانو کے بارے میں پوچھتا ہے تو عکس کہتی ہے کہ یہ ان کا پرسنل ایشو ہے۔ عکس، مسز ایلفنس سے ملتی ہے تو ان کو پتا چلتا ہے کہ وہ ڈپٹی کمشنر ہے۔ بختیار اور منزہ، شہر بانو کو واپس لانے پر تو آمادہ نہیں کر سکے لیکن انہوں نے اسے شیر دل سے بات کرنے پر راضی کر لیا لیکن ان میں مفاہمت نہ ہو سکی۔ عکس کو شیر دل کے نروس بریک ڈاؤن کا پتا چلتا ہے تو وہ لاہور اس سے ملنے جاتی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

اس اسٹینڈنگ مرر میں اپنے عکس پر پہلی نظر پڑتے ہی شہر بانو نے اپنی یادداشت کے سارے خانوں کو جسم سے اترے ہوئے لباس کی جیبوں کی طرح کھنگالنا اور جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ کتنے سال بعد اس نے اس مرر کو دیکھا تھا اور اس مرر میں کیا کیا دیکھا تھا۔

آئینہ اتنے سالوں کے بعد آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا...... کم آب و تاب کے ساتھ لیکن اسی وقار کے ساتھ جس کے ساتھ شہر بانو نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ گھر کا ایکسٹیریئر مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ آئینہ جیسے کسی شہزادی کا وہ رومال تھا جسے وہ پہاڑ کے پھٹنے اور اس کے اندر غائب ہو جانے سے پہلے شہزادے کی رہنمائی کے لیے باہر چھوڑ گئی تھی...... واحد سراغ...... ہر بھید تک لے جانے اور اسے پانے والا...... چند لمحوں کے لیے اس آئینے کو دیکھتے ہوئے شہر بانو کو یوں لگا تھا جیسے وہ تب ہی وہاں سے ہٹے گا، غائب ہو گا جب اسے کھڑے کھڑے دیمک لگ جائے گی پھر ایک دن وہ لکڑی کے فریم سے برادے کے ایک ڈھیر اور اس آئینے سے شیشے کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ پتا نہیں وہاں کھڑا وہ کس، کس کا عکس دیکھتا اور دکھاتا رہا تھا۔

شہر بانو نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں نظر آنے والی عمارت کے بیرونی حصے کے عکس کو دیکھنے لگی۔ انگلیوں کی پوروں پر اس نے جیسے دو سال گنے تھے جب وہ آخری بار اس گھر سے گئی تھی۔ وہ گھر جو اس کی زندگی کا خوب صورت ترین اور بدصورت ترین باب تھا۔ وہ گھر جس سے زیادہ محبت اور نفرت اسے کبھی کسی جگہ سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ گھر جو وہاں آ کر بسنے والے انسانوں کے تمام احساسات سے بے نیاز آج بھی اسی تمکنت سے وہاں کھڑا تھا۔

پھر آئینے میں اپنے اور اس گھر کے عکس کے درمیان اس نے یک دم باذل کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار مسکرائی۔ اس نے زندگی میں اس مرد کے علاوہ صرف ایک مرد کو...... وہ آگے کچھ سوچ نہیں پائی۔

باذل اب اس کے عقب میں کھڑا اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”You look lovely“۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے ایسی باتیں کرنے کی عادت تھی۔

”Thank you for flattering me“۔ شہر بانو نے جواباً کہا۔ باذل اس کے عکس پر نظر جمائے ہوئے بے اختیار مسکرایا۔ گہری، گرم جوش، بہت کچھ یاد دلا دینے والی آنکھیں...... بے حد باریک ہونٹوں پر آنے اور کھلنے والی بے ساختہ اور خمار مسکراہٹ...... اور یہ مسکراہٹ کیا، کیا طوفان نہیں اٹھا دیتی تھی...... کون کون سی قیامت تھی جو برپا نہیں کر دیتی تھی...... اسے اپنی بہو روشین کی شکایتیں یاد آئیں۔

”You are more than welcome“۔ باذل نے ذرا سا ہنس کر جیسے کسی ندامت کے بغیر بے حد دھڑلے سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے میں پہلی بار اس گھر میں کب آئی تھی؟“ شہر بانو نے آئینے میں باذل کے عکس کے عقب میں موجود عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

وہ اب بھی اس کے کندھے پر اسی طرح دونوں ہاتھ جمائے ٹکائے کھڑا تھا۔ شہر بانو اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی...... نرم، سہارا دیتا ہوا دباؤ۔ چند لمحوں کے لیے جیسے اس کا دل باذل سے لپٹ جانے کو چاہا۔

”جب......“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق سے نہیں نکل سکی۔ آنسوؤں کے ایک ریلے نے اس کی

قوتِ گویائی اور بینائی دونوں کو بیک وقت مفلوج کیا تھا۔ یادیں نہیں تھیں...... درد کے آبلے تھے جو گرم پانی کے چشموں کی سطح پر ابھرنے والے بُلبلوں کی طرح پھٹنے لگے تھے۔ کندھوں پر ٹکے وہ دونوں ہاتھ سرعت سے اس کے بازوؤں پر آئے پھر انہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ حصار جس نے زندگی میں کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا...... وہ حصار جو اس کے لیے ایک عطا تھا...... کسی کا تحفہ...... باذل کے بازوؤں کے حصار میں روتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کون سے کانٹے پہلے نکال کر اسے دکھائے...... وہ جو پاؤں میں تھے یا وہ جو دل میں تھے...... سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی...... اس کو دوبارہ بُھلانے کے لیے وہ کیا کرے گی۔

اس آئینے کے سامنے کھڑے اسے شہباز حسین یاد آتے تھے وہ اس گھر میں پہلی بار ان کے ساتھ آئی تھی، اپنے ماں باپ کے ساتھ اور پھر وہ اور اس کی زندگی اس گھر کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گئی تھی اور پھر اسی گھر میں کئی سالوں بعد اسے بُھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ دِکھا تھا۔

اس گھر کے برآمدے میں لگا وہ آئینہ شہزادی تک پہنچانے والا واحد سراغ...... اب جیسے شہزادے کو اس پہاڑ کی اس کھوہ میں لے آیا تھا جہاں ایک شہزادی کو کئی سال پہلے گہری نیند سلا دیا گیا تھا اور وہ شہزادی آنکھ کھلنے کے بعد ملکہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

"شہر بانو کی ماں نے ایک لاکھ روپے کا چیک دیا تھا مجھے اس وقت...... میں نہیں لینا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے زبردستی مجبور کیا۔ وہ ان نقصانات کی تلافی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی جو اس کے شوہر کی وجہ سے مجھے اور تمہیں ہوئے۔"

عکس مراد علی گُنگ خیر دین کو بولتے سنتی رہی وہ مدھم آواز میں بول رہا تھا۔

"میں نے اسی رقم سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس وقت ایک لاکھ کی وہ رقم میرے بہت کام آئی تھی۔ وہ نہ ملتی تو شاید میں اور تم آج یہاں نہ کھڑے ہوتے۔ شہر بانو کی ماں نے بہت بڑا احسان کیا تھا ہم پر...... میرے کندھے آج بھی اس کے اِس احسان کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں...... شہباز نے جو کیا وہ شہباز کا فعل تھا مگر اس کی بیوی نے ہمارے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی اور اس کی بچی بھی ویسی ہی نیک ہو گی۔ میں دعا کرتا رہتا ہوں اس بچی کے لیے...... گھر بڑی مشکل سے بنتے ہیں...... اللہ اس کے گھر کو سلامت رکھے۔ تمہیں شیر دل کو سمجھانا چاہیے تھا۔"

بعض دفعہ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے نظر ملانا اس سے مشکل اور سر اٹھانا اس سے دوبھر...... وہ بھی خیر دین کے سامنے بیٹھی اس وقت انہی کیفیات کا شکار ہو رہی تھی...... شاک، بے یقینی، رنج اور شرمندگی...... وہ خیر دین کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ ان انکشافات نے اس کی عزتِ نفس کو مٹی کر دیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کا نانا جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

"مجھے آفس کے لیے نکلنا ہے نانا۔" کئی منٹ ایک بت کی طرح بیٹھے حیرانی و پریشانی کے عالم میں خیر دین کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بے ساختہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اسے اس ایک جملے میں بھی اپنی ہی آواز میں عجیب سی شکستگی اور لرزش محسوس ہوئی تھی اور اسے یقین تھا وہ دونوں چیزیں خیر دین سے بھی نہیں چھپی ہوں گی۔ وہ خیر دین کو اب شیر دل اور شہر بانو کی طلاق کے بارے میں نہیں بتانا چاہتی تھی، نہ ہی یہ کہنا چاہتی تھی

کہ...... جس گھر کی سلامتی کے لیے وہ دعائیں کر رہا تھا وہ چند مہینے پہلے ٹوٹ چکا تھا۔

وہ اس صبح ایک عجیب سی ذہنی کیفیت کے ساتھ اس گھر سے نکلی تھی۔ خیر دین، شرمین سے کوئی مالی مدد لینے پر کیسے آمادہ ہو گیا تھا، اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ اسے اب کیوں بتا رہا تھا۔ وہ اسے کیا جتانا چاہتا تھا...... کیا باور کروا رہا تھا...... یہ کہ وہ شیر دل اور شہر بانو کے درمیان نہ آئے...... یہ کہ وہ ان کا گھر توڑنے کی کوشش نہ کرے...... کیونکہ ان کی زندگی پر شرمین کا بہت بڑا احسان تھا...... وہ بچی نہیں تھی اور بچی ہوتی تب بھی خیر دین کی پہیلیاں بوجھنا چڑیا کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا...... کہیں نہ کہیں خیر دین اس کے حوالے سے بداعتمادی کا شکار ہو رہا تھا۔ شیر دل کے حوالے سے اس کا اعتراف سننے کے بعد شاید زیادہ ہو گیا تھا...... وہ بند باندھنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اسے وہ روک لیتا اور جیسے شہر بانو اور شیر دل کا گھر بھی بچا لیتا...... اور عکس کو اسی بات پر رنج ہو رہا تھا...... وہ اس کا نانا تھا پھر بھی اسے اس پر شک ہوا تھا...... اپنی دی گئی تربیت اور عکس کے اس صاف اعلان کے باوجود کہ وہ شیر دل سے شادی نہیں کرنا چاہتی، وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ شیر دل کے ساتھ انوالوڈ تھی اور وہ اس سے ان دونوں کا گھر بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار چڑیا کو اپنے نانا سے گلہ ہوا تھا اسے دِلی رنج ہوا تھا۔ اس دن وہ آفس میں بہت اپ سیٹ رہی، پچھلے دن شیر دل سے ہونے والی ملاقات اور اس کی حالت دیکھ کر ہونے والا اضطراب وہ بھول گئی تھی۔ اگر کچھ اسے اب اضطراب میں ڈالے ہوئے تھا تو وہ خیر دین کا یہ انکشاف اور یہ رویہ تھا...... چاہنے کے باوجود وہ پورا دن شیر دل کو کال یا میسج نہیں کر سکی۔

شام کو وہ گھر واپس آئی تو یقیناً اس کا چہرہ اتنا ستا ہوا تھا کہ خیر دین صبح کی طرح اس بار بھی اس کی طبیعت کے بارے میں فکر مند ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"میں ٹھیک ہوں نانا۔" اس نے خیر دین سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"مجھے کیوں ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" خیر دین نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اور اس کی اس بات پر عکس نے خیر دین کو بے حد شاکی نظروں سے دیکھا۔

"آپ کو اب میری بات پر یقین نہیں آتا اس لیے۔" اس جواب میں جو سوال تھا اس کا جواب خیر دین کے پاس نہیں تھا۔ ان دونوں نے ایک عمر ساتھ گزاری تھی، ایک دوسرے کی رمزوں اور ان کہی باتوں کو سمجھنے کے لیے انہیں کسی لغت اور ستارہ شناسی کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر دین نے اسے صبح جو سمجھانا چاہا تھا وہ جانتا تھا وہ بات چڑیا سمجھ گئی تھی اور اب چڑیا کا ردِعمل...... وہ رنجیدہ تھی اور خیر دین بے قرار ہو رہا تھا۔

"کھانا کھا لو...... تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔" خیر دین نے بات بدل دی تھی۔ وہ روز ہی اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا... وہ اور عکس دونوں ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے اور خیر دین یہ بھی جانتا تھا کہ چڑیا بھی کھانا چھوڑ کر نہیں بیٹھتی تھی...... بھوک نہ ہونا، کھانا نہ کھانے کی وجہ بن سکتی تھی لیکن رزق سے ناراض ہو کر بیٹھنا خیر دین نے اسے کبھی نہیں سکھایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے عکس کا دل چاہا وہ ان سے شکایت کرے، وہ کام جو اس نے ساری زندگی نہیں کیا...... صرف ایک لمحے کے لیے اور پھر وہ خاموش ہی رہی تھی...... وہ گِلہ کرتی تو خیر دین کو تکلیف ہوتی۔ ویسی تکلیف جیسی آج صبح اُن کے ایک انکشاف سے اُسے ہوئی تھی۔ وہ ایسا نادانستگی میں کر گئے تھے وہ اگر کرتی تو دانستہ کرتی...... وہ خیر دین کو جیسے غلطی کی گنجائش دے رہی تھی۔

"بعض دفعہ انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔" خیر دین نے اس کی خاموشی کو شاید زندگی میں پہلی بار غلط پڑھا تھا اس کا خیال تھا وہ شرمین سے لی جانے والی مدد پر اَپ سیٹ تھی۔

''نانا آپ نے جو کیا، ٹھیک کیا آپ کو مجھے کوئی بھی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی اس ایک لاکھ روپے کی وجہ سے میری نظر میں آپ کی قدر و قیمت میں کوئی کمی ہوئی ہے۔'' عکس نے خیر دین کو بیچ میں ہی ٹوک دیا تھا۔ صبح سے اس کے سینے پر دھرا بوجھ پل بھر میں سرک گیا تھا۔ خیر دین نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

''کھانا کھاتے ہیں۔'' وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے ایک بار پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

شیر دل نے بے یقینی سے منزہ کو دیکھا اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے اس طرح کی بات کر سکتی تھیں۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی رات کا کھانا کھانے کے لیے آیا تھا۔ بختیار شہر سے باہر تھے اور ڈنر ٹیبل پر وہ اور منزہ ہی تھے۔

''آپ کس کی شادی کی بات کر رہی ہیں؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

''تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں شیر دل۔'' منزہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ممی آپ ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟'' شیر دل اب بھی جیسے اس شاک سے سنبھل نہیں پایا تھا۔ عکس مراد علی کل اس سے ملنے آئی تھی اور آج منزہ اس سے اس کی شادی کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔

''تم اسے ہمیشہ سے پسند کرتے تھے...... محبت کرتے تھے...... شادی کرنا چاہتے تھے اس سے...... تمہیں یاد ہے؟'' وہ بہت معمول کے انداز میں اس سے اس طرح بات کر رہی تھیں جیسے اس کی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''میں بے وقوف تھی کہ میں نے اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ تمہیں شادی کرنے نہیں دی، میری غلطی تھی وہ۔'' شیر دل نے ان کی بات کو بے حد خفگی کے ساتھ کاٹا۔

''ممی وہ چیپٹر بند ہو چکا ہے۔ وہ انگیجڈ ہے اور مجھے شادی نام کی کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اس نے دوٹوک انداز میں ماں سے کہا۔

''اس کی انگیجمنٹ ختم ہو چکی ہے۔'' منزہ نے بے اختیار کہا اور جیسے کہہ کر پچھتائیں۔

''آپ سے کس نے کہا؟'' وہ حیران ہوا۔ پچھلی رات وہ دونوں بہت دیر بات کرتے رہے تھے لیکن عکس نے اپنے حوالے سے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب وہ یک دم منزہ کے منہ سے اس کی منگنی کے ختم ہونے کی بات سن رہا تھا۔

''تم جانتے ہو اس کے منگیتر کی فیملی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں...... میں نے کسی فنکشن میں ان کی فیملی کے کسی ممبر سے یہ بات سنی تھی۔'' انہوں نے حتی الامکان اپنے لہجے اور چہرے کو بے تاثر رکھا تھا۔ وہ شیر دل کو کوئی اور اندازہ لگانے کا موقع دینا افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ چند لمحے خاموش رہا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ منزہ کی بات پر کس طرح ری ایکٹ کرے۔

''اگر اس کی انگیجمنٹ ختم ہو گئی ہے تو بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میرے ساتھ اس کی شادی کا سوچنے لگیں۔'' اس نے چند لمحوں بعد منزہ سے کہا۔ ''اس کے پاس مجھ سے بہتر آپشنز ہیں اور میں چاہتا ہوں وہ ان میں سے کسی کا استعمال کرے۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں ماں سے کہا۔

''وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے، نہ ہوتی تو یہاں کبھی نہ آتی۔'' منزہ نے بے اختیار کہا۔

''ممی مجھے شادی میں انٹرسٹ نہیں ہے اور میں جس فیز سے گزر رہا ہوں اس میں، میں کسی بھی صورت سے شادی کر کے اس کی زندگی عذاب میں نہیں ڈالوں گا...... خاص طور پر عکس کی۔'' اس نے منزہ کو بات مکمل کرنے سے پہلے ٹوک دیا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم بالکل ٹھیک ہو۔ نروس بریک ڈاؤن ہو جانے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ......'' شیر دل نے ایک بار پھر بڑی دُرشتگی سے ماں کی بات کاٹی۔

''ممی میری چھ سال پرانی شادی ختم ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے، میرے پاس میری بیٹی کی کسٹڈی نہیں ہے اور نہ مجھے کوئی امید نظر آ رہی ہے اس سے ملنے کی...... میں اس بریک اپ سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور آپ مجھے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے یہ اتنا آسان ہے میرے لیے ایک گھر ٹوٹنے کے بعد دوسرا گھر بنا لینا اتنا آسان ہے؟'' وہ بری طرح خفا ہو رہا تھا۔ منزہ نے عکس سے ملاقات کے بعد اس میں آنے والی تمام خوشگوار تبدیلیوں کو منٹوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔

''تم اسی سے تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے...... عکس سے ہی تو......'' منزہ نے جیسے بڑی بے چارگی سے کہا۔

''ہاں کرنا چاہتا تھا دس سال پہلے...... اب نہیں۔'' شیر دل نے اسی خفگی کے ساتھ ماں کی بات کاٹی۔

''میری غلطی تھی کہ میں نے اس وقت عکس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہونے دی۔ کاش میں اس وقت مان جاتی۔'' منزہ نے اداسی، رنجیدگی اور پچھتاوے کا بڑے کھلے الفاظ میں اظہار کیا۔

''ممی میں فی الحال یہاں بیٹھ کر آپ کے پچھتاوے اور غلطیاں نہیں سننا چاہتا۔ I have had enough of it آپ نے میری زندگی میں جتنا mess کرنا تھا آپ کر چکی ہیں، بس اور کچھ نہ کریں...... اور عکس اور میں صرف دوست ہیں۔ میں اس کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا... نہ ہی سوچوں گا۔'' وہ کھانا کھا[illegible] ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ منزہ نے بے حد بے چارگی سے اسے جاتا دیکھا۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد نہیں تھا لیکن وہ اس کے سامنے شرمساری کی وجہ سے بے حد تکلیف میں تھیں۔ اس کا گھر ان کی وجہ سے ٹوٹا تھا۔ یہ سب جانتے تھے اور کوئی نہ بھی جانتا تو [illegible]دا اچھی طرح جانتی تھیں۔ شیر دل کے بریک اپ کی ساری ذمے داری شہر بانو کے سر ڈالنے کی کوششوں کے باوجود انہیں یہ احساس جرم تھا کہ یہ تباہی ان کی وجہ سے آئی تھی، اس سارے مسئلے میں وہ اگر شیر دل اور اپنے شوہر کو سپورٹ کرتیں تو یہ مسئلہ اتنا خراب نہ ہوتا۔

عکس مراد علی کو انہوں نے خود اپنے لیے ایک ''بھوت'' بنایا تھا وہ بھوت نہیں تھی۔ جھوٹی انا، ضد، خاندانی تفاخر دوبارہ ان کے خاندان میں تباہی لایا تھا اور انہیں اس کا احساس پہلی بار ہو رہا تھا۔ خود غرضی تھی جو اب بھی ویسے ہی ان کے وجود پر پَر پھیلائے بیٹھی تھی...... انہیں اپنے بڑے بیٹے کی زندگی میں ایک بار پھر سے سکون اور استحکام چاہیے تھا اور انہیں یہ سکون اور استحکام عکس مراد علی کی شکل میں نظر آ رہا تھا تو وہ یک دم سب کچھ بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے رشتہ جوڑنے پر تیار ہو گئی تھیں۔

شیر دل کے اس طرح کے رویے کے بعد بھی انہوں نے عکس اور خیر دین سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اور بختیار، شیر دل کے حوالے سے بہت متفکر تھے اور چاہتے تھے کہ فوری طور پر اسے بھی اپنی زندگی دوبارہ کسی کے ساتھ گزارنے پر آمادہ کریں لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ شہر بانو سے طلاق کے بعد

ابتدائی چند دنوں میں شیر دل سے اس حوالے سے کچھ بات کرنے پر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ پہلے ہی sedates (مسکن ادویہ) پر تھا اور اس ایشو کے زیرِ بحث آنے کے بعد اس کے panic attacks (ذہنی دورے) بڑھ گئے تھے۔ بختیار نے منزہ کو دوبارہ اس سے ایسے کسی معاملے پر بات کرنے سے روک دیا تھا لیکن وہ خود شیر دل کے حوالے سے منزہ ہی کی طرح فکر مند تھے۔ منزہ کے سامنے اس بات کا اظہار نہ کرنے کے باوجود وہ شیر دل کے لیے خائف تھے۔ انہوں نے شہباز کو بھی ایسی ہی حالت سے گزرتے دیکھا تھا اور اس نے ایسے ہی ڈپریشن میں خودکشی کر لی تھی اور بہت بہادر اور دلیر ہونے کے باوجود بختیار کو اس بات کا خدشہ تھا کہ شیر دل anxiety (ہیجان) میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھا لے۔ اسے مستقل طور پر گھر میں اپنی نگرانی میں رکھے رہنا کوئی حل نہیں تھا۔ بختیار کی اپنی بہت ساری مصروفیات تھیں اور وہ ان پروفیشنل مصروفیات کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ منزہ کی بھی ڈھیروں ڈھیر سوشل سرگرمیاں تھیں لیکن وہ اتنے مہینوں سے شیر دل کے لیے سب کچھ چھوڑ کر بیٹھی تھیں اور اب کئی بار ایسا ہونے لگا تھا کہ منزہ کو بھی اسٹریس کی وجہ سے سونے میں دقت ہونے لگی تھی۔ وہ بھی سونے کے لیے اکثر اوقات خواب آور ادویات کا سہارا لینے لگی تھیں اور ان کی یہ حالت بختیار کی تشویش میں اضافہ کر رہی تھی۔ شیر دل کے بریک اپ نے پوری فیملی کو ہر طرح سے ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان حالات میں عکس کی صورت میں منزہ کو جیسے روشنی کی ایک کرن دکھی تھی اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی طرف نہ جاتیں...... اپنے گھر کو گھپ اندھیرے میں ڈوبا رہنے دیتیں۔

☆☆☆

''سوری یار میں کچھ لیٹ ہو گیا۔'' داؤد نے ٹیبل کی دوسری طرف اس کے بالمقابل اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ شہر بانو نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ جانتی تھی اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی ہو گی۔ اس ریسٹورنٹ میں اس ریزروڈ ٹیبل پر بیٹھے وہ قدِ آدم کھڑکی کے شیشے سے باہر سڑک اور سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کو پچھلے ایک گھنٹے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ داؤد کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کے لیے وہاں آئے تھے۔ داؤد نے ایک دن پہلے اسے یہاں ڈنر پر لانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسے چھ بجے شہر بانو کو گھر سے پک کرنا تھا لیکن پانچ بجے کے قریب اس نے شہر بانو کو کال کر کے وہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ٹائم پر اس کے پاس پہنچ نہیں پائے گا اور وہ اگر اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر اسے پک کرنے کے بعد ریسٹورنٹ لایا تو وہ دونوں بہت لیٹ ہو جائیں گے کیونکہ شرمین کا گھر داؤد کے گھر کے بالکل مخالف سمت میں تھا اور وہ ریسٹورنٹ ان دونوں کے گھروں کے درمیان کسی جگہ پر تھا۔

''بس زارا آئی ہوئی تھی یہاں کوئی سیمینار اٹینڈ کرنے...... اس نے کال کر لیا۔ کافی پر چلے گئے تو تھوڑا ٹائم لگ گیا...... تم کیا لو گی؟'' داؤد نے مینیو کارڈ اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔ زارا کا نام سن کر شہر بانو کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آیا تھا۔ داؤد ہمیشہ اس طرح اس کی بات کرتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی سے کہیں گئی ہی نہ ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا ان دونوں کے بیچ...... کوئی بریک اپ نہیں...... کوئی divorce نہیں...... کوئی تلخی نہیں...... ایک عجیب سے احساس نے اس کے حلق کو کڑوا کیا تھا۔ بھوک پہلے بھی نہیں تھی، اب بالکل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے وہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی...... مثال کو گھر پر چھوڑے...... اور وہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ بیٹھا کافی پیتے ہوئے گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ اس سے یہ کہنا چاہتی تھی...... خفا ہونا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگا یہ موقع مناسب نہیں تھا، وہ اس کا اسپیشل دن تھا وہ کوئی جھگڑا نہیں کر سکتی تھی کم از کم اس

شام کو......

اس کے کانوں میں شرمین کی آواز گونجنے لگی تھی۔ ''اپنے اندر کچھ تبدیلی لاؤ شہر بانو...... تم بہت زیادہ temperamental (غصیلی) ہو گئی ہو...... اتنی rudeness (بے اعتنائی، بے رخی) ٹھیک نہیں...... داؤد نے بھی ایک دو بار شکایت کی ہے تمہاری...... کہہ رہا تھا۔ ''آنٹی شہر بانو کو سمجھائیں...... زارا کے ساتھ بھی یہی پرابلم تھا، وہ بھی اپنے پروفیشن کی وجہ سے اتنی مصروف اور stressed out (ذہنی تناؤ میں) رہتی تھی کہ بات بات پر میرا اور اس کا جھگڑا ہوتا تھا...... میں نہیں چاہتا شہر بانو اور میرا ریلیشن شپ بھی ویسا ہی ہو جائے...... میں جانتا ہوں وہ اپنے بریک اپ کی وجہ سے اپ سیٹ ہے لیکن...... she should move on...... اتنا bitter تلخ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم خود کو بدلو...... تم دونوں کی دوسری شادی ہے۔ زیادہ برداشت اور انڈر اسٹینڈنگ دکھانے کی ضرورت ہے تمہیں۔''

وہ چاہتے ہوئے بھی ذہن سے نہیں جھٹک پا رہی تھی کیونکہ وہ مسلسل داؤد کے حوالے سے ان کی ہدایات سننے کی عادی ہو گئی تھی۔

اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا گفٹ باکس نکال کر اس نے داؤد کے سامنے رکھ دیا لیکن وہ ایکسائٹمنٹ جو اس گفٹ کو خریدتے وقت تھی وہ اسے اب نہیں تھی۔

''اوہ، thank you...... کیا ہے اس میں؟'' داؤد نے مسکراتے ہوئے وہ گفٹ باکس لے لیا۔

''تم خود دیکھ لینا۔'' شہر بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ داؤد نے باکس کو کھولے بغیر بس اسے ہلا کر جیسے کچھ اندازہ کرنے کی کوشش کی۔

''پرفیوم؟'' داؤد نے بالکل ٹھیک guess کیا۔ شہر بانو کچھ حیرانی کے عالم میں ہنسی۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''یار! ساری عمر پرفیومز ہی ملتے رہے ہیں مجھے زارا سے...... اب تو پرفیوم نہ بھی ہو کسی گفٹ میں تو مجھے لگتا ہے پرفیوم ہی ہو گا۔ زارا نے مجھے دنیا کا ہر پرفیوم گفٹ کر ڈالا ہے۔ کریزی ہے وہ پرفیومز کے معاملے میں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ باکس اس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو شہر بانو نے بڑی مشکل سے چہرے پر سجائی تھی وہ ایک بار پھر غائب ہو گئی تھی اور اس بار شہر بانو نے اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ڈنر یک دم ہی ایک بے حد بے مقصد سی چیز بن گیا تھا...... بیکار...... غیر ضروری...... اضافی...... وہ دونوں وہاں نہ بھی آتے تو بھی کیا تھا...... شہر بانو نے سوچا۔

وہ زارا کا ذکر اسی طرح کیا کرتا تھا...... روانی میں...... لاشعوری طور پر...... اور بے تحاشا...... جیسے اس کا معمول تھا...... شکایتاً یا تذکرتاً لیکن داؤد کی گفتگو زارا کے ذکر سے اب بھی خالی نہیں تھی اور اگر گفتگو خالی نہیں تھی تو اس کا دل اور زندگی کیسے خالی ہو سکتی تھی اور اس نے یہ بات داؤد سے ایک بار پوچھ ہی لی تھی جب فون پر اس کی دوسری یا تیسری بار بات ہوئی تھی اور شہر بانو، زارا کے بار بار کے ذکر سے بری طرح چڑی تھی اور داؤد جواباً اس کے اس طرح چڑنے پر حیران ہوا تھا۔

''میری کلاس فیلو رہی ہے وہ...... کورٹ شپ رہی پھر شادی رہی...... اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری باتوں میں اس کا ذکر ہی نہ آئے یا وہ مجھے یاد نہ آئے...... تمہیں شیر دل یاد نہیں آتا کیا؟'' وہ اس کے سوال پر بہت دیر کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ وہ عام سے انداز میں کیا جانے والا ایک سوال

تھا۔ داؤد کے لہجے میں کوئی چبھن، کوئی طنز نہیں تھا پھر بھی اس کی بات شہر بانو کو بری طرح چُبھی تھی۔

''یاد آتا بھی ہو تب بھی میں بات، بات پر اس کا ذکر تو نہیں کرتی۔'' اس نے بہت دیر کے بعد جیسے خود کو سنبھال کر لیکن پہلے سے زیادہ چڑ کر کہا۔

''تو تم کر لیا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' داؤد نے بے ساختہ کہا۔

''مجھے اگر بات، بات پر اس کا ذکر کرنا ہوتا تو میں اسے چھوڑتی کیوں؟'' اس نے جواباً کہا اور داؤد جیسے کچھ مزید حیران ہوا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... دو لوگ اتنا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اور پھر ایک دوسرے کو مکمل طور پر بھول جائیں بھی ایک دوسرے کا ذکر بھی نہ کریں...... یہ نارمل نہیں ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟'' وہ داؤد کی بات پر یک دم چونکی تھی۔ وہ بہت talkative (باتونی) تھا بہت دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد اس کو یک دم احساس ہوا تھا کہ شہر بانو کی توجہ کہیں اور تھی۔

''کچھ نہیں۔'' شہر بانو نے اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور وہ ناکام رہی...... اس کو یقین تھا۔ داؤد کو وہ بچپن سے جانتی تھی۔ وہ ایک ہی ہائی اسکول میں پڑھے تھے۔ یونیورسٹی تک ان کی بہت گہری دوستی رہی تھی...... انڈر اسٹینڈنگ اور دوستی میں بعض دفعہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ داؤد کی گفتگو میں زارا اور شہر بانو کی گفتگو میں شیر دل آنے لگا تھا پھر ان دونوں کی زندگیوں میں زارا اور شیر دل نے وہ جگہ لے لی تھی جو اُن دونوں کے نہ آنے پر شاید وہ ایک دوسرے کی زندگی میں لیتے۔

اور اب جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک نیا رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے تو عجیب دقت ہو رہی تھی۔ وہ انڈر اسٹینڈنگ اور compatability جو دونوں کو گھنٹوں ایک دوسرے سے مصروفِ گفتگو رکھتی تھی یک دم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔ شہر بانو اس کا موازنہ شیر دل سے نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سارا وقت یہی کرتی رہتی تھی۔ داؤد مرد تھا کھل کر اس عورت کا ذکر کرتا تھا جس کے بارے میں سوچتا تھا۔ شہر بانو عورت تھی، وہ اپنے آپ کو دھوکا اور فریب دینے میں لگی رہتی کہ وہ شیر دل کو بھول چکی تھی، زندگی سے نکال چکی تھی۔

زندگی میں سائن بورڈز اور روڈ سائنز کو بھولنا مشکل ہوتا ہے...... پھر زندگی میں آنے والے انسانوں کو کیسے بُھلایا جا سکتا ہے...... جس راستے سے ایک بار گزر ہو جائے وہاں کی نشانیاں ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں اور سالوں بعد بھی دوبارہ اسی راستے پر گزرتے ہوئے انسان پہچان، شناخت، تلاش اور دریافت کے جذباتی مراحل سے گزرتا ہے تو زندگی میں ساتھ چلنے والے انسان کیسے ہمارے ذہن پر اپنے نقوش اور یادیں نہ چھوڑ جائیں۔ آواز، انداز، نقش، نظر، لفظ، لمس، عادت، آہٹ یہ کیسے ممکن ہے انسان کو بھولنے کے ساتھ ساتھ یہ سب بھی بھول جائے...... کبھی وہم نہ ہو، کبھی شائبہ سا نہ گزرے، کبھی یادوں کی پرچھائیاں فریب نہ دیں۔ داؤد ٹھیک کہتا تھا اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو یہ نارمل بات نہیں تھی لیکن نارمل تو شہر بانو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف تب تک نارمل رہی تھی جب تک شہباز اور شرمین کے ساتھ ایک خوش و خرم گھر اور خاندان کا حصہ رہی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر داؤد سے کہا۔

''ویسے تمہاری یہ عادت پسند ہے مجھے...... تم بہت زیادہ باتیں نہیں کرتیں...... آج کل یہ عادت بہت کم ہوتی ہے عورتوں میں...... جب میں زارا کے ساتھ ہوتا تھا تو صرف زارا بولا کرتی تھی اور......'' داؤد بات کر رہا تھا...... اسے سراہتے سراہتے پھر سے اسے زارا یاد آ گئی تھی۔ شہر بانو پھر کہیں چلی گئی تھی۔ شہر بانو کو یاد آیا وہ شیر دل کے ساتھ بہت باتیں کرتی تھی...... اتنی باتیں...... اتنی باتیں...... جتنی اس نے شاید کبھی بچپن میں شہباز حسین سے کی ہوں گی...... شیر دل بھی بولتا تھا لیکن اس کے ساتھ وہ صرف اسی کی سنتا تھا، اس کی گفتگو سے وہ جیسے محظوظ ہوتا تھا...... آفس کا کام کرتے ہوئے وہ روز رات کو اس کے کندھے پر سر رکھے اسے کچھ نہ کچھ سناتی رہتی تھی اور وہ کام کرتے ہوئے سنتا جاتا تھا...... شہباز حسین کے بعد صرف وہی ایک تھا جس سے اس نے کبھی باتیں کرنا چاہی تھیں اور باتیں کی تھیں...... کسی اور کو کچھ بتانے یا کسی اور سے کچھ شیئر کرنے کے لیے اب اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں...... وہ گھنٹوں داؤد کی باتیں ایک خاموش تماشائی کی طرح سن سکتی تھی اگر داؤد چاہتا...... لیکن کم از کم اس میں ایک دوسری عورت کا ذکر نہ آتا خاص طور پر اس عورت کا جسے وہ چھوڑ چکا تھا۔

''تم پھر کہیں اور پہنچی ہوئی ہو؟'' داؤد نے پھر بہت دیر بعد اس کی عدم توجہی اس وقت محسوس کی جب ویٹر کھانا سرو کرنے آیا تھا۔

''ٹھیک ہے یار تم باتیں کیا کرو لیکن اب اتنی بھی کم نہیں کہ بوریت ہونے لگے۔'' اس نے بالآخر کچھ اُکتا کر کہا۔ شہر بانو چاہتے ہوئے بھی اسے کہہ نہیں پائی کہ وہ اس بوریت کو ختم کرنے کی پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کر رہی تھی اور کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔ وہ کنکشن اور وہ اسپارک جو ہمیشہ سے ان دونوں کے بیچ تھا اب یک دم ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ داؤد کے لیے کسی بھی عورت کے ساتھ گپ شپ لگا لینا آسان تھا شہر بانو کے لیے یہی سب سے مشکل کام تھا۔

''کیسا رہا ڈنر؟'' گیارہ بجے کے قریب بالآخر گھر واپس آنے پر شرمین نے اس سے پوچھا تھا۔ حالانکہ شہر بانو کا چہرہ اسے بتا رہا تھا کہ ڈنر کیسا تھا۔

''مثال سو گئی؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے اندر آتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''بڑی مشکل سے سُلایا ہے، کتنی دیر تو فاروق اسے لے کر باہر پھرتے رہے۔'' شرمین نے جواباً کہا۔ شہر بانو مزید کچھ بولے بغیر اپنے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کا چہرہ اتنا ُستا ہوا تھا کہ شرمین جیسے تشویش کے عالم میں اس کے پیچھے اس کے بیڈ روم میں چلی آئیں وہ گم صم صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' شرمین نے شہر بانو کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''Mummy it won't work'' شہر بانو نے اسی تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ شرمین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا جب وہ داؤد کے حوالے سے اس طرح کی رائے دے رہی تھی۔ شرمین کا خیال تھا مسئلہ اس کے ساتھ تھا داؤد کے ساتھ نہیں۔

''اب کیا ہوا؟'' شرمین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ممی اس کے ذہن پر اب بھی زارا ہی سوار ہے۔ وہ آج بھی آدھا وقت اسی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ آئی ہوئی تھی یہاں کسی سیمینار کے لیے...... لیکن مجھے لگتا ہے وہ اس کی برتھ ڈے ہی کے لیے یہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ اسے کافی پر لے گیا اس بات کی پروا کیے بغیر کہ میں ریسٹورنٹ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انہیں چوبیس گھنٹے ایک دوسرے سے رابطے میں رہنا ہے تو پھر طلاق کی کیا ضرورت تھی۔'' شہر بانو بہت جھنجلائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ فوری طور پر شرمین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہیں۔

''میں داؤد سے بات کروں گی۔'' انہوں نے بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''لیکن بیٹا مجھے نہیں

لگتا یہ کوئی بہت معیوب بات ہے یہاں لوگ divorce کے بعد بھی سابقہ بیوی یا شوہر سے ملتے رہتے ہیں۔ اچھے تعلقات رکھتے ہیں آپس میں...... بعض دفعہ بچوں کی وجہ سے ...... داؤد اور زارا بہت پرانے فیملی فرینڈز ہیں۔ ساتھ پلے بڑھے ہیں، بڑی حد تک امریکن سوچ ہے ان کی......لیکن پتا نہیں میں تمہیں کیوں سمجھا رہی ہوں یہ سب کچھ...... تمہیں تو خود پتا ہونا چاہیے......تم نے زندگی گزاری ہے یہاں......کوئی اور چکر ہوتا تو داؤد چھپاتا تم سے...... جیسے شیر دل چھپا رہا تھا......اس طرح ہر بات سامنے نہ کر رہا ہوتا۔'' شرمین نے بہت غلط موقع پر شیر دل کی مثال دی تھی۔ شہر بانو بری طرح ہرٹ ہوئی۔

''ممی! آپ اس کی مثال مت دیں مجھے۔'' اس نے بے حد خفا ہو کر ماں سے کہا تھا۔ ''ہم اس وقت داؤد کی بات کر رہے ہیں۔''

''داؤد بہت اچھا لڑکا ہے...... پروفیشنلی بہت برائٹ ہے...... بہت اچھی نیچر کا ہے، یہاں امریکا میں رہ کر بھی کوئی خراب عادتیں نہیں اس میں...... اتنا اچھا رشتہ کہاں ملے گا تمہارے لیے امریکا میں۔'' شرمین نے ہمیشہ کی طرح اسے داؤد کی خوبیاں گنوانی شروع کر دی تھیں۔

''وہ بہت اچھا ہے ممی لیکن مجھے ہر بار اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اسے میری ضرورت نہیں ہے......'' شرمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ضرورت نہ ہوتی تو شادی کیوں کرنا چاہتا وہ تم سے؟''

''شادی تو انسان کسی سے بھی کر لیتا ہے۔'' شہر بانو نے کہا اسے پتا نہیں کیا، کیا یاد آیا تھا۔

''کسی سے بھی نہیں کر لیتا انسان شادی...... کسی کی قدر اور ویلیو ہوتی ہے جبھی انسان اس سے شادی کا سوچتا ہے...... کسی کے لیے کچھ محسوس کرتا ہے تبھی اس کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔'' شرمین ہمیشہ کی طرح اسے داؤد کے حوالے سے سمجھا رہی تھیں۔ شہر بانو ان کی گفتگو کو کسی ''اور'' کے حوالے سے سن رہی تھی۔

''کوئی دوسرا کبھی مثال کو اس طرح پیار اور توجہ نہیں دے سکتا جس طرح داؤد دے گا۔ فاروق کی فیملی کا ہے وہ۔ تم کو یاد ہے فاروق نے ہمیشہ تمہیں کتنی توجہ دی ہے۔'' وہ اس دلیل پر آ کر ہمیشہ کمزور پڑ جاتی تھی...... مثال...... بس مثال کو کوئی اس طرح سنبھال لیتا جیسے شیر دل سنبھالتا تھا اور داؤد یہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ داؤد کو شروع سے جانتی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والا کوئی اور مرد مثال کے لیے بالکل اجنبی ہوتا اور مثال ہر ایک کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح شیر دل کے لیے روتی اور چلاتی تھی اور ہر دفعہ جب وہ باپ کے لیے رونا شروع کرتی پھر وہ کئی گھنٹے اسی طرح روتی رہتی، اسے اس وقت کسی بھی چیز کے ساتھ بہلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ شہر بانو تب اسے صرف بے بسی کے عالم میں چپ چاپ دیکھتی رہتی تھی۔ مثال میں کبھی اس طرح کا aggression نہیں تھا جو وہ اب دیکھتی تھی۔ وہ چیزیں اور کھلونے توڑنے میں سیکنڈ نہیں لگاتی تھی۔ بعض دفعہ شہر بانو پر چلاتی، اس کی بات ماننے سے انکار کرتی۔

شہر بانو کے لیے سب سے تکلیف دہ بات تب ہوئی تھی جب عدت کے دوران مثال اسکول جانے لگی تھی تو ایک دن اسکول سے آنے کے بعد کسی بات پر ضد کرتے ہوئے اس نے شہر بانو سے کہا۔

''Mummy you are a bad woman'' شہر بانو اس کے الفاظ پر شاکڈ رہ

گئی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ اس سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی جو کر رہی تھی لیکن اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں یک دم مفلوج ہو گئی تھیں۔ اپنی اولاد کے منہ سے اپنے بارے میں ایسا جملہ سن کر کسی بھی ماں کا یہی حال ہو سکتا تھا۔

شہر بانو اس پوری رات سو نہیں سکی تھی۔ اس نے زندگی میں ایسی خود ترسی اور احساسِ کمتری کا سامنا نہیں کیا تھا جتنا مثال کے اس ایک جملے نے اسے کروایا تھا۔

اگلے کئی دن وہ چاہنے کے باوجود مثال سے کھنچی کھنچی رہی۔ مثال نے ماں کی اس خفگی یا بے مہری کو محسوس کیا یا نہیں کیا لیکن وہ بھی جواباً شہر بانو سے اور کھنچ گئی تھی۔ شیر دل ان دونوں کے درمیان جیسے ایک عجیب سی دیوار بن گیا تھا اور صرف شرمین تھیں جو اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ مثال کی ذہنی کیفیت کو بھی سمجھ پا رہی تھیں۔

انہی دنوں میں داؤد نے فاروق کے ذریعے شہر بانو میں اپنی دلچسپی کا اظہار اور شادی کا پیغام بھجوایا تھا اور شرمین کے لیے جیسے صحرا میں نخلستان والا معاملہ ہوا تھا۔ شہر بانو کی فوری شادی انہیں اُن تمام مسائل کا حل لگی تھی جن کا شہر بانو سامنا کر رہی تھی، وہ ان کے سامنے بریک اپ کے بعد بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرتی رہی تھی اس نے شیر دل کا نام تک لینا چھوڑ دیا تھا لیکن شرمین کو اس کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کا اندازہ تھا۔ وہ آگ کے اس دریا سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کو جلا چکی تھیں...... شہر بانو کیسی تکلیف کا سامنا کر رہی تھی انہیں اندازہ تھا۔

ان کی اپنی زندگی میں فاروق کے آ جانے نے بہت حد تک ان کی تکلیف ختم کر کے ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا اور انہیں یقین تھا شہر بانو کو داؤد کی صورت میں ویسا ہی ساتھی مل جاتا تو وہ بھی اس تکلیف سے بہت جلدی گزر جاتی۔

شہر بانو نے غیر متوقع طور پر داؤد کے پروپوزل پر کسی شدید ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا حالانکہ شرمین کو اس کی توقع تھی لیکن وہ فوری طور پر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ چند سال اس گرداب سے نکلنے کے لیے چاہتی تھی جس میں وہ پھنس گئی تھی۔

''جلدی کسی سے شادی ہو گئی تو مثال بھی بہت جلد تمہارے اس نئے رشتے کو بھی accept کر لے گی اور اس آدمی کے ساتھ اٹیچ بھی ہو جائے گی۔ چند سالوں کے بعد تمہارے لیے دوسری شادی کرنا زیادہ آسان ہو گا لیکن مثال کے لیے اس نئے رشتے کو قبول کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ اب بھی تمہارے لیے کتنی پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ تب تو بالکل ہی......'' شرمین کے پاس شہر بانو کو اس وقت فیصلے پر تیار کر لینے کے لیے جیسے تُرپ کا پتا مثال تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ شہر بانو ماں کی اس بات کو نہ مانتی اس کے سامنے اپنا بچپن تھا...... اپنے بچپن کا mess تھا اور وہ مثال کو ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بچانا چاہتی تھی۔

لیکن اب جب وہ ذہنی طور پر داؤد سے شادی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی ...... اسے بار بار شیر دل کا خیال آتا تھا اور الجھن اور اضطراب تھا کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا...... رابطہ نہیں تھا...... یہ فاصلہ بہت زیادہ تھا...... جدائی ہو چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی ...... پر خیال اور یادیں کہ دل کا دامن چھوڑنے پر تیار ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

زندگی میں ایک گولی ایسی بھی ہونی چاہیے جسے کھانے کے بعد انسان اس شخص، چیز اور یاد کو فوری طور پر

بھول جائے جسے وہ بھولنا چاہتا ہے...... آپ اسے کھا کر سوئیں اور جاگیں تو آپ کے پورے وجود اور ذہن کے سسٹم میں سے صرف وہ شخص، وہ چیز وہ یاد نکل چکی ہو جس سے آپ جان چھڑانا چاہتے ہوں۔ جو آپ کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

ہر روز صبح بستر میں آنکھیں کھولنے کے بعد جو پہلا خیال اور پہلا تصور شیر دل کے ذہن اور آنکھوں میں آتا تھا وہ مثال اور شہر بانو کا ہوتا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد بھی کوئی ایک دن ایسا نہیں تھا جب اس کے دن کا آغاز کسی اور خیال سے ہوا ہو...... ہزیمت، ذلت، تکلیف اور صدمے کی ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے وہ صبح سویرے گزرتا تھا۔

وہ کمزور اعصاب کا مالک نہیں تھا۔ وہ کبھی کمزور اعصاب کا مالک نہیں رہا تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا اس نے اسے عجیب انداز میں traumatized کیا تھا۔ وہ پچھلے کتنے سالوں سے اپنی زندگی شہر بانو اور مثال کے ساتھ گزار رہا تھا وہ دونوں اس کے شعور اور لاشعور دونوں کا حصہ تھیں اور ان کا اس طرح غائب ہو جانا......

وہ ہر روز بیٹھ کر اپنے آپ کو ان تمام واقعات کی توجیہات دیا کرتا تھا...... کیا چیز کیوں ہوئی اور پھر یہ سوچتا تھا کہ وہ کون سی چیز کرتا یا نہ کرتا تو یہ سب نہ ہوتا...... شہر بانو سے اسے محبت تھی...... اب کیا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا...... نفرت وہ اس سے نہیں کرسکتا تھا...... محبت کرنے کے قابل وہ اب اسے سمجھتا نہیں تھا...... غصہ اسے اس پر بے تحاشا آتا تھا اور اس کے ساتھ وہ خود بھی یاد آتی تھی...... رات اور دن کے بہت سے پہروں میں...... اپنی بہت ساری باتوں اور عادتوں کی وجہ سے...... ان اوقات میں جب مثال اسے وقتی طور پر بھولتی۔

شک شہر بانو کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ کم از کم شیر دل کو اس سے یہ شکایت کبھی نہیں رہی تھی...... بداعتمادی اور بدگمانی کی عادت بھی اسے نہیں تھی...... وہ بدمزاج اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنے اور لڑنے جھگڑنے کی بھی عادی نہیں تھی...... شادی سے پہلے اگر اس کی چند چھوٹی موٹی عادتوں پر شیر دل کو خفگی محسوس ہوتی تھی تو شادی کے ان پانچ چھ سالوں میں شہر بانو میں وہ عادتیں بھی نہیں رہی تھیں۔ وہ کاغذ پنسل لے کر بیٹھتا تو اسے شہر بانو کی خامیاں اور عیب ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا...... بالکل اسی طرح جس طرح شہر بانو کے لیے شیر دل میں عیب ڈھونڈنا مشکل تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ کبھی ہرٹ نہیں کیا تھا اور شاید اسی وجہ سے پہنچنے والی تکلیف کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

شہر بانو حسّاس تھی ضرورت سے زیادہ حساس تھی صرف یہ ایک چیز تھی جسے شیر دل کبھی اس کی personality میں سے دور نہیں کرسکا تھا...... لیکن اس نے شہر بانو کو اس کی اس خامی اور عادت کے ساتھ قبول کیا تھا...... وہ اس کے ماضی کی تلخ یادوں سے واقف تھا اور اسے یقین تھا وہ اپنی محبت اور ساتھ سے اس کے اندر موجود عدم تحفظ کا ہر احساس نکال دے گا...... لیکن جو کچھ ہوا تھا...... ایک مرد کے طور پر وہ یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس کے اور شہر بانو کے بیچ میں عکس کے لیے اس کے جذبات اور محبت مسئلہ بنی تھی۔

عکس وہ پہلی اور واحد عورت نہیں تھی جس کے بارے میں وہ شہر بانو سے بات کرتا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب عورتوں سے بھرا ہوا تھا...... اس کی اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کزنز، کالج یونیورسٹی فرینڈز، کولیگز...... اس کے حلقۂ احباب میں بہت پرانی فرینڈز بھی تھیں۔ شہر بانو کو کبھی کسی کے ساتھ مسئلہ نہیں ہوا تھا...... صرف عکس کے لیے پسندیدگی رکھنا...... اور وہ اس پسندیدگی اور محبت کا کچھ نہیں کرسکتا تھا...... کرسکتا تو کرلیتا...... وہ عکس کے لیے اپنے جذبات کے سامنے بے بس تھا بالکل اسی طرح جس طرح وہ یہ سب ہو جانے کے باوجود بھی شہر بانو

سے نفرت کرنے اور اسے یاد نہ کرنے میں بے بس تھا۔

شہر بانو کا خیال تھا کہ عکس اس کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے کا باعث بنی تھی اور شیر دل کا خیال تھا یہ کام شہباز حسین اور اس کی اپنی ماں نے اس کے لیے کیا تھا اور اب منزہ اس کے سامنے وہ option لے کر آگئی تھی جس کے بارے میں وہ سوچنا تک نہیں چاہتا تھا۔ بعض دفعہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ منزہ پر غصہ کرے، ترس کھائے یا افسوس کرے۔ وہ اپنی خود غرضی میں اسے بار بار کچوکے دے رہی تھیں اور خود بھی درد سے بے حال ہو رہی تھیں۔ خود غرضی کا اس سے زیادہ گھناؤنا چہرہ ایبک شیر دل نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

منزہ کی اس گفتگو کا اس پر ان کی توقعات کے برعکس اثر ہوا تھا۔ اس نے عکس کو اگلے تین چار دن کوئی میسج اور کال نہیں کی وہ جیسے یہ طے کر بیٹھا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس mess کو عکس مراد علی تک نہیں پہنچنے دے گا۔

☆☆☆

عکس نے بھی اسے کوئی کال نہیں کی تھی...... خیر دین کے الفاظ اور ان میں چھپی تنبیہہ سے زیادہ ان کی بداعتمادی نے اسے اس قدر ڈسٹرب کیا تھا کہ اس نے شیر دل سے دوبارہ رابطہ نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن یہ کام بہت مشکل تھا خاص طور پر اب جبکہ وہ شیر دل کی حالت دیکھ آئی تھی۔ وہ چند دن تک خود پر پہرے بٹھاتی رہی تھی لیکن اس کے بعد اسے میسج کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس میسج کا جواب نہیں آیا تھا۔ ایک لمبے انتظار کے بعد اس نے ایک اور میسج کیا پھر ایک اور...... دوسری طرف مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی نے عکس کو عجیب انداز میں مضطرب کیا۔ اس نے اس بار شیر دل کو کال کی تھی۔ سیل فون ایک بار پھر آف تھا۔ اس نے اگلی کال اس کے گھر کی لینڈ لائن پر کی تھی۔ آپریٹر نے اسے پہلی بار والا جواب دیا۔ اس نے شیر دل کے علاوہ گھر میں موجود کسی دوسرے شخص سے بات کروانے کے لیے کہا اور ایک بار پھر لائن پر منزہ ہی آئی تھیں اور ایک بار پھر عکس ہلکا سا پچھتائی، اس کے باوجود کہ وہ پچھلی بار ان کے غیر معمولی اور غیر متوقع اچھے سلوک سے حیران رہ گئی تھی۔

''ویسا ہی ہے کچھ بہتری نہیں آئی۔ تمہارے جانے کے بعد ایک دن کچھ بہتر رہا لیکن کل پھر panic attack کے بعد سارا دن کمرا بند کیے بیٹھا رہا ہے۔'' منزہ نے سلام دعا کے بعد شیر دل کا حال پوچھنے پر اسے بتایا۔ بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

''بیٹا! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اس سے بات کیا کرو...... اسے سمجھاؤ...... تمہاری بات کو تو بڑی ویلیو دیتا ہے...... اس کی زندگی میں تمہاری بڑی importance ہے۔'' عکس نے اُن کے اِن تمام جملوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بہت بے معنی اور کھوکھلا خراجِ تحسین تھا جو وہ اس کے اور شیر دل کے تعلق کو بالآخر پیش کر رہی تھیں۔ عکس کو اب ایسے کسی اعتراف کی ضرورت نہیں تھی۔

''بات میں تب کرسکتی ہوں آنٹی جب وہ فون آن رکھے اور فون اٹھائے۔'' اس نے مدھم آواز میں منزہ کو اپنا مسئلہ بتایا۔

''پتا نہیں اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے پہلے سے بہتر ہے وہ، اس نے میڈیسن بھی کم کر دی ہے اس کی...... لیکن وہ اب بھی فون پر کسی سے بات نہیں کرتا...... موڈ ہوگا بات کرلے گا پھر کسی نہ کسی بات پر خفا

ہو کر بات کرنا بند کر دیتا ہے۔ میری تو بالکل کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' وہ واقعی بہت بے بسی کی حالت میں تھیں۔

''آپ کوشش کریں وہ دوبارہ آفس جوائن کرے...... اس کا ذہن کام کی وجہ سے بٹے گا۔'' عکس نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ وہ اس صورتِ حال کو سمجھ پا رہی تھی جس میں منزہ پھنس گئی تھیں۔

لیکن منزہ کی طرح خود اسے بھی اس مسئلے کا حل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ منزہ ماں تھیں اور شیر دل کے قریب تھیں پھر بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتی تھیں اس کے لیے یہ دونوں ہی آسانیاں نہیں تھیں۔

اس شام وہ پھر الجھی ہوئی واپس گھر آئی تھی اور خیر دین سے اس کا اضطراب چھپا نہیں رہا تھا۔ اس کے سوال و جواب کو وہ ٹال گئی۔ وہ اس رات بھی دیر تک جاگتی شیر دل کے لیے فکر مند ہوتی رہی اس کی تکلیف اور پریشانی اب آہستہ آہستہ جیسے اس کے اپنے اعصاب کو مضمحل کرنے لگی تھی...... اور حل...... حل کہیں نہیں تھا کسی کے پاس نہیں تھا...... کم از کم حل وہ نہیں تھا جو منزہ نے چند دن بعد خیر دین کو فون کر کے نکالا تھا...... اور جس نے خیر دین کو بری طرح سے برانگیختہ کیا تھا۔

''شیر دل کی ماں نے فون کیا تھا آج مجھے۔'' منزہ سے ہونے والی اس گفتگو کے تین یا چار دن بعد کی بات تھی جب وہ ویک اینڈ پر صبح بہت دیر سے اٹھ کر آئی تھی۔ پچھلی ساری رات وہ چیف منسٹر کے کسی وزٹ کی وجہ سے مصروف رہی تھی اور اس کی گھر واپسی بھی فجر سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔

چائے کا کپ اٹھاتے اٹھاتے وہ رک گئی۔ خیر دین سے اس کی ملاقات پچھلی رات نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ابھی ہوئی تھی۔ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آیا۔ منزہ نے خیر دین کو پچھلی رات کال کی تھی یا آج صبح۔ وہ سوالیہ نظروں سے خیر دین کو دیکھنے لگی۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں کہ شیر دل اور شہر بانو کی طلاق ہو گئی ہے؟'' خیر دین نے اس سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''شاید مجھے خیال نہیں رہا۔'' مدہم آواز میں کہتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ خیر دین نے اُلجھی نظروں سے اسے دیکھا وہ اتنی عام سی بات نہیں تھی کہ اسے خیال نہ رہتا۔

''شیر دل سے تمہارے رشتے کی بات کی ہے انہوں نے مجھ سے۔'' چائے کا پہلا سپ لیتے ہوئے... خیر دین کے نکلے جملے پر اس کا ہاتھ بری طرح لرزا تھا لیکن اس نے اپنی لرزش پر قابو پا لیا، وہ چند لمحوں کے لیے اندر باہر سے مکمل طور پر ہل کر رہ گئی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ منزہ ایسی کوئی بات خیر دین سے کر سکتی تھیں...... ان کے بدلے ہوئے رویّے کے باوجود وہ منزہ سے اس چیز کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

''میں نے صاف انکار کر دیا۔'' خیر دین نے رکے بغیر اگلا جملہ ادا کیا۔ وہ جملہ متوقع ہونے کے باوجود اس نے بھی اسے ہلایا تھا پر اس بار زلزلے کی شدت کم تھی۔ ''میں نے انہیں بتا دیا کہ تمہاری شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' خیر دین بتا رہا تھا لیکن وہ چائے پیتے ہوئے چُپ چاپ خیر دین کی بات سنتی رہی...... اس کے لہجے میں ایک خفگی جھلکنے لگی تھی۔ ''اتنا سب کچھ کرنے کے بعد انہیں مجھ سے اس طرح کی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ انہیں خود احساس ہونا چاہیے تھا کہ وہ تم پر کیسے کیسے الزامات لگا چکی ہیں۔ تمہارا رشتہ تڑوا چکی ہیں اور پھر آج دوبارہ اپنے بیٹے سے رشتے کی بات کرنے بیٹھ گئیں۔ وہ بھی فون پر...... جیسے ہم ایسے ہی گرے پڑے اور گئے گزرے ہیں کہ وہ ایک فون کریں گی اور میں تمہاری شادی ان کے بیٹے سے کر دوں گا۔'' خیر دین کی آواز کی خفگی اب جیسے کچھ اور

بڑھ گئی تھی۔ عکس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن اس نے چائے کا اَدھ بھرا کپ ٹیبل پر رکھ دیا تھا، وہ گھر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، خیر دین کی کرسی کے عقب میں نظر آنے والے لان میں بھاگتی دوڑتی بلیوں کو دیکھنے لگی...... توجہ بھٹکانا بے حد ضروری تھا۔

''سجاد بہت اچھا لڑکا ہے اور میں زبان دے چکا ہوں...... اتنے اچھے رشتے کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے بیٹے کے بارے میں سوچنے کی بھی کیا ضرورت ہے......'' خیر دین دوٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ چپ سنتی رہی، پتا نہیں اسے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ منزہ کی اس گفتگو کے بارے میں شیر دل بالکل لاعلم ہوگا۔

''ہمارے اور ان کے درمیان بہت فرق ہے...... اور یہ فرق ساری عمر رہے گا۔ تم سجاد کے ساتھ خوش رہو گی چڑیا...... میں جانتا ہوں تم کسی کے ساتھ بھی خوش رہ سکتی ہو...... شیر دل تمہاری ضرورت نہیں ہے......'' وہ خاموشی سے خیر دین کو دیکھتی رہی اس کی خاموشی کو انہوں نے ایک بار پھر اپنی مرضی کا مفہوم دے کر جیسے اپنے فیصلے کی توجیہہ اسے دینے کی کوشش کی تھی۔

''شیر دل بہت اچھا ہے لیکن سجاد......'' عکس نے مدھم آواز میں ان کی بات کاٹ دی۔

''نانا آپ نے جو کیا ٹھیک کیا، آپ نے جو فیصلہ کیا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے خیر دین کا ہاتھ پکڑ لیا پھر چند لمحے اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیے بیٹھی رہی یوں جیسے اپنے لفظوں کے بجائے ہاتھ کے اس لمس سے خیر دین کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کر رہی ہو...... پھر وہ کچھ کہے بغیر خیر دین کا ہاتھ چھوڑ کر وہاں سے اندر چلی گئی۔ خیر دین بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ خوشی اور اطمینان ہونا چاہیے تھا...... نہیں ہوا تھا...... سکون ملنا چاہیے تھا، وہ بھی نہیں ملا تھا...... فخر کی بات تھی اس کے لیے...... لیکن پتا نہیں اسے کیوں نہیں لگی۔

اسے کئی سال پہلے چڑیا کا بچپن یاد آ گیا تھا جب وہ اس کے پاس شکایت لے کر آئی تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں لیے، ایبک اس کے ساتھ ٹینس نہیں کھیل رہا تھا۔ نہ ہی اسے اپنا ریکٹ دے رہا تھا...... اور خیر دین نے بڑی سنجیدگی سے دوٹوک انداز میں اسے دوبارہ ایبک کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا تھا...... پھر ایبک اسے منانے آ گیا تھا اور وہ خیر دین کے حکم اور ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ کھیلنے تو نہیں گئی تھی لیکن گم صم ہو گئی تھی...... اسے آج بھی وہ ویسی ہی گم صم لگی تھی لیکن وہ کیا کرتا...... وہ ایک شیر دل کو اس کا جیون ساتھی چاہتے ہوئے بھی نہیں بنانا چاہتا تھا، وہ اپنی چڑیا کو اس خاندان کا حصہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس نے...... اور پھر وہ سجاد کے خاندان کو زبان دے چکا تھا۔ زبان دے کر اور شادی کی تاریخ طے کر کے کیسے مکر جاتا...... خیر دین نے اپنی زبان کا پاس تو ساری عمر کیا تھا پھر اب کیسے نہ کرتا۔

☆☆☆

عکس مراد علی نے زندگی میں بہت ساری بے خواب راتیں گزاری تھیں۔ وہ رات بھی انہی راتوں میں سے ایک تھی۔ بہت سی چیزیں بھی اس وقت آپ کو ملنے کا امکان پیدا ہوتا ہے جب آپ کو ان کی خواہش اور ضرورت دونوں نہیں رہتیں لیکن ان کے ساتھ منسلک محبت اور تعلق ویسے ہی رہتے ہیں۔

عکس مراد علی نے زندگی میں کبھی ایک شیر دل کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنانے کا نہیں سوچا تھا...... خواب میں بھی نہیں...... اور جو چیز اس کے خوابوں، خیالوں میں بھی کبھی نہیں آئی وہ option بن کر کیسے آ گئی تھی۔

وہ اپنی اداسی کی وجہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کس چیز نے بے چین کر رکھا تھا اسے...... اس پروپوزل

کے آنے یا اس پروپوزل کے ریجیکٹ ہو جانے نے......

''بس ممی نہیں مانتیں...... وہ مان جائیں ناں تو تم سے شادی کا پہاڑ بھی سر ہو جائے۔'' کئی سال پہلے ایک بار ایک شیر دل نے اس کے سامنے منزہ کو منانے میں بار بار ناکام ہونے کے بعد اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم ممی کو منانے کی کوشش کر ہی کیوں رہے ہو...... وہ مان بھی جائیں تو نکاح نامے پر ان کے نہیں، میرے دستخط چاہیے ہوں گے تمہیں شادی کے لیے۔'' عکس نے اس کی بات سے ہونے والی تکلیف کو مسکراہٹ کے بہت سارے پردوں میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

''تم تو مان جاؤ گی......'' شیر دل نے عجیب بے پروائی سے کہا تھا۔

''خوش فہمی ہے تمہاری...... مجھے تم سے شادی میں دلچسپی نہیں ہے...... تمہارے ممی، پاپا مان بھی جائیں تو بھی...... اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کی نظروں میں اپنا امیج خراب مت کرو...... تمہاری کزن شہر بانو زیادہ سوٹ ایبل ہے تمہارے لیے...... تم اس کے بارے میں سوچو۔'' اس نے شیر دل سے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''اب اگر میں نے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ صدیوں بعد ایک کزن دریافت کر لی ہے میں نے امریکا میں تو اس کا یہ مطلب نہیں تم اس سے میرا رشتہ جوڑنے بیٹھ جاؤ۔'' شیر دل فون پر اس سے بات کرتے ہوئے برا مان گیا تھا۔

''تم چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ پھرتے ہو اور......'' شیر دل نے عکس کی بات کاٹی۔

''چوبیس گھنٹے......؟ ہم ایک اپارٹمنٹ شیئر کر رہے ہیں یار...... اور تم کیا جیلس ہو رہی ہو؟''

''کس بات سے جیلس ہونا ہے میں نے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''شہر بانو سے...... I really like her Sherdil۔''

''کیوں......؟'' ایک لمحے کے لیے اس اچانک آجانے والے سوال کا جواب اسے نہیں آیا۔

''وجہ ضروری تو نہیں ہوتی کسی کو پسند کرنے کے لیے۔'' اس نے بالآخر سنبھل کر کہا۔

''تم شہر بانو میں بہت Interest لیتی ہو۔'' شیر دل نے اگلے تبصرے سے ایک بار پھر اسے لاجواب کیا۔

''تم interest نہیں لے رہے اس میں کیا؟'' عکس نے جواباً کہا۔

''میں ہر لڑکی میں لیتا ہوں۔'' شیر دل نے ڈھٹائی سے کہا۔

''صرف اسی وجہ سے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' عکس نے اسی انداز میں کہا۔

''تم سے شادی کے بعد کسی میں نہیں لوں گا۔'' شیر دل نے بے ساختہ کہا۔

''میں نہیں چاہتی تم اتنی بورنگ لائف گزارو۔ شہر بانو......'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یار میں اس کا اتنا ذکر نہیں کرتا جتنا تم کرنے لگی ہو...... آخر تم کیوں چاہتی ہو کہ میں اس سے شادی کر لوں اگر تمہارے علاوہ ہی کسی سے شادی کرنی ہے تو پھر میرے پاس بھی کچھ اور options ہیں۔''

''ان options میں کوئی آپشن شہر بانو جیسا اچھا نہیں ہے۔''

پتا نہیں اسے آج وہ سب کچھ کیوں یاد آنے لگا تھا۔ باربی ڈول اب بھی اس کے دل کے کسی کونے میں سمائی ہوئی تھی جیسے ایک شیر دل...... چڑیا کے لیے ان دونوں کی محبت سے دامن چھڑانا بہت مشکل تھا۔

وہ اور شیر دل امریکا میں اس کے قیام کے دوران آپس میں رابطے میں تھے۔ شہر بانو سے تعارف ہونے سے لے کر شہر بانو کے ساتھ گزارے جانے والا کوئی ایسا وقت اور سرگرمی نہیں تھی جس کا ذکر اس نے عکس سے نہ کیا ہو۔ یہ راز بھی اس نے اپنی فیملی سے بھی پہلے عکس ہی کے ساتھ شیئر کیا تھا کہ شہر بانو اس کے اکلوتے ماموں شہباز حسین کی بیٹی تھی جس سے وہ ایک طویل مدت کے بعد متعارف ہوا تھا...... اور وہ پہلا موقع تھا جب عکس نے شیر دل سے شہر بانو کی تصویریں ای میل کرنے کے لیے کہا تھا...... وہ باربی ڈول کو دیکھنا چاہتی تھی...... اتنے سالوں کے بعد بھی اسے یاد تھا وہ کس طرح بے قراری سے صرف اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کلاس کے چکر لگاتی رہی تھی...... بچپن کی اچھی اور بری کوئی یاد عکس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی تھی۔

شیر دل نے اسے شہر بانو کی صرف ایک تصویر ای میل نہیں کی تھی، بہت ساری کر دی تھیں۔ چڑیا اتنے سالوں بعد بھی باربی ڈول کو دیکھ کر اس سے نظر نہیں ہٹا سکی تھی...... وہ آج بھی سحر زدہ کرنے والے حُسن کی مالک تھی اور چڑیا آج بھی اس پر اسی طرح دل و جان سے فدا ہوئی تھی جس طرح بچپن میں۔ وہ بہت سی تصویروں میں شیر دل کے بہت قریب تھی...... کسی میں اس کا بازو تھامے، کسی میں ہاتھ...... کسی میں شیر دل کے برابر بالکل ساتھ بیٹھی ہوئی...... کوئی بھی ان تصویروں پر نظر ڈالتے ہی یہ جان جاتا کہ تصویروں میں نظر آنے والے جوڑے کے درمیان صرف دوستی نہیں تھی۔ شیر دل نے جان بوجھ کر اسے اپنی اور شہر بانو کی ایسی تصاویر بھیجی تھیں جنہیں دیکھ کر عکس کو تھوڑا بہت حسد تو ضرور ہو جاتا مگر اس پر الٹا اثر ہوا تھا۔ شیر دل اب جیسے اس کے لیے وہ candy بن گیا تھا جو باربی ڈول کو پسند تھی اور چڑیا وہ candy باربی ڈول کو ہر قیمت پر دلانا چاہتی تھی اور اس نے دلا دی تھی۔

☆☆☆

منزہ اس وقت گھر سے کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں جب آپریٹر نے انہیں عکس کی کال کے بارے میں بتایا۔ ایک دن پہلے خیر دین کے صاف اور دوٹوک انکار کے بعد بھی وہ عکس کی کال پر ایک دم ایکسائٹڈ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اسی ایکسائٹمنٹ میں آپریٹر کو کال بند کرنے کا کہا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر اپنے سیل فون سے عکس کو کال کی۔

''بیٹا تم اگر کال نہ کرتیں تو میں ہی تمہیں کال کرنے والی تھی۔'' عکس کی آواز سنتے ہی انہوں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا تھا۔

''تمہارے نانا نے تمہیں بتایا بیٹا کہ میں نے ان سے تمہارے اور شیر دل کے رشتے کی بات کی ہے۔''

''میں شیر دل سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے منزہ کا پہلا جملہ سنتے ہی سنجیدہ آواز میں انہیں ٹوک دیا۔ ''اور میں چاہتی ہوں آپ میرے نانا سے اس سلسلے میں دوبارہ بات نہ کریں۔'' انہیں چند لمحے سمجھ نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہیں۔ انہوں نے خیر دین سے انکار سنا تھا لیکن انہیں عکس سے انکار کی توقع نہیں تھی۔

''میں بہت خلوص سے تمہیں اپنی فیملی کا حصہ بنا کر شیر دل کی زندگی میں لانا چاہتی ہوں۔'' منزہ نے بالآخر کہا۔ ''شیر دل اس وقت بہت مشکل وقت سے گزر رہا ہے تمہارا ساتھ اسے مل جائے گا تو......'' عکس نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹ دی۔

"آنٹی میں ایک دوست کے طور پر شیر دل کی مدد کر سکتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے اور اسے آپس میں کوئی نیا رشتہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے اور اس کے درمیان محبت والا رشتہ اور تعلق نہیں ہے۔ ہم بہت اچھے دوست ہیں اور میں اس رشتے کو بس یہیں تک رکھنا چاہتی ہوں۔ آپ نانا سے دوبارہ اس سلسلے میں بات مت کریں کیونکہ وہ میرے لیے بہت upsetting ہے۔" اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ منزہ جواباً کچھ نہیں کہہ سکیں...... زندگی واقعی بڑی عجیب اور بے رحم چیز ہوتی ہے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی ایسے کسی خاندان کی لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کے لیے گڑگڑائیں گی اور وہ انکار کر دے گی...... انکار تو ہمیشہ ان کا اور ان کے خاندان کا استحقاق رہا تھا...... کسی کمتر خاندان والے کو کیسے مل جاتا۔

"تم شیر دل سے اس کا ذکر مت کرنا۔" منزہ نے ایک دم بے قراری سے کہا۔ انہیں اچانک ہی یاد آ گیا تھا کہ کچھ ایسی ہی گفتگو چند دن پہلے شیر دل نے بھی ان سے کہی تھی لیکن انہوں نے اس کی گفتگو کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے خیر دین سے بات کی تھی۔ ہاں البتہ انہیں اگر اس دفعہ ٹینشن کم تھی تو صرف اس وجہ سے کم تھی کیونکہ انہوں نے خیر دین سے بات کرنے سے پہلے بختیار سے بات کر لی تھی اور بختیار کی اجازت ملنے کے بعد ہی انہوں نے خیر دین سے رابطہ کیا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں شیر دل سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔" ان کے جملے نے عکس کے اس اندازے کی تصدیق کی تھی جو اس نے پہلی رات لگایا تھا۔ شیر دل اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر تھا۔ منزہ نے اس سے مزید بات نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے وہ اتنی بددل ہوئی تھیں کہ انہوں نے چند اختتامی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے بڑا افسوس ہوا تم لوگوں کی seperation کا سن کر...... آئیڈیل کپل تھا تم لوگوں کا...... آخر ایسا کیا ہوا کہ اس طرح ہفتوں میں divorce ہو گئی۔" آئلہ کو واقعی بہت افسوس ہوا تھا لیکن شہر بانو کے لیے وہ سب کچھ سننا ایک عجیب تکلیف کا باعث بن گیا تھا۔

آئلہ، شیر دل کے ایک بیچ میٹ یوسف کی بیوی تھی۔ وہ ان چند عورتوں میں سے تھی جن کے ساتھ شہر بانو کی بہت اچھی علیک سلیک ہی نہیں تھی بلکہ کسی حد تک بے تکلفی بھی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آئلہ خود بھی امریکا میں ہی پلی بڑی تھی۔ شہر بانو اور اس کے درمیان اسی ایک commonconnection (باہمی تعلق) نے بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

وہ اب اپنے ایک بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے امریکا آئی تھی تو شہر بانو سے فون پر بات کرنے کے بعد وہ اس سے ملنے بھی چلی آئی۔

"میں نے تم سے اس سارے جھگڑے کا پتا چلنے پر بہت دفعہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم فون ہی نہیں لیتی تھیں۔" آئلہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں، میں بہت اپ سیٹ تھی ان دنوں اس لیے۔" شہر بانو نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"یوسف سنگاپور میں شیر دل کے ساتھ کورس کر رہا تھا، اسی نے وہاں سے واپس آنے کے بعد مجھے بتایا کہ شیر دل اور تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ شیر دل وہاں بھی بڑا اپ سیٹ تھا اس نے یوسف سے کسی بات پر ذکر کیا تھا تم نے شاید تب اس سے بات کرنا بند کر دی تھی۔" آئلہ کی بات پر شہر بانو کو غصہ آیا۔

"اوہ تو وہ مجھے ہر جگہ بدنام کرتا پھر رہا ہے اور میں سمجھتی تھی کہ وہ ایک ذاتی ایشو کو لوگوں کے ساتھ ڈسکس نہیں کرے گا۔" آئلہ اس کے ردِعمل پر حیران ہوئی۔ وہ پہلی بار شہر بانو کو اس طرح ری ایکٹ کرتے دیکھ رہی تھی اور وہ جیسے کچھ محتاط ہو گئی تھی۔

"نہیں، شیر دل کچھ اپ سیٹ تھا اسی لیے یوسف نے پوچھا ہوگا تو اس نے ذکر کیا لیکن اس نے details نہیں بتائی تھیں۔ یوسف کورس کرنے کے بعد واپس آیا۔ تب اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ شیر دل بہت اپ سیٹ رہا ہے پورے کورس کے دوران...... اس کے اور شہر بانو کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے شاید...... میں نے تب بھی سوچا تھا کہ تم سے بات کروں لیکن یوسف نے منع کر دیا کہ یہ مناسب بات نہیں ہے۔" آئلہ نے اس بار جیسے اسے تفصیلات دینے کی کوشش کی...... وہ لاشعوری طور پر شیر دل کی پوزیشن بھی کلیئر کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور شہر بانو... یہ نوٹس کر رہی تھی۔

"شیر دل میری وجہ سے اپ سیٹ نہیں ہوگا وہ اگر اپ سیٹ ہوگا تو عکس کی وجہ سے ہوگا۔" وہ عکس کا نام نہیں لینا چاہتی تھی اور اب تو بالکل بھی نہیں...... جو ہونا تھا...... ہو گیا تھا...... گزر چکا تھا...... اب ایسے ذکر اور الزام تراشی کا کیا فائدہ ہونا تھا...... وہ کسی پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتی تھی جس کے چھینٹے اس کے اپنے دامن تک آتے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ عکس کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"عکس......؟ عکس مراد علی؟" آئلہ نے جیسے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔ "اس کی فیملی میں ہونے والی ایمرجنسی کی وجہ سے وہ کورس چھوڑ کر چلی گئی تھی!" آئلہ کو اب بھی شہر بانو کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے اس پہیلی کو بوجھنے کے لیے ایک اندازہ لگایا جو شہر بانو نے اس کو بوجھنے کے لیے دی تھی۔

شہر بانو نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ "عکس کورس چھوڑ کر چلی گئی تھی؟" آئلہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس نے کورس نہیں کیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن ہی وہ واپس چلی گئی تھی۔ شیر دل کا اس کی فیملی میں ہونے والی ایمرجنسی سے کیا تعلق ہے؟ وہ اس کی وجہ سے کیوں اپ سیٹ ہوگا؟" آئلہ اب اس سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اسی طرح بھونچکا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ عکس کے پاس شیر دل کا فون تھا لیکن وہ سنگاپور میں نہیں تھی...... شیر دل کا فون...... شیر دل کا فون...... اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی کہ شیر دل نے اسے

سنگاپور سے کس نمبر سے کال کی تھی...... اس نے سنگاپور جا کر اسے اپنے ہی فون سے کال کی تھی...... دو دن . شیر دل اُسے اپنے ہی فون سے کال کرتا رہا تھا پھر اس نے دوسرے نمبرز اور کالنگ کارڈ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یہ بات اس لیے یاد تھی کیونکہ وہ بعض دفعہ شیر دل سے بات نہ کرنے کے فیصلے پر جمے رہنے کے باوجود اس کا فون اس وقت غلطی سے اٹھا لیتی تھی جب وہ فون پر کوئی اور نمبر دیکھتی تھی پھر شیر دل کی آواز سن کر وہ فوری طور پر فون بند کر دیتی اور اس وقت وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ شیر دل شاید صرف اس سے بات کرنے کے لیے یہ نمبر استعمال کر رہا تھا اور جان بوجھ کر کالنگ کارڈ استعمال کرنا شروع ہو گیا تھا.. پھر اسے شیر دل کی ای میل یاد آئی جس میں اس نے شہر بانو کو کہا تھا کہ اس کا فون کام نہیں کر رہا سو فی الحال وہ فون پر اس سے رابطہ نہ کرے۔

”تو فون کام کر رہا تھا لیکن عکس پاکستان میں تھی اور اگر وہ پاکستان میں تھی تو......“ وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکی اس کے دماغ میں ایک دم جیسے کوئی جھکڑ چلنے لگا تھا۔ شرمین اور عکس کی بات کب ہوئی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے اب ہر قیمت پر چاہیے تھا۔

آئلہ سے ٹال مٹول کرنے کے بعد اس کے جاتے ہی اس نے شرمین سے جا کر یہی سوال کیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے شرمین بھی اسی طرح بھونچکا رہ گئی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اگر وہ پاکستان میں تھی تو شیر دل کا فون اس کے پاس کیسے ہو سکتا تھا......؟“ انہوں نے بھی ویسی ہی بے یقینی کے عالم میں اس سے کہا۔

”ہو سکتا ہے شیر دل نے اسے دے دیا ہو...... وہ ایمرجنسی میں پاکستان جا رہی تھی شاید اس کی ضرورت تھی یا کوئی بھی اور وجہ ہو سکتی ہے۔“ وہ بہت الجھی ہوئی شرمین کے پاس بیٹھی یہ معما حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”لیکن پھر شیر دل نے تم سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ فون خراب ہو گیا۔“ شرمین کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ممی وہ کبھی مجھے ان حالات میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے اپنا فون استعمال کے لیے عکس کو دیا تھا...... وہ۔“ شہر بانو بات کرتے کرتے رک گئی اس کی آواز کانپنے لگی تھی...... she had committed the blunder of her life......(اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی) اور اسے اب احساس ہوا تھا...... غلطی کسی سے بھی ہو سکتی تھی اور غلط فہمی بھی...... شرمین کو بھی...... اس نے شیر دل کو اپنی زندگی سے فوری طور پر نکال دینے کا فیصلہ اس ایک فون کال کی وجہ سے کیا تھا...... شیر دل کے کسی دوسری عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات...... یہ وہ غلطی تھی جس کے لیے وہ شیر دل کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی...... اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے جلد بازی ہو گئی تھی۔

شرمین سے مزید کچھ کہے بغیر شہر بانو نے فون اٹھا کر آئلہ کا نمبر ملایا اور اسے یوسف سے عکس کے سنگاپور سے روانہ ہونے کی تاریخ اور وقت پوچھنے کو کہا۔ آئلہ اس تفتیش پر بے حد حیران ہوئی تھی اور حیرانی سے زیادہ الجھن تھی جس کا وہ شکار تھی لیکن اس نے شہر بانو سے سوال جواب نہیں کیے تھے اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرنے کو کہا۔

”میں نے اسے 15 تاریخ کو کال کی تھی سنگاپور میں رات تھی اس وقت۔“ شرمین نے شہر بانو کو فون رکھتے

دیکھ کر اس کے کسی بھی سوال سے پہلے کہا۔ وہ چاہتی بھی تو اس تاریخ کو بھلا نہیں سکتی تھی۔ شہر بانو کو وہاں آئے ابھی چند دن ہی تو ہوئے تھے۔ شہر بانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا اس کی چھٹی حس بار بار جیسے کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

سٹنگ ایریا میں چپ چاپ مجسموں کی طرح بیٹھی وہ دونوں اس وقت صرف ایک دعا کر رہی تھیں کہ ان کی غلط فہمی غلط نہ ہو۔

پندرہ منٹ بعد آئلہ نے فون کیا تھا شہر بانو چند لمحے سفید چہرے کے ساتھ فون سنتی رہی پھر فون رکھتے ہوئے اس نے ستے چہرے کے ساتھ شرمین کو دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے شرمین کا دل جیسے ڈوبا تھا۔

”وہ 14 کو پاکستان چلی گئی تھی۔“ زندگی میں ایسی چپ شرمین کو دوسری بار لگی تھی‘ شہر بانو نے فون رکھ دیا تھا۔ بہت دیر تک وہ دونوں گم صم بیٹھی رہیں پھر شرمین نے جیسے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”تم شیر دل کو صرف ایک کال کی وجہ سے تو چھوڑ کر نہیں آئی تھیں شہر بانو۔“ شرمین نے جیسے اسے یاد دلایا تھا...... اس نے نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”لیکن میں نے اس سے طلاق صرف اسی ایک کال کی وجہ سے لی تھی۔“ اس کے حلق سے ایک سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

☆☆☆

”چڑیا؟“ وہ خیر دین کی آواز پر ہڑبڑا کر چونکی تھی۔ ”تم ابھی تک سوئی نہیں؟“ خیر دین تہجد کے لیے جاگا تھا جب گھر میں ہونے والی آہٹوں پر اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ عکس تھی جو رات کے پچھلے پہر راہداری کی کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہوئے وہاں ٹہل رہی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھی اس نے نہ خیر دین کے کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی تھی نہ ان کے باہر نکلنے کی۔ وہ راہداری کے چکر لگاتے ہوئے میکانکی انداز میں وقفے وقفے سے قدِ آدم کھڑکیوں سے باہر لان میں جلتی لائٹ میں نظر آنے والے پودوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں بس سونے جا رہی تھی۔'' اس نے خیر دین کے سوال کے جواب میں بے حد عجلت سے کہا اور رُکے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ خیر دین وہیں کھڑا رہا وہ پہلی رات نہیں تھی جب اس نے عکس کو راتوں کو اٹھ کر گھر میں پھرتے اور اس راہداری میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ وہ پچھلے چند دنوں میں کئی بار عکس کو اسی طرح رات کے پچھلے پہر گھر میں پھرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ بے چین، مضطرب اور اداس تھی...... اور اسے خیر دین کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی...... خیر دین کے دل پر عجیب سا بوجھ دھرا تھا...... بعض دفعہ اسے لگتا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنے رات گئے وہاں آتی تھی اور پھر اس کے کمرے میں جانے کی ہمت کیے بغیر وہیں ٹہلتی رہتی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بچپن سے ہی ایسی تھی...... اکیلی پھرتی...... اکیلی کھیلتی...... اکیلی جاگتی...... خود سے باتیں کرتی...... پر وہ بچپن تھا اور بچپن کی تنہائی بڑوں کو تنگ نہیں کرتی۔

''تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے کیا چڑیا؟'' صبح آفس جاتے ہوئے ناشتے کی میز پر خیر دین نے عکس سے کہا، وہ چونک گئی۔

''مجھے؟ نہیں تو......؟''

''پتا نہیں مجھے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور اگر تم کچھ کہنا چاہتی ہو تو مجھ سے کہہ دو چڑیا، میں تمہاری بات سنوں گا...... میں تمہاری کوئی بات نہیں ٹالوں گا۔'' پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جس میں خیر دین نے چڑیا کی خوشی کے سامنے ہار مان لی تھی لیکن وہ اپنی زبان سے یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا کہ وہ شیر دل سے چڑیا کی شادی کرنے پر تیار ہے۔

''مجھے کچھ بھی نہیں کہنا نانا...... اور جو کہنا ہوتا ہے میں کہہ دیتی ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتی۔'' توس پر مکھن لگاتے ہوئے اپنے ہی آخری جملے پر اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ وہ جھوٹ تھا اور یہ بات وہ دونوں جانتے تھے...... عکس مراد علی سے زیادہ بہتر راز رکھنا کسی کو نہیں آتا تھا۔

''آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' خیر دین کے پاس اس سوال کا جواب تھا لیکن بتا دینے کی ہمت نہیں۔

☆☆☆

ساتواں آسمان ان کے سر پر آگرتا تو انہیں اتنا شاک نہ لگتا جتنا شیر دل کی بات پر لگا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا...... منزہ اور بختیار ابھی کچھ دیر پہلے ہی کسی ڈنر سے واپس آئے تھے اور وہ ابھی لاؤنج میں بیٹھی اس کے ابھی تک گھر نہ آنے پر کچھ مضطرب سی ہو کر اسے کال کر رہی تھیں جب وہ اندر آگیا تھا۔

''تم صبح سے کہاں غائب ہو شیر دل؟'' منزہ کو یک دم جہاں اطمینان ہوا تھا وہاں ایک عجیب سی بے چینی بھی۔

''آپ کو بتا کر گیا تھا ممی کہ مجھے کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے وہیں صوفے پر ان کے پاس بیٹھ گیا اور پھر بغیر کسی تمہید کے اس نے جو بات منزہ سے کہی اب وہ اسی بات کو سن کر شاید اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

''تم نے کیا کہا؟'' انہیں یک دم احساس ہوا کہ انہیں غلطی بھی ہو سکتی تھی ضروری تھا کہ وہ اس سے ایک بار پھر سوال کر لیتیں۔

’’میں نے آپ سے کہا کہ آپ اور پاپا عکس کے نانا کے پاس جا کر اس سے میرے رشتے کی بات کریں۔‘‘ شیر دل نے اپنی بات دُہرادی۔ منزہ نے اب بھی وہی سنا تھا جو پہلے سنا تھا۔ ان کا دل یک دم جیسے ایک عجیب سی خوشی سے بھرا تھا۔ وہ بیٹھے بٹھائے اس بات پر کیسے مان گیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے سارے سوالات کو فوری طور پر بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

’’تم کب چاہتے ہو کہ ہم عکس کے گھر جائیں؟‘‘

’’کل ہی چلے جائیں۔‘‘ شیر دل نے اسی انداز میں کہا۔

’’ٹھیک ہے...... لیکن تم نے عکس سے بات کی ہے؟ اس سے پوچھ لیا ہے؟‘‘ منزہ کو جیسے کسی خدشے نے ستایا۔

’’ضرورت پڑی تو پوچھ لوں گا...... فی الحال تو ضرورت نہیں ہے...... عکس کو کسی بات پر اعتراض ہوا بھی تو اس کے نانا اسے منالیں گے...... میں بس چاہتا ہوں آپ کل جا کر اُن سے رشتے کی بات کریں۔‘‘ شیر دل اسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

’’میں کرتو لوں گی لیکن شاید تمہیں یہ نہیں پتا کہ عکس کی جواد سے منگنی ٹوٹنے کے بعد ایک اور منگنی ہو چکی ہے اور اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہیں، ایسے میں وہ تمہارے رشتے پر کیسے رضامند ہوگی؟‘‘ منزہ نے اپنی تشویش جیسے اس کے ساتھ بانٹی......

’’آپ وہاں جا کر رشتے کی بات کریں، یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔‘‘ وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ پتا نہیں منزہ کو کیوں ایسا لگا کہ وہ عکس سے مل کر آیا تھا اور یقیناً اسے رشتے پر آمادہ کر آیا تھا...... لیکن چند دنوں میں اس کی یہ کایا کلپ کیسے ہوگئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ لیکن وہ بے انتہا خوش تھیں اور خوش ہونے سے بھی زیادہ وہ مطمئن تھیں۔ آج انہوں نے ایک بار پھر شیر دل کو ایک نارمل انسان کی طرح ایک نارمل زندگی کی بات کرتے دیکھا تھا اور کسی نے ان کے کندھوں سے جیسے منوں بوجھ اتار دیا تھا۔

☆☆☆

’’کیا چاہیے تمہیں؟‘‘

’’کچھ نہیں......‘‘ شہر بانو نے ساتھ چلتی مثال کو دیکھا۔ مثال کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت میں ضرور تھا لیکن وہ مکمل طور پر اس سے بے نیاز سائڈ واک پر دکانوں کی کھڑکیوں میں سجی چیزیں دیکھتی اور کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیے بغیر چل رہی تھی۔ شہر بانو کو یاد تھا کہ وہ پہلے ایسی نہیں تھی، صرف کچھ مہینے پہلے جب وہ اور شیر دل اسے لیے کسی شاپنگ والی جگہ پر جاتے تو مثال کو جیسے کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ شاپنگ اسٹورز میں پڑا ہر کھلونا اور ہر کھانے پینے کی چیز اٹھا کر گھر لے جائے۔ وہ ہر کھلونا اور ہر کھانے پینے کی چیز اٹھا کر، شہر بانو اور شیر دل کو باقاعدہ بحث سے قائل کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ اسے اس کھلونے اور چیز کی کتنی اشد ضرورت تھی۔ شہر بانو کو تب اس کے ساتھ دماغ کھپانا نہیں پڑتا تھا، اس کام کے لیے شیر دل تھا۔ مثال کو سنبھالنا اور اس کی بحث کو سننا اس کی ذمے داری ہوتی تھی۔ وہ پچھلے چند مہینوں میں امریکا آنے کے بعد بالکل بدل گئی تھی۔ شہر بانو کو اب اسے زبردستی کھلونے یا کھانے پینے کی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا پڑتا...... زبردستی کھلونے خرید خرید کر تھمانے پڑتے جنہیں مثال عدم دلچسپی اور عجیب بے حسی کے عالم میں پکڑتی اور چل پڑتی تھی، ایک بچے والی خوشی اور ایکسائٹمنٹ اس کے چہرے یا انداز میں کبھی

نہیں جھلکتی تھی۔ اس کی ضدوں کی نوعیت اور محور اب بدل گئے تھے۔

آج شہر بانو نے کئی دنوں کے بعد اسے ساتھ لے کر آؤٹنگ کے لیے آنے کا ارادہ کیا تھا، وہ جیسے بار بار مثال کے ساتھ اپنے شکست و ریخت کے شکار رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ عجب صبر آزما کام تھا۔

''مثال تمہیں کیا چاہیے؟'' شہر بانو نے جیسے ڈھیٹ بنتے ہوئے کوئی دسویں بار وہ سوال کیا تھا۔

''Nothing'' جواب اسی بیزاری اور روکھے پن کے ساتھ دیا گیا تھا جس کے ساتھ پہلے جواب آتے رہے تھے۔

''آئس کریم کھاتے ہیں ابھی!'' شہر بانو نے اس کی رُکھائی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ مثال نے انکار یا اقرار دونوں نہیں کیے تھے...... جیسے کہہ رہی ہو...... آپ کی مرضی۔

کچھ دلبرداشتہ سی ہو کر شہر بانو نے اپنی توجہ ونڈو شاپنگ پر مرکوز کر لی۔ ایک شو اسٹور کی ونڈو میں لگے ہوئے ایک جوتے نے اس کی نظر اپنی طرف بھٹکائی تھی۔ وہ چلتے چلتے رُک گئی وہ اس جوتے کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ونڈو میں لگے دوسرے جوتوں اور ان کی قیمتوں پر بھی نظر دوڑانے لگی۔ مثال بھی اس کے برابر میں کھڑی بے مقصد اُن جوتوں پر نظر دوڑا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ شہر بانو کے ہاتھ میں تھا، شہر بانو کو وہاں رک کر ان جوتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے جب مثال نے ایک دم عجیب جوش و خروش کے عالم میں بلند آواز میں کہا۔

''ممی، پاپا......'' اس نے کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے شہر بانو سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ شہر بانو ہڑبڑا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی پھر اس طرف دیکھنے لگی جدھر مثال دیکھتے ہوئے جا رہی تھی۔ وہ پاپا، پاپا کہتے ہوئے سائڈ واک پر چلتے درجنوں لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی یوں جیسے کسی کے تعاقب میں ہو، شہر بانو برق رفتاری سے اس کے پیچھے گئی۔

''مثال، مثال......'' اس نے مثال کو آوازیں دے دے کر روکنے کی کوشش کی، وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ اس کے پکارنے پر عقب میں دیکھے بغیر کچھ اور تیز رفتاری سے آگے بھاگنے لگی تھی یوں جیسے اسے خدشہ ہو کہ شہر بانو اسے زبردستی روک لے گی۔ شہر بانو کو اسے نظروں سے اوجھل ہونے سے روکنے کے لیے اس کے پیچھے تقریباً بھاگنا پڑا تھا۔ اور پھر اس نے اس دراز قد آدمی کو دیکھ لیا جس کے پیچھے مثال بھاگتے ہوئے جا رہی تھی۔ وہ شیر دل نہیں تھا، شہر بانو نے ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا لیکن وہ عقب سے بالکل شیر دل ہی لگ رہا تھا۔ اس کی طرح دراز قد اور پُراعتماد انداز میں کسی لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلتے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ شہر بانو، مثال کو پکڑ لیتی وہ بھاگ کر اس آدمی کی ایک ٹانگ سے پاپا، پاپا کہتے لپٹ گئی تھی۔ وہ آدمی یک دم چونک کر رک گیا اور اس نے پلٹ کر اپنی داہنی ٹانگ سے لپٹی ہوئی بچی کو دیکھا تبھی اس نے بھی سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر اس نے جتنی تیز رفتاری سے اس کی ٹانگ کو پکڑا تھا اتنی ہی تیز رفتاری کے ساتھ اس نے ٹانگ چھوڑ دی۔ شہر بانو نے اس آدمی اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی لڑکی کو مسکرا کر ایک دوسرے سے کچھ کہتے سنا پھر وہ دونوں آگے چل پڑے تھے۔ مثال اسی طرح کھڑی تھی، شہر بانو تھکے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور گھٹنوں کے بل اس کے عقب میں زمین پر بیٹھ کر اس نے مثال کو اپنی طرف موڑا۔ مثال کا چہرہ دُھواں دھواں تھا اور اس کی آنکھوں میں شہر بانو نے

مایوسی کا ایک جہان دیکھا۔ وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑتے ہوئے کچھ دیر کے لیے چلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ اس کا اپنا چہرہ تھا۔ وہ بھی اسی طرح کئی بار شرمین کے ساتھ چلتے، چلتے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ پڑتی تھی کسی بھی ایسے شخص کے پیچھے جو اسے شہباز حسین جیسا لگتا تھا۔ چہروں میں اپنے باپ کے چہرے کو کھوجنا...... اور لوگوں میں سے صرف ایک شخص کو ڈھونڈنا...... شہر بانو ان چند منٹوں میں ہل کر رہ گئی تھی...... اس نے کبھی نہیں سوچا تھا...... پزلز اور اسٹوری بکس کی بھول بھلیوں میں سے راستہ تلاش کرنے والی اپنی بیٹی کو وہ یہ تلاش سونپ دے گی۔

کچھ بھی کہے بغیر اس نے مثال کو گلے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کے گلے لگنے کے بجائے ایک دم پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"I want to go to Papa
I want to go to Papa "

بعض دفعہ جس انا اور ضد کو کوئی دلیل اور کوئی ثبوت نہیں توڑ پاتے انہیں ایک بچے کے آنسو توڑ دیتے ہیں۔ شہر بانو بھی اس لمحے وہاں اس فٹ پاتھ پر بیٹھے بری طرح ٹوٹی تھی۔ وہ فیصلہ جو عام حالات میں وہ کبھی مر کر بھی نہ کرتی، وہ اس نے مثال کو چپ کروانے کی کوشش میں اپنے سینے کے ساتھ لگا کر کر لیا تھا۔ وہ شیر دل کے پاس واپس جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی حلیمہ کا سامنا کرتے ہوئے پہلی نظر میں ہی عکس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ یا تو اپ سیٹ تھی یا غصے میں تھی۔

''آپ کو کیا ہوا؟'' عکس نے ملازم کو اپنی کچھ فائلز کے حوالے سے ہدایات دینے کے بعد حلیمہ سے کہا۔ اس کا اندازہ تھا شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں وہ کسی بات پر ناخوش تھی آج کل وہ اسی کام کے لیے آئی ہوئی تھی۔ فیملی کے باقی لوگوں نے ایک ہفتے تک پاکستان آ جانا تھا۔ حلیمہ اسے بار بار آفس سے اب چھٹی کر لینے کا کہہ رہی تھی اور وہ مسلسل ٹال رہی تھی وہ شادی سے ہفتوں پہلے چھٹی لے کر نہیں بیٹھ سکتی تھی وہ بھی صرف اس لیے کہ اس پر ''روپ'' آئے مگر حلیمہ ایک روایتی ماں کی طرح اصرار کر رہی تھی۔

''ابا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حلیمہ نے جواباً بڑی خفگی سے اس سے کہا۔ عکس نے ہکا بکا ماں کی شکل دیکھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار حلیمہ کے منہ سے ایسی بات سن رہی تھی اور وہ بھی خیر دین کے بارے میں۔

''امی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!'' عکس نے جیسے بُرا منا کر ماں کو ٹوکا تھا۔ ''کیا کیا ہے نانا نے کہ آپ ایسی بات کر رہی ہیں؟'' حلیمہ نے اسی خفگی سے اس سے کہا۔

''تم ابا سے بات کرو اور سمجھاؤ۔''

''کیا سمجھاؤں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ اس کا خیال تھا شادی کی تیاریوں اور انتظامات کے حوالے سے ہی حلیمہ اور خیر دین کے درمیان کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہوا ہوگا.. مگر ایسا کون سا اختلاف تھا جس کے بعد حلیمہ، خیر دین کا دماغ خراب قرار دے رہی تھی۔

''ابا سجاد کے ہاں جا کر انکار کر آئے ہیں۔'' حلیمہ نے خفگی سے اسے بتانا شروع کیا۔ عکس کی کچھ سمجھ

میں نہیں آیا۔

''کیا انکار کر آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''شادی سے انکار کو آئے ہیں۔'' حلیمہ اسی انداز میں بولتی رہی۔ اس بار عکس بھونچکا ہو کر رہ گئی تھی۔

''نانا نے سجاد سے رشتہ ختم کر دیا میرا؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں...... اور ایک شیر دل کے ماں باپ آئے تھے آج! ابا نے ایک کے ساتھ رشتہ طے کر دیا...... ذرا سوچو وہ طلاق یافتہ ایک بچی کا باپ ہی ابا کو نظر آیا تمہارے لیے...... اور وہ بھی سجاد جیسا اچھا رشتہ چھوڑ کر...... اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ابا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حلیمہ بولتی جا رہی تھی اس بات کا اندازہ کیے بغیر کہ عکس پر کیا گزر رہی تھی۔

''نانا نے شیر دل کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیا؟'' اس نے بے یقینی میں حلیمہ کی بات دُہرائی پھر کہا۔ ''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے امی۔ نانا ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ شیر دل کے ماں باپ آئے ہوں گے لیکن نانا نے انہیں انکار کر دیا ہوگا۔'' اس نے ماں کو سمجھانے سے زیادہ خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا تھا...... یہ واقعی کیسے ہو سکتا تھا؟

''مجھے غلط فہمی......؟ میرے سامنے ساری بات چیت ہوئی ہے اور میرے احتجاج کے باوجود ابا نے رشتہ توڑ دیا اور ان لوگوں کو شادی کی وہی تاریخ دے دی۔'' حلیمہ بہت پریشانی کے عالم میں بول رہی تھی۔

عکس کچھ دیر ماں کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اس شادی میں کچھ بھی honourable نہیں ہے۔ میں تو کبھی شیر دل سے شادی نہیں کروں گی۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔

''یہی تو...... اس لیے تو میں بھی ابا سے کہتی رہی کہ ساری عمر جس خاندان کا لایا ہوا عذاب ہم اُٹھا اُٹھا کر پھرتے رہے کم از کم اب تو انہیں جانے دیں۔ رہنے دو۔ میری بیٹی کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے تو ہم کیوں کسی طلاق یافتہ سے رشتہ کرتے پھریں۔'' حلیمہ کا پارا شاید اب بھی نیچے نہیں آیا تھا۔

''اسی لیے کہہ رہی ہوں تم ابا سے بات کرو...... صاف انکار کر دو انہیں۔ تمہاری بات ابا نہیں ٹالیں گے تم ضد پر اَڑ جاؤ۔ سجاد کے ماں باپ سے میں بات کر لوں گی۔'' حلیمہ نے جیسے اسے پوری پلاننگ بتائی۔

''امی میں نانا سے بات کر لوں گی کسی ضد اور پلاننگ کی ضرورت نہیں ہے، نانا میرے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے۔'' وہ کہتے ہوئے وہاں سے اندر چلی گئی تھی۔ یک دم اس کا دماغ جیسے آندھیوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل کچھ دیر کے لیے سانس بھی نہیں لے سکا تھا۔ اس کے سیل فون پر شہر بانو کا نام چمک رہا تھا۔ اسے لگا اسے دھوکا ہوا ہے۔

(آخری قسط انشاء اللہ اگلے ماہ)

صراطِ مستقیم

عطیہ عمر

چائے کا کپ افتخار کے سامنے رکھتے ہوئے نفیسہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سامنے صوفے پر ٹک گئیں۔

''تم چائے نہیں پی رہیں؟'' وہ چائے کی بہت شوقین تھیں، اس لیے انہیں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر افتخار کو حیرت ہوئی۔

''جی نہیں چاہ رہا۔'' نفیسہ کے بیزار سے لہجے نے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ اس بیزاری



کی وجہ وہ اچھی طرح جانتے تھے مگر اس وجہ کو دور کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

''عامر اور عازم، گھر میں نہیں ہیں؟'' افتخار نے نفیسہ کا دھیان بٹانا چاہا مگر الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔

''عازم اپنے دوست کے گھر گیا ہے، ان کے گھر قربانی کے جانور آگئے ہیں۔ اس سال تو وہ بکروں کے علاوہ اونٹ کی بھی قربانی کر رہے ہیں۔''

افتخار نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں جاتا دیکھ کر نفیسہ تیکھے لہجے میں بولیں۔

''رکیں تو، عازم پوچھ رہا تھا، ہمارے ہاں بس دو بکرے ہی آئیں گے؟ تو میں نے کہا نہیں بیٹا، اس بار تو آپ کے ابا بکرے بھی نہیں لا رہے، گائے میں حصہ ڈال رہے ہیں۔''

''تمہیں سمجھ کیوں نہیں آرہی نفیسہ، میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ دو بکرے قربان کرسکوں، اس لیے گائے میں حصہ ڈالا ہے۔'' افتخار زور سے بولے۔

''تو دو نہ سہی، ایک بکرا قربان کردیں۔''

''کیا مطلب...... تمہارے حصے کی قربانی نہ کروں اور جو تم نے اتنا زیور اکٹھا کر رکھا ہے اسے جہنم کا ایندھن بننے دوں؟ یا پھر یوں کرو، اس زیور میں سے کچھ بیچ کر قربانی کردو لیکن یاد رکھو پھر یہ اللہ کی راہ میں سنتِ ابراہیمی کی پیروی نہیں بلکہ لوگوں کی واہ واہ اور نمود و نمائش کے لیے خرچ ہوگا۔''

''ہاں، بس علامہ تو آپ ہیں اور آپ کی بہن...... اس روز زارا کو روزہ چھوڑنے پر کتنی باتیں سنا گئیں۔ ایسے جاہل ہم بھی نہیں، مسلمان ہیں، مسلمانوں کی اولاد ہیں، بس آپ لوگوں کی طرح بات بے بات فتوے دینے کی عادت نہیں۔'' نفیسہ ان کی بات پر جل کر بولیں۔ انہیں دو مہینے پہلے کی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

''خدا کے لیے نفیسہ، سوچ سمجھ کر بولا کرو، اتنے سالوں میں بھی تمہیں میری اور آپا کی سیدھی سچی بات بری لگتی ہے، ہر بات کو تم ذاتی انا کا مسئلہ کیوں بنا لیتی ہو۔''

''جی بالکل، سیدھی اور سچی بات آپ اور آپ کی بہن ہی کرسکتے ہیں۔ اس کنیز کو سچی بات کرنے کی اجازت نہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو نفیسہ، آپا کون سا عام روایتی نندوں کی طرح تمہارے ہر معاملے میں مداخلت کرتی ہیں یا بہت زیادہ تمہارے گھر آتی ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ دو ڈھائی ماہ کے بعد اس روز ہمارے گھر آئی تھیں اور وہ بھی ہم نے افطاری کے لیے بلایا تھا تو تب آئی تھیں۔''

''اچھا تو میرے میکے والوں کے آنے کا طعنہ دینا چاہتے ہیں۔ بہن، بیٹی کی محبت میں آجاتے ہیں تو کون سا خالی ہاتھ آتے ہیں۔''

''نفیسہ، نفیسہ...... کاش تمہارا اندازِ فکر اور اندازِ گفتگو بھی نفیس اور شائستہ ہوتا۔ پلیز، ذرا سکون سے میری بات سنو، مجھے تمہارے والدین اور بہن، بھائیوں کے اس گھر میں آنے جانے سے کوئی تکلیف نہیں، اور نہ ہی مجھے بے جا تکلفات اور نمود و نمائش پسند ہے۔ تحفہ دینا سنتِ رسول ﷺ ہے۔ اس سے آپس میں محبت بڑھتی ہے لیکن جب اس تحفے میں خلوص سے زیادہ نمائش اور اگلے کو زیر بار کرنا مقصود ہو تو پھر بتاؤ محبت بڑھے گی یا آزمائش؟ اسی لیے میں نے بارہا تمہیں سمجھایا ہے کہ تمہارے والدین اور بہن بھائی، میرے لیے قابلِ احترام ہیں، عید، بقر عید یا کسی اور موقع پر اگر وہ کوئی تحفہ دیں تو ان کا شکریہ لیکن جب بھی آئیں تو کیا لازم ہے کہ پھلوں، مٹھائیوں وغیرہ کے ساتھ آئیں، سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایک تنخواہ دار شخص ہوں، میری محدود آمدنی ہے، جس میں مجھے گھر بھی چلانا ہے اور کچھ نہ کچھ مستقبل کے لیے بھی بچانا ہے۔ ابھی تو پھر بھی بچے چھوٹے ہیں لیکن کل۔ ان کے تعلیمی اخراجات کے لیے ابھی سے سوچنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں کوئی بہانہ بنا دوں گی، ہم زارا کے گھر عید ملنے نہیں جائیں گے۔'' افتخار نے خاموشی سے اٹھ جانا مناسب سمجھا۔ ان کی شادی کو تیرہ برس ہو رہے تھے، نفیسہ، ان کی مرحومہ اماں اور آپا کی مشترکہ پسند تھیں۔ وہ ان کے ابا جان کے دوست کی بیٹی تھیں۔ اچھا شریف خاندان تھا۔ زیادہ تر مرد کاروبار سے وابستہ تھے۔ افتخار مناسب قد و قامت کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور نفیسہ گریجویٹ تھیں۔ صورت شکل کی بھی کافی اچھی تھیں۔ گھر داری میں بہت سگھڑ نہ تھیں تو پھوہڑ بھی نہیں تھیں لیکن ان کا خود کو اور اپنے میکے والوں کو برتر سمجھنے کا زعم اور ہر حالت میں خود کو درست سمجھنا کبھی کبھی افتخار کو پریشان کردیتا جیسے اس وقت ہوا تھا۔

☆☆☆

اماں کا تو افتخار کی شادی کے بعد جلد ہی انتقال ہوگیا۔ کئی سالوں سے وہ گردوں کے مرض میں مبتلا تھیں۔ سال بھر پہلے ابا بھی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اب گھر میں صرف افتخار اور نفیسہ تھے یا پھر ان کے بچے۔

زینب آپا، ایک عام گھریلو عورت کی طرح اپنی ذمے داریوں میں مصروف رہتیں، اکلوتے بھائی بھابی اور بھتیجوں کی محبت میں ان سے ملنے آتیں تو کسی عام اور معمولی سی بات پر نفیسہ کا کھنچا، تنا رویہ انہیں پریشان کردیتا مگر وہ کوشش کرتیں کہ اپنی پریشانی کا اظہار بھائی کے سامنے نہ کریں۔ افتخار اور زینب کے والدین نے اپنے بچوں کو مذہب کا صحیح شعور دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ مذہب کے احکام کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کریں اور جاننے کے بعد عمل کی بھی ہر ممکن کوشش کریں۔ کوتاہی ہوجائے تو کسی مخلص دوست کی نشاندہی پر اس کوتاہی کو فوراً مان لیں اور ازالے کی بھرپور کوشش کریں جبکہ نفیسہ کے ہاں، نماز، روزے وغیرہ کا اہتمام تو تھا مگر بہت سے معاملات کو معمولی جان کر نظر انداز کردیا جاتا۔ خاندان کی خواتین خصوصاً ''لوگ کیا کہیں گے؟'' قسم کے جملوں اور خیالات کے زیرِ اثر رہتی تھیں۔

نفیسہ کی سب سے چھوٹی بہن زارا، ان کے پاس رہنے آئی تھی۔ دراصل نفیسہ نے اپنے میکے والوں کو افطاری پر بلایا تھا، افتخار نے تو کہا کہ آپا کو بھی ساتھ ہی بلا لیتے ہیں مگر نفیسہ کہنے لگیں کہ زارا کی ہونے والی سسرال بھی مدعو ہے اور آپا کے بھی سب سسرال والوں کو بلانا ہے تو لوگ زیادہ ہو جائیں گے۔ انہیں الگ سے بلا لیں گے۔ افتخار نے نفیسہ کی بات مان لی۔ افطاری کے بعد باقی سب لوگ تو چلے گئے، زارا کو نفیسہ نے روک لیا کہ چند دن بعد آپا کی افطاری کرنی ہے تو کچھ مدد ہی کروا دے گی اور ویسے بھی جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے تو پھر جانے کب بہن کے گھر آنے اور رہنے کا موقع ملے۔

دو تین روز بعد زینب آپا کی افطاری تھی۔ آپا، ان کے شوہر اور بچے، عصر کی نماز کے بعد جلد ہی آگئے...... آپا کا خیال تھا کہ نفیسہ کی مدد کروا دیں گی۔ وہ فروٹ چاٹ کے لیے پھل کاٹ رہی تھیں، جب نفیسہ کہنے لگیں۔

''ارے زارا! ذرا شربت چکھ لو، کل بھی تمہارے بھائی جان کو پھیکا لگ رہا تھا۔''

''ویسے میری بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جس کسی کی افطاری کروانی ہو، ان دنوں میں کرواؤں، جب میرے روزے نہیں ہوتے کیونکہ ایک تو یہ چکھنے وغیرہ کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے اور دوسرے تلاوت وغیرہ کا ناغہ نہیں ہوتا۔'' آپا مسکرائیں۔

''نہیں زینب آپا، وہ والی چھٹیاں تو گزر گئیں، دراصل دو دن سے میری طبیعت بہت خراب ہے، نزلہ، بخار نے ادھ موا کر رکھا ہے۔ سحری میں اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔''

''جب اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہوئی ہے تو

یہ دو روزے بعد میں رکھ لینا۔'' آپا بولیں۔

زارا کے بتانے پر زینب کچھ دیر خاموش رہیں، زارا کی ظاہری حالت خدانخواستہ کسی بڑی بیماری یا کمزوری کو ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ ہاں اس کی آواز قدرے بھاری ہو رہی تھی مگر پھر اُن سے رہا نہ گیا، یہ ان کی مسلمان بہنیں تھیں، نسلوں کی امین تھیں، جو بات وہ جانتی تھیں، ان تک پہنچانا، ان کا فرض تھا...... یہی سوچ کر وہ بولیں۔

''زارا اپنی طبیعت کو تم زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہو لیکن میں نے رمضان المبارک کے روزے کو اس وقت چھوڑنے اور بعد میں رکھنے کے جو احکامات پڑھ رکھے ہیں، ان کے مطابق، روزہ چھوڑنے کی تب اجازت ہے، جب جان جانے کا خطرہ ہو یا بیماری بہت زیادہ بڑھ جانے کا اندیشہ ہو اور یہ بات آپ کو کوئی مسلمان ڈاکٹر یا حکیم، جو روزے کے مسائل سے واقف ہو، بتائے کہ اگر مریض نے روزہ رکھا تو اس کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آ سکتا ہے کسی معمولی عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑنا درست نہیں کیونکہ...... رمضان المبارک کے روزے کی فضیلت عمر بھر کے روزوں سے بھی بڑھ کر ہے۔''

''آپ کو کیا معلوم کہ اسے کس قدر شدید بخار تھا۔ گلے میں کیسی دُکھن تھی۔ آواز بھی نہیں نکل رہی تھی اور یہ تو ہم نے بھی قرآن پاک میں پڑھ رکھا ہے کہ بیماری یا سفر کی حالت میں روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، ہاں بعد میں رکھنا ضروری ہے۔'' نفیسہ تیز لہجے میں بولیں۔

''درست کہہ رہی ہو نفیسہ اور میں یہ نہیں کہہ رہی کہ زارا کی طبیعت خراب نہیں تھی، یقیناً خراب ہو گی، اب بھی اس کی آواز بھاری ہے، میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ نزلہ، زکام یا بخار وغیرہ کے لئے ڈاکٹر سے سحری اور افطاری کے لیے دوا لے سکتے ہیں اور یوں بھی بیماری میں کچھ زیادہ کھانے پینے کو جی بھی نہیں چاہ رہا ہوتا، شروع رمضان میں حذیفہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ تین، چار دن بخار میں پڑا رہا۔ خود ایوب کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر سفر پہ جانا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ اکثر مفتی صاحب سے رمضان کے مسائل پوچھتے رہتے ہیں۔ سفر کے لیے یہ بھی ہے کہ اگر آپ ہوائی جہاز یا کار کا ایسا سفر کر رہے ہیں، جس میں زیادہ محنت طلب کام نہیں، سحری، افطاری کا انتظام ہے، کم دورانیے کا آرام دہ سفر ہے تو روزہ چھوڑنا درست نہیں، ہاں موسم شدید ہو، سفر لمبا تو پھر سفری رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''آپا، ہمارے گھر میں بھی نماز، روزے کا خیال رکھا جاتا ہے، آخر ہم بھی مسلمانوں کی اولاد ہیں۔'' آپا خاموش ہو گئیں کیونکہ نفیسہ کا اگلا جملہ جو اس کی زبان سے ادا نہیں ہوا تھا، آپا نے سمجھ لیا تھا۔ ''اکیلے آپ لوگ ہی مسلمان نہیں یا دین کا علم صرف آپ ہی نہیں جانتے۔'' بعد میں سارا وقت نفیسہ کا مزاج، تنا تنا رہا اور آپا بھی افسردہ رہیں۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ کسی اور کو اس تناؤ کا اندازہ نہیں ہو۔ وہ اپنے میکے کا بھرم قائم رکھنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

اور اب افتخار اور نفیسہ کے درمیان جو تازہ مسئلہ تھا، وہ قربانی کا تھا۔

ابا کے زمانے میں وہ پوری گائے قربان کرتے تھے۔ دو حصے، ابا، اماں کے، دو دادا، دادی کے، دو افتخار اور نفیسہ کے اور ایک رسول ﷺ کا۔ رسول کریمؐ ہمیشہ امت کی طرف سے بھی قربانی کیا کرتے تھے، اس لیے امت محمدیہؐ کے وہ افراد جن کی مالی حالت اجازت دے، ان کے لیے احسن ہے کہ وہ اپنے آقا ﷺ کی طرف سے قربانی کریں۔

ابا نے اپنی زندگی میں ہی زینب آپا کو ان کا شرعی حصہ دے دیا تھا اور افتخار کو مشورہ دیا تھا کہ تم اپنی بچت کو کسی جائداد کی صورت محفوظ کر لو۔ ابا کی صحت کافی اچھی تھی اور فارغ بیٹھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ اس لیے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک نجی ادارے میں بہت اچھے عہدے پر ملازم تھے اور گھریلو اخراجات وہی چلاتے تھے۔ افتخار کی تنخواہ عام طور پر خرچ نہ ہوتی۔ سوائے ذاتی اخراجات کے...... ابا دیکھ رہے تھے کہ نفیسہ میں نمود و نمائش کا جذبہ زیادہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اچھی ساکھ کے تعمیراتی ادارے کا رہائشی فلیٹ ان کے لیے بک کروا دیا۔ اب افتخار کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ اس مد میں چلا جاتا تھا۔ ابا کے انتقال کے بعد ان کی تنخواہ اور سرکاری پنشن دونوں بند ہو گئیں۔ گھریلو اخراجات کی تمام تر ذمے داری افتخار پر آن پڑی۔ ان کی اچھی خاصی معقول تنخواہ تھی مگر نفیسہ کو حالات مشکل لگ رہے تھے...... اور ایسے میں کبھی جو افتخار، نفیسہ کی جھنجلاہٹوں کے جواب میں کہہ دیتے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا، اماں کیا کرتی تھیں، شروع میں ابا کی تنخواہ کافی کم تھی مگر اماں نے کبھی واویلا نہیں کیا، ہم لوگوں کی تعلیم، گھر کے اخراجات، سب کچھ ہوتا پھر میری آپا کی تعلیم، شادی سب ہی کام ہوتے چلے گئے۔''

''تب اتنی مہنگائی کہاں تھی؟'' نفیسہ گرم ہو جاتیں ''بس اماں، بہن کی تعریفیں کروا لو......''

''ہاں، لیکن اسی حساب سے آمدن بھی ہوتی تھی۔ وہ تو شکر کرو کہ ابا کے کہنے پر میں نے فلیٹ بک کروا لیا تھا اور ابھی اس کی اقساط بھی تقریباً پوری ہونے والی ہیں اور ان شاء اللہ جلد ہی قبضہ بھی مل جائے گا۔ اچھا علاقہ ہے امید ہے کہ بہت جلد کرائے دار مل جائیں گے۔'' افتخار، بیوی کے مزاج کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔

''تو وہ کرایہ کون سا میرے پاس آئے گا، وہ تو آپ کی بہن کے حکم پر اسلامی بینک میں جمع ہو گا۔'' نفیسہ، ایک نیا شکوہ تلاش کر لیتی اور افتخار زچ ہو جاتے۔

''اُف...... کیسی الٹی کھوپڑی ہے تمہاری...... تو وہ بچت کیا آپا کی جیب میں جائے گی؟ ہمارے ہی بچوں کے مستقبل کے لیے ہے۔''

☆☆☆

زارا کی شادی کے لیے تحفے کا انتخاب نفیسہ کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ بڑی آپا، اچھا خاصا وزنی سونے کا سیٹ دے رہی تھیں، چھوٹی خالہ، خالو نے ملائشیا میں ہنی مون منانے کے لیے دولھا، دلہن کو سفری ٹکٹ دینے کے علاوہ ہفتے بھر کے لیے ہوٹل میں کمرا بھی لیا تھا۔ ماموں، مامی کے تحفے تو جو تھے، سو تھے۔ ان کی بیٹی جو زارا کی دوست اور ہم عمر تھی۔ سال بھر پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ زارا بتا رہی تھی کہ وہ اسے ایمرلڈ اور سونے کے ٹاپس دینے والی تھی۔ ایسے میں نفیسہ کو کوئی چھوٹا موٹا تحفہ یا سلامی کی رقم دینے میں ہتکی محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہارے پاس ٹھیک ٹھاک زیور ہے۔ اسی میں سے کچھ دے دو۔'' افتخار نے کہا تو نفیسہ کو بہت برا لگا۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا، زارا نے بھی سب زیور دیکھ رکھا ہے۔ کیا سوچے گی، باجی نے پرانا زیور دے دیا۔''

افتخار کو ہار ماننی پڑی... اس ماہ فلیٹ کی قسط جمع نہیں کروائی گئی جو تھوڑی بہت بچت تھی، وہ سب خرچ ہو گئی۔ زارا کے لیے سونے کا سیٹ، نفیسہ اور بچوں کے لیے شادی میں پہننے کے کپڑے وغیرہ تو خرید لیے لیکن انہیں زندگی میں پہلی بار اپنے ایک دوست سے قرض لینا پڑا۔

افتخار کے جو مالی حالات تھے، انہیں خدشہ تھا کہ وہ اس ماہ بھی فلیٹ کی قسط جمع نہیں کروا سکیں گے۔ وہ تو شکر ہے کہ ان کا سابقہ ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ ہمیشہ ہی قسط کی رقم بروقت جمع کروائی تھی اور اب تو تین، چار اقساط ہی باقی تھیں...... پھر اب یہ... ذوالحجہ کا مہینہ آ رہا تھا۔ قربانی کا انتظام بھی کرنا تھا۔ جی تو افتخار کا بھی چاہتا تھا کہ ابا کی طرح وہ بھی اپنے والدین کی جانب سے بھی قربانی کریں اور رسول کریم ﷺ کی جانب سے بھی لیکن فی الحال ان کی

جیب اجازت نہیں دیتی تھی۔ اُدھر جس دوست سے قرض لیا تھا، اسے بھی پیسوں کی ضرورت تھی...... افتخار کافی پریشان تھے۔ اس پر نفیسہ کی ضد کہ بکرے کی قربانی کی جائے تاکہ وہ زارا کے گھر عید ملنے جائیں تو بکرے کی ران لے کر جائیں......

''امی، ابو کے گھر میں سب کی دعوت ہوگی، آپا کے ہاں بھی باربی کیو دعوت ہوتی ہے اور خالہ، خالو، کے فارم ہاؤس پر جو شاندار دعوت ہوتی ہے، اس کی تو بات ہی اور ہوتی ہے...... اور میں...... میں کیا بتاؤں کہ میرے میاں صاحب نے گائے میں حصہ ڈالا ہے۔ ابا بھی گائے کی ہی قربانی کرتے تھے لیکن کم سے کم پوری گائے تو ہوتی تھی۔ اب تو...... آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں، زارا کی سسرال میں پہلی عید ہے، اس کے میاں اور سسرال والے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔'' نفیسہ کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی ہوئی تھی۔ افتخار بنیادی طور پر غصیلے نہیں تھے مگر چھٹی کا یہ دن صبح سے ہی نفیسہ نے اپنی باتوں سے برباد کر رکھا تھا۔ چنانچہ اب نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی اپنے مزاج کے برخلاف چلّانے لگے۔

''تمہاری فضول، لایعنی اور بے ہودہ باتوں سے میں عاجز آچکا ہوں۔ مجھے قربانی اللہ کی رضا کے لیے سنت ابراہیمیؑ کی پیروی میں کرنی ہے۔ اپنے رسول ﷺ کے حکم کو پورا کرنا ہے۔ تمہارے اور تمہارے خاندان کی خوشی اور نمائش کے لیے نہیں کرنی۔ اس لیے اب اس موضوع پر ہرگز بات نہیں ہوگی۔ مجھے تو پہلے ہی پچھتاوا ہو رہا ہے کہ تم جیسی کم عقل کی خوشی کے لیے قرض لیا۔ اب وہ قرض بھی دینا ہے، فلیٹ کی قسط پچھلے ماہ ادا ہو سکی اور نہ اب...... اور میں تو حیران پریشان ہوں کہ آئندہ کیا ہوگا۔''

''نہ جانے کیوں بھول جاتی ہوں کہ آپ کو تو کبھی میری کوئی بات اچھی لگی ہے نہ میرے خاندان والوں کی۔'' نفیسہ کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔ روتے روتے بھاری آواز میں بولیں۔

''بے وقوف، کچھ تو عقل سے کام لو، تمہاری بڑی آپا کے شوہر کا اچھا خاصا کاروبار ہے اور خالو، دو فیکٹریوں کے مالک ہیں۔ ہم ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''ہاں، بس میری ہی قسمت خراب ہے۔''

''ناشکری عورت۔'' دونوں ہی ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے کہ گیٹ کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

''عازم گیٹ کھولنے گیا ہے، آپ دونوں، پلیز اپنے موڈ ٹھیک کر لیں۔'' بارہ سالہ عامر نے دروازے سے جھانک کر کہا تو افتخار کو بہت شرمندگی ہوئی۔ انہیں اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی یاد آئی۔ اماں، ابا گھر کا پُرسکون ماحول سب کچھ یاد آیا اور دل میں ہوک سی اٹھی۔

''میں اپنے بچوں کو کیا دے رہا ہوں؟''

باہر سے زینب آپا اور ان کے شوہر ایوب بھائی کی آوازیں آرہی تھیں۔ افتخار جلدی سے اٹھ کر باہر آگئے۔ ایوب بھائی، ان سے ملتے ہوئے بتانے لگے۔

''اصل میں، ہم لوگ امامہ (ان کی چھوٹی بہن) سے ملنے گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس کی ساس، آج کل اپنے بڑے بیٹے کے گھر رہنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کے پاؤں میں موچ آگئی۔ ہم نے سوچا ان کی عیادت کرتے جائیں اور چونکہ ان کا گھر آپ لوگوں کے گھر سے قریب ہے اس لیے بغیر اطلاع کے آپ کے یہاں بھی آگئے۔''

''کمال ہے ایوب بھائی! آپ کا اپنا گھر ہے، جب جی چاہے آئیں، پہلے سے اطلاع دینے جیسے تکلفات کی کیا ضرورت ہے؟''

''نہیں، افتخار، یہ تکلف نہیں بلکہ سنتِ رسول ﷺ کی پیروی سمجھ لو۔ جانتے ہو نا کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب کسی کے گھر جاؤ تو تین بار اجازت طلب کرو، اگر جواب نہ ملے تو واپس آجاؤ۔ آج کل ٹیلی فون، موبائل فون کی سہولت میسر ہے تو کیا یہ مناسب نہیں کہ میزبان سے معلوم کر لیں وہ مصروف تو نہیں، اس کا کہیں اور جانے کا ارادہ تو نہیں، اس میں مہمان اور میزبان دونوں ہی کے لیے آسانی ہے۔'' ایوب بھائی کی بات سے افتخار سو فیصد متفق تھے۔

نفیسہ بھی کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔ زینب آپا اس سے ملتے ہوئے بولیں۔

''تم دونوں کے موبائل فونز کہاں رکھے ہیں، میں بات کرنا چاہ رہی تھی مگر گھنٹی جانے کے باوجود کوئی نہیں اٹھا رہا۔''

افتخار نے گھنٹی کی آواز سنی تو تھی مگر نفیسہ کی باتوں سے وہ اس قدر پریشان تھے کہ کسی سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''اچھا، میں نے تو آواز نہیں سنی، شاید کچن میں تھی۔'' نفیسہ نے جواب دیا۔ اب زینب آپا انہیں امامہ کی ساس کا بتا رہی تھیں۔

''بہت صابر، شاکر اور خوش مزاج خاتون ہیں۔'' نفیسہ غائب دماغی سے ان کی باتیں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سن رہی تھیں۔ ''مجھے تو ان کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ اس تکلیف میں بھی شکر کا پہلو تلاش کیے ہوئے تھیں، کہنے لگیں۔'' ارے بیٹا، اس عمر میں تو جانے کتنی تکلیفیں، بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں مگر اللہ کا شکر ہے، مجھے گھٹنوں، جوڑوں وغیرہ میں بھی درد نہیں ہوا۔ مجھ سے کم عمر لوگ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں مگر میں آرام سے جانماز پر پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر پوچھ رہا تھا، شوگر، بلڈ پریشر، وغیرہ تو نہیں آپ کو۔ میں نے کہا، بلڈ پریشر کے لیے دوا لیتی ہوں تو ٹھیک رہتی ہوں اور شوگر الحمدللہ نہیں ہے۔ ورنہ اس عمر میں اس طرح کی چوٹوں کا ٹھیک ہونا ویسے ہی آسان نہیں ہوتا اور شوگر کے مریض کے لیے اور بھی مسئلہ ہو جاتا ہے...... اللہ بڑی تکلیف اور نقصان سے بچائے...... شکر ہے ہڈی ٹھیک ہے۔''

''امامہ، اس کے بچے ٹھیک ہیں؟'' نفیسہ نے پوچھا۔

''ہاں، اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہیں، وہ بھی تمہارا پوچھ رہی تھی۔ خصوصاً جواد، عامر کا پوچھ رہا تھا...... دونوں ہم عمر جو ہیں اور میں نے دیکھا ہے، دونوں ایک ہی جیسے قدرے سنجیدہ سے ہیں۔''

افتخار یہ سب دیکھ رہے تھے، آپا کچھ دیر رکیں تو بیوی سے بولے۔

''نفیسہ، چائے بنالو......'' افتخار کے کہنے پر نفیسہ اٹھنے لگیں تو ایوب بھائی جلدی سے بول اٹھے۔

''نہیں بھابی، پلیز، آپ تو جانتی ہیں، میں چائے بہت کم پیتا ہوں اور ابھی تو پہلے امامہ کے گھر سے چائے پی، اس کے بعد نصیر (امامہ کے دیور) کے ہاں سے کولڈ ڈرنکس لی ہیں تو فی الحال کچھ نہیں۔''

''ہاں نفیسہ! کسی تکلف کی ضرورت نہیں، آؤ، تم اِدھر بیٹھو۔'' زینب آپا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ ایوب بھائی، افتخار سے پوچھ رہے تھے۔

''افتخار ایک بات بتاؤ، تم اپنے فلیٹ کی قسط کیوں نہیں جمع کروا سکے؟'' افتخار نے بے اختیار نفیسہ کی جانب دیکھا۔

''برامت ماننا...... صدیقی بلڈرز کا منیجر میرے پاس آتا رہتا ہے۔ زیادہ دوستی تو نہیں لیکن وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ اسی نے یونہی باتوں میں یہ تذکرہ کیا تھا۔ کچھ مسئلہ ہے کیا؟'' ایوب بھائی کے خلوص اور سمجھداری پر افتخار کو پورا بھروسا تھا۔ وہ انہیں صاف صاف بتانے لگے۔ شاید ویسے نہ بھی بتاتے لیکن اس وقت مالی پریشانی اور نفیسہ کے رویے سے وہ بہت زیادہ ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔

''جی ایوب بھائی، بس پچھلے دنوں خرچ زیادہ ہوگیا اور اس مہینے قربانی بھی کرنی ہے تو اس ماہ بھی قسط نہیں دے سکوں گا کیونکہ ایک دوست سے کچھ قرض لیا تھا۔ اسے بھی اسی ماہ پیسے واپس کرنے ہیں۔''

''مگر ایسا بھی کیا خرچہ ہوگیا کہ تمہیں ادھار بھی لینا پڑا۔ تمہاری ماشاء اللہ اچھی خاصی تنخواہ ہے۔'' ایوب بھائی کے کہنے پر زینب آپا بول اٹھیں۔

''اس بات کو چھوڑیں، اس قدر مہنگائی کا دور ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح آمدن اور خرچ میں توازن رکھا جائے۔'' افتخار سمجھ گئے کہ وہ اسے اور نفیسہ کو شرمندگی سے بچانا چاہتی ہیں۔ ورنہ ان کی شادی کے شروع دنوں میں جب ایوب بھائی کا کاروبار ابھی ابتدائی مراحل میں تھا تو انہوں نے خود ٹیوشنز پڑھائیں، سب کام خود کرتی تھیں، جز وقتی ملازمہ بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا سب زیور ایوب بھائی کو دے دیا۔ انہی دنوں ابا نے زینب آپا کا شرعی حصہ انہیں دیا تھا۔ وہ سب بھی ایوب بھائی کے کاروبار میں لگا دیا گیا۔ اللہ نے ان کی صاف نیت اور محنت کا اجر دیا اور ان کا کاروبار اب کافی مستحکم حالت میں تھا۔

''آپا، کاروبار کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ تنخواہ میں تو گنی بندھی رقم ہاتھ میں آتی ہے۔'' نفیسہ کے کہنے پر آپا مسکرائیں۔

''درست کہتی ہو...... لیکن کاروبار میں اللہ نہ کرے اچانک نقصان بھی ہوسکتا ہے پھر منافع کبھی کم، کبھی زیادہ...... اللہ مغفرت کرے میری اماں اور ساس دونوں ہی کہتی تھیں مرد کمانے میں محنت کرتا ہے تو عورت کو خرچ میں تدبر اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ عام طور پر مرد، فضول خرچ ہوتے ہیں، میری ساس نے مجھے سکھایا کہ جیسے زکوٰۃ کے لیے اڑھائی فیصد سالانہ کے حساب سے رقم نکالتی ہو، اسی طرح کچھ نہ کچھ رقم پس انداز ضرور کیا کرو...... اور ان کے اس اصول پر عمل کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کبھی کوئی اچانک خرچ آجاتا ہے تو ایوب سے اضافی رقم لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔''

''آپا، آخر دنیاداری بھی کوئی چیز ہے، جہاں دوسرے دس خرچ کررہے ہوتے ہیں، وہاں پانچ تو خرچ کرنے ہی پڑتے ہیں۔'' نفیسہ کو محسوس ہوا وہ ان پر طنز کررہی ہیں۔ سو فوراً بولیں۔

آپا خاموش ہوگئیں۔

''جی بھابی، کیا کیا جائے، نہ جانے معاشرے کو اس نمود و نمائش کے شوق نے کیوں جال میں پھنسا لیا ہے۔ میں تو حیران ہوں، میرا ایک دوست ہے، اس نے قربانی کے لیے ایک قیمتی بیل منگوایا ہے، میں نے اسے کہا، بہتر ہے کہ کسی مفتی سے درست رائے لو لیکن جہاں تک میرا محدود علم ہے، بے شک خوب صورت، قیمتی جانور کی قربانی کرنا سنت ہے، اپنی حیثیت کے مطابق اتنی رقم اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے کہ آپ کو محسوس ہو، آپ کی جیب سے کچھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تک تمہاری نیت پہنچتی ہے، جانور کا گوشت اور خون نہیں۔'' ایوب بھائی بولے۔

''ویسے میں تو کہتا ہوں قربانی صرف جانور کی نہیں، اپنے نفس کی بے جا خواہشات، انا اور خود پرستی کی بھی ہے۔''

''آپ نے افتخار سے جو بات کرنی ہے، وہ کریں تاکہ پھر گھر واپس چلیں۔'' شوہر کی باتیں سن کر آپا نے انہیں یاد دلایا۔

''ایسی کون سی بات ہے؟'' افتخار نے پوچھا تو ایوب بھائی مسکرائے۔

''تمہارے لیے ایک آفر ہے، میں بھی استخارہ کروں گا، تم بھی کرلو تاکہ رہنمائی مل سکے۔ میرے پاس ایک بہت بڑا اور اچھا آرڈر ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ منافع بخش ہوگا۔ تقریباً بیس فیصد کے حساب سے اپنے سرمائے میں شراکت چاہیے۔ میں یہ چاہ رہا تھا کہ تمہارے فلیٹ کی یہ اقساط اگر میں یکمشت ادا کردوں تو ہم یہ فوری فروخت کرسکتے ہیں۔ اور وہ رقم تم میرے ساتھ کاروبار میں شامل کرلو یا اسی طرح فروخت کے لیے پیش کردو۔ اور خریدار خود ہی بقیہ اقساط ادا کرے۔ جو تم مناسب سمجھو، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو اگر نہیں کرنا چاہتے تو ایسا کوئی ضروری بھی نہیں۔''

افتخار سوچ میں پڑ گئے۔ ایوب بھائی ایک کامیاب کاروباری آدمی تھے...... قابلِ بھروسا اور ایمان دار تھے۔ وہ جو پچھلے ایک ماہ سے ہر فرض نماز کے بعد اللہ سے اپنے حالات کے سلسلے میں آسانی کی دعا کررہے تھے تو کیا یہ اس دعا کی وجہ سے تھا کہ ایوب بھائی نے خود سے ایک چلتے ہوئے کاروبار میں شراکت کی دعوت دی تھی۔

''افتخار، تم آرام سے استخارہ کرو...... پھر جواب دینا۔ بظاہر جو چیز ہمیں اچھی لگ رہی ہے اللہ کو خبر ہے کہ وہ بہتر ہے یا نہیں۔'' آپا کی بات پر انہوں نے سر ہلا دیا۔

''ایوب بھائی، آپ کا بہت شکریہ...... انشاء اللہ میں جلد آپ کو جواب دوں گا۔'' افتخار کے سر سے جیسے بوجھ ہٹ گیا۔ استخارے کے نوافل کے لیے وضو کرتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔ ''اللہ تبارک تعالیٰ سے رہنمائی لیتا ہوں...... جو اللہ کو منظور...... اگر کاروبار میں اللہ کی مدد اور برکت رہی تو پھر فلیٹ بک کرواؤں گا یا جس میں بہتری ہوئی، اسباب بن جائیں گے۔'' جا نماز بچھا رہے تھے تو نفیسہ کمرے میں داخل ہوئیں اور کہنے لگیں۔

''اب بہن، بہنوئی کے کہنے سے فلیٹ بیچنے پر آمادہ ہوگئے، میں کہتی تو کبھی نہ مانتے...... بہرحال، اب قسط تو دینی نہیں، انہی پیسوں سے بکرا خرید لیں۔'' افتخار نے نفیسہ کو تاسف سے دیکھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔

''واقعی جب تک اللہ نہ چاہے، کسی پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ اے دلوں کے پلٹنے والے، میرے اور میری بیوی کے دلوں کو دین کے سیدھے سچے راستے پر چلا...... اور نفیسہ کے نفس کو اپنا مطیع بنالے۔'' پھر بہت تحمل سے گویا ہوئے۔

''نہیں، بہن، بہنوئی کے کہنے سے نہیں، اللہ کی رہنمائی سے فیصلہ کروں گا اور نفیسہ، زندگی ہوئی اور اللہ نے توفیق دی تو انشاء اللہ اگلے سال، بکرے کی بھی قربانی کریں گے...... تم میری ایک بات مانو، کیوں نہ تم قرآن حکیم کی تفسیر پڑھنا شروع کردو۔''

نفیسہ نے جواب نہیں دیا تھا لیکن افتخار نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ نفیسہ اور خود کو اسلام کے سچے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے، ایوب بھائی کا جملہ ان کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

''قربانی صرف جانور کی نہیں، اپنے نفس کی، بے جا خواہشات، انا اور خود پرستی کی بھی ہوتی ہے۔''

شوہر کی بات سن کر نفیسہ تمسخر سے مسکرائیں اور ان کی مسکراہٹ کا مطلب افتخار بھی بخوبی سمجھ رہے تھے۔ اسی لیے وہ نفیسہ کو شانوں سے تھام کر بولے۔

''جاؤ نفیسہ تم بھی وضو کرلو۔ تم نے تو شاید عشا کی نماز بھی پڑھنی ہے۔ نماز پڑھ کر استخارے کے دو نفل پڑھ لو۔ اس کتاب میں طریقہ اور دعا لکھی ہے پھر جو تم کہوگی وہی کروں گا۔''

نفیسہ خاموشی سے غسل خانے کی سمت بڑھیں تو افتخار مسکرائے۔

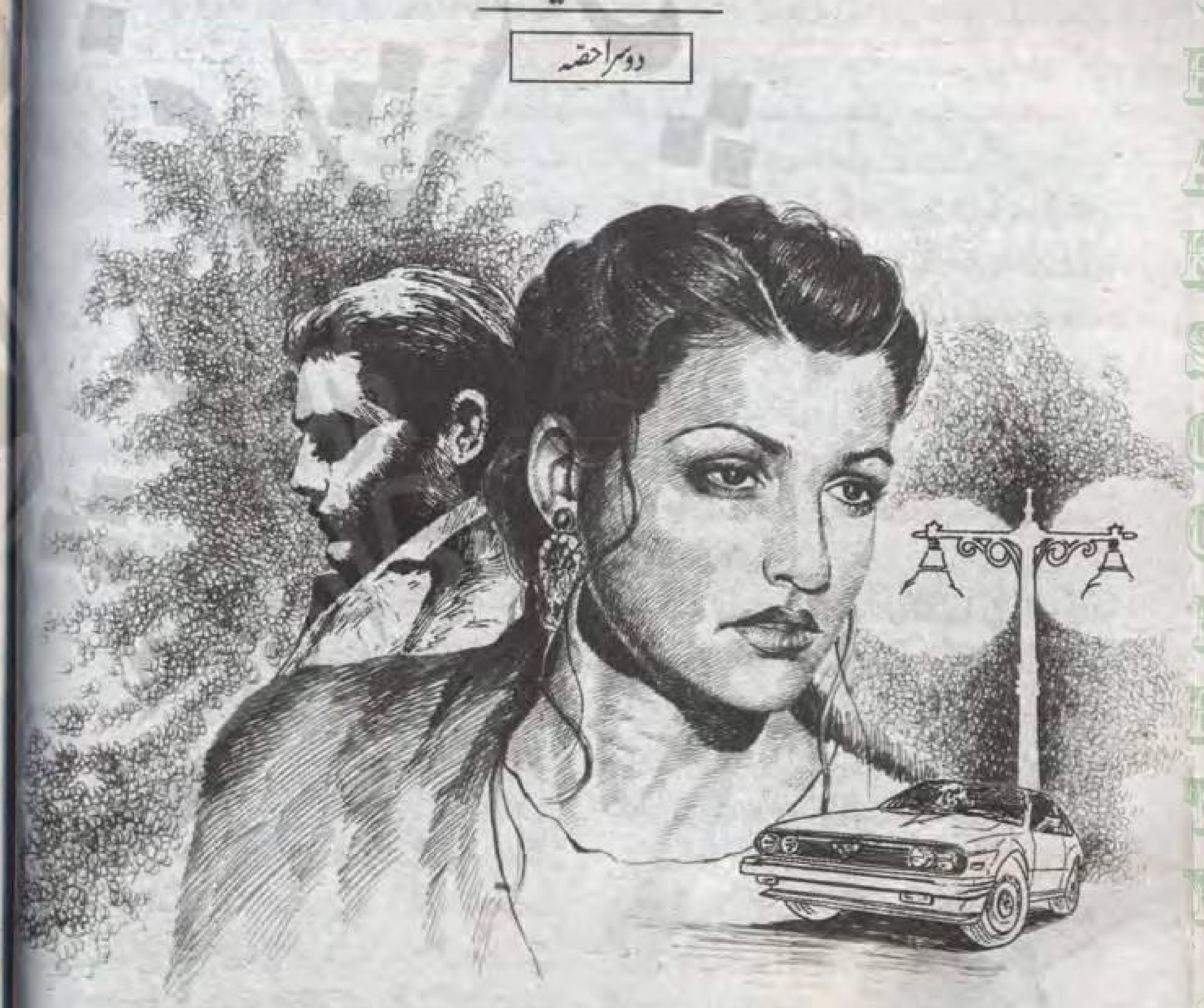
''میرے اللہ! تیری بندی، تیرے حوالے، تو ہی اس کا ہاتھ تھام لے اور میرا بھی۔''



کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

دوسرا حصہ



"ظہیر...... آپ جمال بھائی کو فون کر دیں...... ایمن کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ اسے نیند کا انجکشن دے کر سلایا ہے اور یمنیٰ کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ خدانخواستہ کچھ گڑ بڑ ہوگئی تو سارا الزام ہم پر آئے گا کہ ہم نے انہیں انفارم کیوں نہیں کیا۔" سدیدہ نے اپنے شوہر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... تم کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔ میں تو اسی لیے avoid کر رہا تھا کہ جمال گھبرا کر کوئی

ایموشنل اسٹیپ نہ لے لیں۔ آخر وہ بھی تو بہت اثر و رسوخ والے آدمی ہیں۔'' ظہیر نے پریشانی سے جواب دیا۔

''لیکن...... میرا خیال ہے اب کافی ٹائم گزر چکا ہے۔ مہندی کا فنکشن بھی ہم نے اسی لیے ملتوی کردیا...... سارا دن گزر گیا، اب رات کے بارہ بج رہے ہیں اور یمنیٰ کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ جمال کو ساری بات بتادیں۔'' سدیدہ نے شوہر سے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میرا موبائل پکڑاؤ۔'' ظہیر نے سائڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ذرا طریقے سے بات کیجیے گا۔'' سدیدہ نے انہیں موبائل دیتے ہوئے کہا۔ ظہیر نے جمال کا نمبر ملایا مگر ان کا موبائل آف تھا۔ وہ بار بار نمبر ملاتے رہے مگر جواب ندارد......

''جمال کا موبائل آف ہے۔'' ظہیر نے مایوسی سے موبائل آف کرتے ہوئے کہا۔

''ظہیر...... کیوں ناں ہم پولیس میں رپورٹ لکھوادیں۔ آج کل شہر میں اتنے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ خدانخواستہ کوئی...... اللہ نہ کرے...... میرا تو سوچ کر دل ہی دہل رہا ہے۔ میں نے تو نہ جانے کیا، کیا منتیں مانی ہیں کہ جیسے ہی یمنیٰ ملے گی ساری منتیں پوری کروں گی۔ پرائی امانت ہے، خیر سے اپنے گھر جائے۔'' سدیدہ نے فکرمندی سے کہا۔

''اولاد کو اتنا خود سر بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ماں باپ سمیت دوسروں کو بھی اذیت میں ڈال دے۔ اب نیہا کی مہندی کی رسم کو اس کی خاطر ملتوی کرنا پڑا اور لوگوں کو انفارم کرنا کتنا مشکل ہوگیا تھا۔ یہ صرف اس لڑکی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' ظہیر خفگی سے بولے۔

''ہاں، وہ ایسی ہی ہے...... مگر اب کیا، کیا جاسکتا ہے۔ ایمن خود اس کی وجہ سے بہت اپ سیٹ رہتی ہے۔ کس کو قصوروار ٹھہرائیں۔'' سدیدہ نے بہن کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ نیہا کو یمنیٰ کا آنا ویسے ہی اچھا نہیں لگا تھا اور اب اس کی وجہ سے اس کا فنکشن ملتوی ہوگیا تو اسے رہ رہ کر اس پر غصہ آرہا تھا مگر وہ خاموش تھی کہ نہ جانے اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو، شہیر بھی اسے ہر جگہ تلاش کررہا تھا مگر وہ کہیں بھی نہیں مل رہی تھی۔

☆☆☆

''آپ فکر مت کریں، آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔'' یمنیٰ نے بیڈ پر لیٹے ہوئے شخص کو تسلی دیتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

''آپ...... تو میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئی ہیں۔ آپ اچانک کہاں سے آگئی تھیں اگر آپ مجھے سڑک سے اٹھا کر اسپتال نہیں لاتیں تو میں اب تک مرچکا ہوتا۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اگر میں وہاں نہ ہوتی تو کوئی اور آپ کو اسپتال لے آتا۔'' یمنیٰ نے صاف گوئی سے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''آپ کی ان لڑکوں کے ساتھ کیا دشمنی تھی اور انہوں نے آپ کو کیوں مارا؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، وہ مجھ سے موبائل چھین رہے تھے اور میں انہیں نہیں دے رہا تھا۔ بس انہوں نے مجھے مارنا شروع کردیا۔''

''تو آپ موبائل دے دیتے۔'' یمنیٰ نے کہا۔

''بڑی مشکل سے یہ سیکنڈ ہینڈ موبائل خریدا تھا، وہ بھی بہت ضرورت کے تحت...... کالج میں اپنی کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد میں ٹیوشنز پڑھانے جاتا ہوں اور موبائل پر اسٹوڈنٹس مجھے فون کرکے آنے یا نہ آنے کے بارے میں بتاتے ہیں۔ میں بہت مشکل سے اپنے گھر کا خرچ چلاتا ہوں۔ موبائل میری ضرورت ہے، لگژری نہیں۔ کاش وہ لڑکے اس بات کو سمجھتے...... یہ دیکھیے...... کیا یہ موبائل اس قابل ہے کہ اسے چھینا جائے؟'' اس نے ایک انتہائی پرانا تھکا ہوا موبائل اپنی جیب سے نکال کردکھایا۔

''اوہ گاڈ...... اس کے لیے انہوں نے آپ کو اتنا مارا۔'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری...... آپ کہاں رہتے ہیں؟ آئی مین آپ کے پیرنٹس کو میں انفارم کردوں۔'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''میرے والدین حیات نہیں۔ میرے تین چھوٹے بہن بھائی ہیں جو اسکول جاتے ہیں، آپ انہیں انفارم کردیں۔ پریشان ہورہے ہوں گے لیکن آپ کیوں زحمت اٹھائیں گی۔ کاش میں اٹھ سکتا۔'' اس نے بے بسی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے تمام سر پر پٹیاں تھیں اور ہاتھ پاؤں پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ خدا کا شکر تھا کہ کوئی سیریس قسم کی چوٹ نہیں آئی تھی۔

''آپ فکر نہیں کریں، مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس دیجیے۔ میں ابھی جاکر انہیں انفارم کرکے دوبارہ آپ کے پاس آتی ہوں یا انہیں بھی ساتھ ہی لے آؤں گی۔ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ کا نام؟ سوری...... میں پوچھنا ہی بھول گیا۔''

''یمنیٰ جمال...... میں لاہور سے یہاں اپنی کزن کی شادی اٹینڈ کرنے آئی ہوں اور ڈیفنس میں ان کے ہاں ٹھہری ہوں۔'' یمنیٰ نے بتایا۔

''اور میں محسن رضا ہوں...... بی بی اے کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ یہ ایڈریس نوٹ کرلیں اور میرے بہن بھائیوں کو انفارم کردیں۔ گھر میں فون بھی نہیں...... ورنہ آپ فون کرلیتیں۔ ایک منٹ...... یاد آیا...... میرے موبائل میں میرے ہمسایوں کا نمبر ہے آپ اس پر رنگ کرکے انہیں انفارم کرسکتی ہیں؟'' محسن رضا نے کہا اور یمنیٰ نے اس نمبر پر رنگ کرنے کے لیے اپنا موبائل نکالا تو محسن رضا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جدید ماڈل کا انتہائی خوب صورت اور قیمتی موبائل تھا۔ یمنیٰ نے بار بار نمبر ملایا مگر عدم ادائیگی کی وجہ سے وہ نمبر بند تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔ نمبر آف ہے... اور اب میرے فون کی بیٹری بھی جارہی ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹھی۔ اس کا اے ٹی ایم کارڈ اس کے پاس تھا۔ سو اسے پیسوں کی مشکل نہیں ہوئی۔ اسپتال ڈیوز اس نے کریڈٹ کارڈ سے ادا کیے تھے بہت مشکل سے وہ محسن رضا کے گھر پہنچی۔ انتہائی پسماندہ علاقے میں دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں وہ داخل ہوئی تو غربت کا عالم دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ٹوٹی اینٹوں کا فرش، دیواروں سے سفیدی کے پیٹر نہ جانے کب سے جھڑ جھڑ کر اپنے ہونے کا نشان چھوڑ چکے تھے۔ محسن کی چھوٹی بہن اور دو چھوٹے بھائی صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ یمنیٰ کو دیکھ کر سہم گئے۔

''تم لوگ گھبراؤ نہیں...... تمہارے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے، اگر تم لوگ اسپتال میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو چلو۔'' یمنیٰ نے کہا تو تینوں سہم کر ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں اس کی بات پر یقین نہیں آرہا ہو۔

''مگر آپ کون ہیں اور انہیں کیسے جانتی ہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''میں تو صبح گھر سے واک کرنے نکلی تھی اور راستہ بھول کر دوسری سڑک پر چلی گئی۔ وہاں محسن کا لڑکوں کے ساتھ جھگڑا ہورہا تھا۔ میں نے جوڈو کراٹے سیکھا ہوا ہے۔ میں نے لڑکوں کو مار بھگایا اور ٹیکسی لے کر تمہارے بھائی کو اسپتال لے گئی۔'' یمنیٰ نے بتایا۔

''کیا آپ کو جوڈو کراٹے آتے ہیں؟'' سب سے چھوٹے لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں......'' یمنیٰ نے مسکرا کر بتایا۔

"کیا آپ سب کو مار سکتی ہیں؟" حیرانی سے بڑے لڑکے نے پوچھا۔

"ہاں......"

"کہاں سے سیکھا ہے آپ نے؟" لڑکی نے پوچھا۔ تینوں اپنے بھائی کو بھول چکے تھے اور متجسس ہو کر یمنیٰ سے جوڈو کراٹے کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور وہ بھی انہیں بتاتی جا رہی تھی۔

"اب تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔ تم لوگ اسپتال چلو گے یا نہیں؟" یمنیٰ نے پوچھا تو تینوں پھر خاموش ہو گئے۔

"آخر کیا پرابلم ہے، تم لوگ جواب کیوں نہیں دیتے؟" یمنیٰ نے پھر پوچھا۔

"آپ ہمیں اغوا کرنے تو نہیں آئیں۔ بھائی جان کسی کے بھی ساتھ جانے سے منع کرتے ہیں۔" لڑکی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تمہارا کیا نام ہے......؟" یمنیٰ نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"میرا نام سمیرا...... یہ حسن ہے اور وہ احسن ہے؟" لڑکی نے بھائیوں کے بھی نام بتائے۔

"سنو سمیرا...... کیا تمہیں میری شکل سے لگتا ہے کہ میں بچوں کو اغوا کرنے والی ہوں؟ ڈیئر ایسی بات نہیں تم اپنے بھائی سے فون پر بات کر سکتی ہو۔" یمنیٰ نے محسن کا موبائل نمبر ملایا اور بچوں سے بات کرائی۔ شکر ہے ابھی اس کا فون چارجڈ تھا۔

"ٹھیک ہے...... ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔" سمیرا نے بھائی سے فون پر بات کرنے کے بعد کہا اور وہ بچوں کو ساتھ لے کر اسپتال آگئی۔ راستے میں اس نے بچوں اور محسن کے لیے پھل اور کھانا لیا اور بچوں کو راستے میں آئس کریم کھلائی۔ بچے اس کے ساتھ بہت خوش تھے اور جلد ہی گھل مل گئے۔

"بھائی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" تینوں بہن بھائی محسن کو دیکھ کر اس سے لپٹ کر رونے لگے اور وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ بھی روتا رہا۔

"پلیز یہ رونا دھونا بند کریں۔ کچھ نہیں ہوا۔ زندگی میں تو ایسے واقعات بھی ہو ہی جاتے ہیں۔ چلو پیچھے ہٹو اور اب میں سب کو کھانا نکال کر دیتی ہوں۔"

اس نے بچوں کو پیچھے ہٹایا تو وہ خاموش ہو کر بینچ پر بیٹھ گئے۔ یمنیٰ نے سب کو کھانا نکال کر دیا۔ محسن کے لیے وہ جوس بھی لائی تھی اسے جوس پلایا...... بچے مزے سے چکن تکے، پراٹھا کباب کھاتے رہے۔ ان کی آنکھوں کی چمک سے لگ رہا تھا کہ انہوں نے بہت عرصے بعد ایسا کھانا کھایا تھا اور وہ لحہ بہ لحہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"محسن اب ان بچوں کو گھر چھوڑ کر میں اپنے گھر جاؤں گی۔ رات کافی ہو چکی ہے، سارا دن گزر گیا ہے، میری مما پریشان ہو رہی ہوں گی۔" اس نے کہا۔

"تھینک یو، ویری مچ...... آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ میرے پاس شکریہ کہنے کے لیے الفاظ بھی نہیں۔ کاش میں کچھ......" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ رونے لگا۔

"پلیز! بی اسٹرونگ اینڈ بریو...... آپ اپنے بہن بھائیوں کے لیے جتنی محنت کر رہے ہیں اٹس ریئلی امیزنگ...... میں آپ سے مل کر بہت متاثر ہوئی ہوں۔ معلوم نہیں...... میں آپ سے دوبارہ ملنے آسکوں گی یا نہیں...... لیکن آپ ہمت نہیں ہاریں...... جو دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں اور ان کے لیے کوشش کرتے ہیں انہیں ہمیشہ اسٹرونگ ہونا چاہیے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تھینک یو...... آپ سے مل کر انسانیت پر یقین آگیا ہے۔ جب تک زندہ رہوں گا آپ کے لیے دعا کروں گا۔ کاش زندگی میں کبھی کسی موقع پر میں بھی...... سوری...... شاید میں کوئی بڑا بول بولنے لگا تھا۔ میری اتنی اوقات کہاں......؟ خیر...... بہت شکریہ......" وہ نم آنکھوں سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اسپتال ڈیوز سب ادا کر دیے ہیں اور یہ کچھ پیسے ہیں انہیں رکھ لیجیے...... اور یہ میرا موبائل ہے۔ اسے بھی آپ رکھیں۔ سم میں نے نکال لی ہے۔ آپ چارجر اور نئی سم لے لیجیے گا۔"

وہ سب کچھ اس کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ بچے کاریڈور میں جا چکے تھے۔

"پلیز...... نہیں......" محسن نے اپنا ہاتھ سرہانے رکھے تکیے کی طرف بڑھایا جو اس کے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔

"سوری......" وہ گھبرا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔" یمنیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پلیز...... ایسا مت کریں...... آپ کے مجھ پر پہلے ہی بہت احسانات ہیں...... مزید شرمندہ نہ کریں۔" محسن نے موبائل اور پیسے تکیے کے نیچے سے فوراً نکالنا چاہے تو یمنیٰ کے ہاتھ کے اوپر اس کا ہاتھ آگیا۔ محسن نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اپنی نم آنکھوں کے ساتھ لگایا اور اپنے کپکپاتے گرم لبوں سے اسے چوما۔ یمنیٰ گھبرا گئی اور ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ محبت ہے، عقیدت ہے یا احترام میں نہیں جانتا مگر میرے پاس آپ کو دینے کو سوائے اس احترام کے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں آپ کی محبت کے قابل کہاں......؟ مگر عقیدت کا حق تو دیجیے۔" محسن نے آہ بھرے لہجے میں روتے ہوئے کہا تو یمنیٰ مزید کچھ کہے سنے وہاں سے باہر نکل آئی۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ ایسا لمس اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا اور اس کے اپنے جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے۔ اس نے ٹیکسی لی اور بچوں کو گھر چھوڑنے گئی اور راستے میں سے انہیں بہت سی چیزیں خرید کر دیں پھر انہیں گھر چھوڑنے کے بعد جب وہ خود گھر لوٹی تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ظہیر اور سدیدہ گھبرا کر اس کی طرف لپکے۔

تعریف

"سنا ہے کہ بے وقوف اور غبی مردوں کی بیویاں حسین ہوتی ہیں۔" شوہر نے کتاب پڑھتے پڑھتے اپنی زوجہ سے کہا۔

"آپ بڑے وہ ہیں۔" بیوی نے اٹھلا کر کہا۔ "ہر وقت میری تعریف کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔"

خود پسندی

شوہر نے کہا۔ "سنتے آئے ہیں کہ خوب صورت عورتیں عام طور سے کم عقل ہوتی ہیں، چالاک مرد آسانی سے انہیں بے وقوف بنا لیتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک سنا ہے تم نے!" بیوی نے تیزی سے کہا۔ "میں کم عقل نہیں ہوتی تو کبھی تمہارے پلے سے نہ بندھی ہوتی۔"

مرسلہ: سعدیہ سرفراز، کراچی

"یمنیٰ بیٹا! تم...... تم کہاں تھیں! اور اس وقت......" اس کے بکھرے بال اور تھکاوٹ کے آثار چہرے پر دیکھتے ہوئے سدیدہ بھاگ کر اس کی طرف گئیں اور بے صبری سے پوچھنے لگیں۔

"میں ٹھیک ہوں، مما کہاں ہیں؟" وہ قدرے بے پروائی سے بولی۔

"وہ تمہاری وجہ سے اتنی زیادہ اپ سیٹ تھی کہ اسے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا ہے اور تم کہاں چلی گئی تھیں؟ سب لوگ بہت پریشان تھے۔" سدیدہ نے کہا۔

"ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا......" وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

"کیا...... تمہارا ایکسیڈنٹ......!" ظہیر نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

""میرا نہیں کسی اور کا...... اور میں اسے لے کر اسپتال گئی تھی۔" اس نے بے پروائی سے بتایا۔

""تمہیں معلوم ہے تمہاری اس حرکت کی وجہ سے ہم سب کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ نیہا کی مہندی کی رسم ملتوی کرنا پڑی...... سارا پروگرام ڈسٹرب ہوگیا۔ مہمانوں کو کیسے کیسے انفارم کرنا پڑا۔ تمہیں شاید اس کا اندازہ نہیں۔" ظہیر غصے سے بولے، پاس کھڑی نیہا کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

""فنکشن ملتوی کرنے سے کیا کوئی قیامت آگئی تھی۔ وہاں کسی کی جان مصیبت میں تھی اور ویسے بھی لوگوں نے یہاں فیشن کر کے دوسروں کا مذاق اڑانے آنا تھا۔ اچھا ہی ہوا وہ اسٹوپڈ لوگ نہیں آئے۔" وہ منہ بنا کر بولی تو سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

""یہ تم کیا کہہ رہی ہو، تمہاری وجہ سے ہمارا اتنا نقصان ہوا اور تمہیں رتی برابر پروا نہیں۔" ظہیر بدستور غصے میں تھے۔

""انکل! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں...... آپ میں تو ذرا بھی انسانیت نہیں...... میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ کوئی بہت مصیبت میں تھا اور میں اس کی مدد کر رہی تھی اور آپ کو اپنے نقصان کی فکر ہے۔ سوری میری وجہ سے آپ لوگ پریشان ہوئے...... لیکن اب میں یہاں مزید نہیں رکوں گی۔ میں ابھی ڈیڈی کو فون کرتی ہوں کہ وہ میری سیٹ کنفرم کرائیں۔ میں واپس جا رہی ہوں، یہاں رک کر میں آپ لوگوں کو مزید مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" یمنیٰ نے فوراً فیصلہ کیا تو سب اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

""یمنیٰ بیٹے...... ایسا نہیں کرو، تمہارے انکل کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔" سدیدہ نے جلدی سے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا مگر اس نے انہیں پیچھے ہٹایا اور لینڈ لائن سے نمبر ملانے لگی۔

""ڈیڈی...... میری سیٹ کنفرم کرا دیں...... میں صبح ہی واپس آنا چاہتی ہوں...... ہاں موسم اچھا نہیں ہے، میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں...... رائٹ...... تھینک یو......" اس نے فون بند کیا اور سب حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ ظہیر اور سدیدہ پریشان ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اگر میری ایسی اولاد ہو تو جوتے مار مار کر ٹھیک کر دوں۔" ظہیر نہایت غصے سے دانت کچکچا کر بولے۔

""پلیز...... آپ غصہ نہ کریں...... جمال کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔" سدیدہ نے شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی تو ظہیر نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب جمال تھے۔

""ظہیر بھائی...... یمنیٰ کی سیٹ کنفرم ہوگئی ہے اسے بتا دیجیے گا۔" جمال نے کہا۔

""وہ...... دراصل۔" ظہیر کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

""ظہیر بھائی...... آپ فکر نہ کریں، میں سب سمجھتا ہوں، یقیناً یمنیٰ نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہوگی اور اب وہ ناراض ہو کر وہاں مزید رکنا نہیں چاہتی۔ آپ لوگ بے فکر رہیے۔ میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکوہ شکایت نہیں لیکن میں جب اس سے ناراض ہو کر اس کی بات نہیں مانتا تو اکثر پرابلمز کا شکار ہو جاتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی بات ماننا پڑتی ہے۔" جمال نے وضاحت کی۔

""تھینک یو...... کہ...... تم سچویشن کو سمجھ گئے۔" ظہیر نے قدرے سکون سے کہا۔

""ڈونٹ یو وری...... بس آپ اسے واپس بھیج دیجیے گا۔ خدا حافظ!" جمال نے مسکراتے ہوئے کہا تو ظہیر نے فون رکھ کر سدیدہ کی طرف دیکھا۔

""ایسے عجیب باپ، بیٹی میں نے آج تک نہیں دیکھے۔" ظہیر نے حیرت سے کہا۔

""جمال کیا کہہ رہے تھے؟" سدیدہ نے

پوچھا۔

""یہی کہ وہ اپنی بیٹی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہم سے انہیں کوئی شکایت نہیں...... اور یہ کہ اس کی سیٹ کنفرم ہوگئی ہے۔ صبح اسے واپس بھیج دیں۔" ظہیر نے بتایا۔

""شکر کروں گی میں جب یہ لڑکی واپس جائے گی۔ ورنہ ساری شادی بھر اس نے ٹینشن ہی پھیلائی تھی۔ سچ، ایمن کی ہمت ہے جو اسے سنبھالے ہوئے ہے۔" سدیدہ نے آنکھیں گھماتے ہوئے آہ بھر کر کہا۔

☆☆☆

صبح ایمن جاگیں... تو یمنیٰ واپسی کی تیاری کر رہی تھی۔

""ت...... تم...... کہاں جا رہی ہو؟" ایمن نے اسے پیکنگ کرتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

""واپس...... لاہور......" اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

""مگر...... کیوں......؟ اور کل تم کہاں چلی گئی تھیں؟" ایمن اب غصے سے پوچھنے لگیں۔

""بس...... اب میں یہاں نہیں رکنا چاہتی...... میرا یہاں دل نہیں لگ رہا...... آپ شادی اٹینڈ کر کے آجائیے گا۔" یمنیٰ نے سرسری انداز میں کہا۔

""یمنیٰ...... تم کیا کچھ کرتی ہو، تم نے تو میری جان کو عذاب میں ڈال رکھا ہے۔" ایمن نے غصے سے چلاّتے ہوئے کہا۔

""مما! آپ کیوں fuss کر رہی ہیں۔ میں پہلے ہی اس شادی میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ آپ نے زبردستی کی تھی۔" وہ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

""اور تم نے بھی اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی۔ یہاں آ کر اب واپس جا رہی ہو۔" ایمن نے بھی اس کی غلطی جتائی۔

""ہاں، جا رہی ہوں۔" یمنیٰ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو ایمن اسے صرف گھور کر رہ گئیں...... اور یمنیٰ بیگ لے کر کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

دن کے بارہ بج رہے تھے اور شمیلہ لاؤنج میں مزے سے بیٹھی ناشتا کرنے میں مصروف تھی۔ سلائس پر جیم لگا کر وہ ٹی وی پر میوزک بھی انجوائے کر رہی تھی۔ جبھی ریحانہ قدرے غصے میں کچن سے نکل کر آئیں، آواز آہستہ کی اور شمیلہ سے مخاطب ہوئیں۔

""شمیلہ! یہ تمہاری کیا روٹین ہے؟ بارہ بجے اٹھ کر ناشتا کرنا...... ذرا سا فارغ ہونا تو پینٹنگ کرنے بیٹھ جانا یا پھر میوزک سنتے رہنا۔" ریحانہ نے خفگی سے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

""مما...... آپ کو اعتراض کس بات پر ہے۔ مجھ پر یا میری ایکٹوٹیز پر؟" شمیلہ نے منہ بنا کر کہا۔

""دیکھو بیٹا...... گھر میں سکون رہے تو اس کے لیے گھر کے ہر فرد کو ذمے داریاں نبھانی چاہئیں۔" وہ شمیلہ کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

""کیا کروں میں؟ جو کام کرتی ہوں، نفیسہ بھابی اس میں نقص نکالتی ہیں۔ ان جیسی سگھڑ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جائیں پھر خود کام کریں۔ میں کیوں کروں۔" شمیلہ کافی غصے سے بولی۔

""شمیلہ...... شمیلہ اس طرح گھروں میں گزارے نہیں ہوتے۔ جب سب ایک دوسرے سے مقابلے کے لیے ڈٹ جائیں۔ کیا مطلب! اب تم نے کوئی کام ہی نہیں کرنا۔" ریحانہ غصے سے جھنجلا کر بولیں۔

"ہاں...... تو کیوں کروں؟" شمیلہ بدستور غصے میں تھی۔

""چھوڑ دو اپنی ضدیں...... شادی کے بعد جانے کیا کرو گی۔ اگر آپا کو تمہاری حرکتوں کا پتا چل جائے تو کبھی تمہیں بہو نہ بنائیں۔" ریحانہ بیٹی کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"اچھا تو مجھے بہو بنا کر وہ احسان کر رہی ہیں۔" شمیلہ نے خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

"احسان نہیں تو اور کیا ہے...... ہمارے اور ان کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تو شاید اپنے مرحوم شوہر کی خواہش پوری کر رہی ہیں۔ اللہ بخشے وہ تم سے بہت پیار کرتے تھے... اور بچپن میں ہی تمہیں فہام کے لیے مجھ سے مانگ لیا تھا۔" ریحانہ آہ بھر کر... بہنوئی کو یاد کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"جی نہیں...... وہ مجھے اس لیے بہو بنا رہی ہیں کہ میں فہام کی پسند اور اس کی محبت ہوں۔" شمیلہ قدرے اکڑ کر فخریہ انداز میں کہنے لگی۔

"میرا تو دل چاہتا ہے آپا کو تمہاری ساری حرکتیں بتا دوں۔"

"یہ شوق بھی پورا کر لیں۔" شمیلہ بولی۔

"ماں ہوں، اس لیے چپ ہوں۔" ریحانہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ ہر وقت نصیحتیں...... گلے اور شکوے۔" شمیلہ غصے سے ناشتا چھوڑ کر بولی اور وہاں سے چلی گئی۔

"یا اللہ! اس کو ہدایت دے اور میری آپا کے حال پر رحم فرما۔ نہ جانے یہ لڑکی کیا گل کھلائے گی۔" ریحانہ پریشانی سے دعا کرتے ہوئے بولیں۔

☆☆☆

خدیجہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ریحانہ پاس بیٹھی پریشانی سے ان کی طرف دیکھ کر باتیں کرنے لگیں۔

"آپا! بہت دنوں سے آپ کو دیکھنے کا دل چاہ رہا تھا مگر یہاں آ کر آپ کی اتنی خراب طبیعت دیکھ کر میں تو پریشان ہی ہو گئی ہوں۔" ریحانہ نم آنکھوں سے خدیجہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔

"ارے...... ریحانہ آج کل تو طبیعت ایسی ہی رہتی ہے۔ صبح ٹھیک تو شام کو خراب...... تم پریشان مت ہو...... بس بی پی ہائی ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی......" وہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں۔ ریحانہ اپنی بیٹی شمیلہ کے ساتھ انہیں دیکھنے آئی تھیں۔ ریحانہ نے آتے ہی شمیلہ کو کچن میں بھیج دیا تھا کہ جا کر ردا کا ہاتھ بٹالو۔ شمیلہ ٹرے میں جوس کا گلاس رکھ کر خدیجہ کے لیے لائی۔

"میری جان...... تم نے کیوں تکلیف کی۔" خدیجہ آپا محبت سے اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"خالہ جان! تکلیف کیسی......؟" شمیلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپا...... میں تو چاہتی ہوں، شمیلہ آپ کی بہو بن کر آئے تو آپ کی بہت زیادہ خدمت کرے۔" ریحانہ نے مسکرا کر بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا اور دل ہی دل میں گہری آہ بھری۔

"نہ بھئی...... میں اپنی بہو سے کوئی کام نہیں کراؤں گی۔ میری تو یہ لاڈلی بہو ہو گی۔" خدیجہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔ وہ مسکرانے لگی۔

"سچ بتاؤں...... میں نے شمیلہ اور ردا میں کبھی فرق ہی نہیں سمجھا...... دونوں کو ایک جیسا ہی سمجھتی ہوں۔" انہوں نے محبت سے شمیلہ کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

"آپا! یہی بات سوچ کر تو میں خوش ہوتی ہوں کہ میری بیٹی کسی غیر کے گھر میں نہیں جا رہی...... آپ تو شمیلہ کو مجھ سے بھی بڑھ کر چاہتی ہیں۔" ریحانہ خوش ہو کر بولیں۔

"کیوں نہ چاہوں...... میری بیٹی ہے ہی اتنی اچھی۔" وہ مسکرا کر شمیلہ کی طرف دیکھ کر بولیں تو شمیلہ نے مسکرا کر خالہ کو دیکھا۔

"شمیلہ میں نے تمہارے لیے ایک سوٹ خریدا ہے۔ ٹھہرو میں دکھاتی ہوں۔" وہ بہ مشکل بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولیں مگر ان سے اٹھا نہیں گیا۔

"آپ کیوں اٹھ رہی ہیں خالہ، مجھے بتائیں۔" شمیلہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں بٹھاتے ہوئے کہا۔ خدیجہ اسے وارڈروب کے

بارے میں بتانے لگیں تو وہ اسے کھول کر سوٹ نکالنے لگی۔

"اُف...... خالہ جان اتنا پیارا سوٹ!" وہ انتہائی خوش ہو کر بولی۔

"تمہیں پسند آیا؟" وہ خوش ہو کر پوچھنے لگیں۔

"جی ہاں، بہت زیادہ......" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"جاتے ہی سلوا لینا اور اگلی بار پہن کر آنا۔" خدیجہ آپا نے پیار سے کہا۔

"جی ضرور...... تھینک یو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"بیٹا، ماں کو شکریہ نہیں کہتے۔" وہ مسکرا کر شمیلہ کو چومتے ہوئے بولیں تو شمیلہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

خدیجہ! شمیلہ کو اپنے سب سے بڑے اور چہیتے بیٹے فہام کی دلہن بنانے جا رہی تھیں اور ان کے دل میں شمیلہ کے لیے جتنی محبت اور چاہت تھی شاید شمیلہ اس کا کبھی اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی ......اور ردا بھی اکلوتی نند ہونے کے ناتے اس سے بہت محبت کرتی تھی ایک تو وہ تھی بھی خالہ زاد...... اپنی ہر چھوٹی بڑی بات اس کے ساتھ شیئر کرتی۔ فہام تو اسے چاہتا ہی بہت تھا۔ حاتم اور عاصم کے ساتھ بھی اس کی دوستی تھی۔ اتنی ساری محبتوں کو دیکھ کر ریحانہ کا دل خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ انہیں اپنی بیٹی بہت خوش قسمت لگتی جو خوب صورت محبت کدے میں جا رہی تھی مگر شمیلہ کا مزاج قدرے مختلف تھا۔ وہ اتنی ساری محبتوں کو اپنی خوش قسمتی سے زیادہ اپنی اہلیت اور قابلیت سمجھتی......اس کا خیال تھا کہ اسے جو اتنی محبتیں مل رہی ہیں، وہ ان کی اہل ہے۔ یونہی تو کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا ناں اور اس خیال نے اس کے دل میں قدرے نخوت غرور اور خود غرضی کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ وہ سسرال کی محبتوں کو خاطر میں نہ لاتی۔ اس کی بھابی نفیسہ قدرے تیز طرار عورت تھی اور اپنی تیز فطرت کے باعث اپنے شوہر سلمان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ سلمان شمیلہ کا بڑا بھائی تھا۔ ریحانہ نے جلدی اس کی شادی کر دی تھی، وہ ایک پرائیوٹ فرم میں جاب کرتا تھا۔ پانچ سال شادی کو ہو چکے تھے اور ان کے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ نفیسہ آئے روز بیمار رہتی......اور نند شمیلہ اس کی بیماریوں کو اس کی ایکٹنگ کا نام دیتی تھی جس کے ذریعے اس نے سلمان کو اپنے چکروں میں جکڑ رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نند بھاوج میں نوک جھوک چلتی رہتی اور جب بات سلمان تک پہنچتی تو وہ اپنا غصہ ماں پر نکالتا اور کہتا کہ انہوں نے ہی شمیلہ کو اتنی چھوٹ دے رکھی ہے۔ وہ بیٹی کو ڈانٹتیں تو وہ مزید ہائپر ہو جاتی اور یوں گھر کا ماحول قدرے ناخوشگوار رہتا۔

سلمان ماں کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے والٹ میں سے چند ہزار روپے نکال کر گن کر انہیں دیے۔

"بس اتنے سے پیسے؟" ریحانہ نے گہری سانس لے کر پیسے گنتے ہوئے کہا۔

"ہاں......اس ماہ نفیسہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہی تھی تو اس پر کافی خرچ ہو گیا۔" سلمان منہ بنا کر بولا۔

"لیکن بیٹا! اتنے سے پیسوں میں گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟" ریحانہ پریشانی سے بولیں۔

"مما! میری تنخواہ میں سے جو بچا ہے، وہ میں نے آپ کو دے دیے۔ اب اور کہاں سے لاؤں؟" سلمان خفگی سے بولنے لگا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر گھر کے اخراجات بھی تو بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔" وہ ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولیں۔

"اخرجات بڑھانے سے بڑھتے ہیں۔" سلمان منہ بناتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ریحانہ نے چونک کر کہا۔

"مما! آپ ذرا شمیلہ پر بھی چیک رکھا کریں۔ وہ بھی بہت فضول خرچیاں کرتی ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"لیکن شمیلہ جو کچھ کرتی ہے، باپ کی پنشن سے کرتی ہے تم سے تو اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا۔" ریحانہ انتہائی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اگر وہ اپنی فضولیات پر خرچ نہ کرے تو وہی پیسے گھر میں کام آسکتے ہیں۔ کوئی جاب ہی کر لے۔" سلمان منہ بنا کر بولا تو دودھ کا گلاس لے کر آتی ہوئی شمیلہ، بھائی کی باتیں سن کر چونکی اور فوراً کہنے لگی۔

"آپ کو میری فضولیات کی خبر ہے اور اپنی بیوی کا کچھ پتا نہیں جو آئے دن نت نئے ڈریسز بنواتی رہتی ہیں۔" وہ خفگی سے بھائی کی طرف دیکھ کر لڑنے والے انداز میں بولی۔

"میں......مما سے بات کر رہا ہوں۔" سلمان نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شمیلہ! تم خاموش رہو۔" ریحانہ نے گھبرا کر بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا اور سلمان خفگی سے اسے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

"مما! آپ بھی انہی کا ساتھ دیتی ہیں۔ ان کے سامنے کبھی میرے فیور میں نہیں بولتیں۔" شمیلہ نم آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! عورت کی بادشاہی اس کے شوہر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب وہ نہ رہے تو اس کی حیثیت اس ملازم کی سی ہوتی ہے جس کے پاس اختیار ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی اور وہ وقت اسے ہی خاموشی سے گزارنا ہوتا ہے جیسے میں گزار رہی ہوں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر آہ بھر کر بولیں اور اپنی نم آنکھوں کو صاف کرنے لگیں۔

"مگر میں کیوں ان کی باتیں سنوں؟" شمیلہ نے غصے سے کہا۔

"بیٹا......زیادہ تُو تکار سے گھر کا سکون برباد ہوتا ہے۔ عافیت خاموشی میں ہی ہے۔ بس تم عزت سے اپنے گھر رخصت ہو جاؤ تو میں خدا کا شکر ادا کروں۔" ریحانہ نے آہ بھر کر کہا تو وہ پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ شمیلہ اپنے کمرے میں بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اسی لمحے اس کا موبائل بجنے لگا تو وہ نم آنکھوں سے موبائل کو دیکھنے لگی اور جلدی سے آنسو صاف کر کے اپنے موڈ کو نارمل کرنے لگی۔ دوسری جانب فہام نے قدرے خوشگوار موڈ میں ہیلو کہا تو وہ ایک دم ٹھیک ہو گئی۔

"ارے بھئی...... کہاں گم ہو، اتنی دیر کے بعد فون اٹھایا۔" فہام مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ...... میں واش روم میں تھی۔" شمیلہ گلا کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے بولی۔

"بس تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج ہم سب بیچ پر جا رہے ہیں۔" فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن...... میں" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ فہام اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گا، سمجھیں تم۔ آج ہم خوب انجوائے کریں گے۔" فہام نے مسکرا کر سرگوشی میں کہا تو شمیلہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اب تم تیاری کرو، میں آ کر بیل دوں گا تو گھر سے باہر آ جانا......بی کوئیک...... اوکے۔" فہام جلدی سے بولا۔

"اوکے......" شمیلہ مسکرا کر بولی اور فون بند کر کے اپنی نم آنکھوں کو رگڑتے ہوئے وارڈ روب کی طرف چلی گئی۔

موسم بہت زیادہ خوشگوار ہو رہا تھا۔ ردا، حاتم اور عاصم پانی میں کھیل رہے تھے وہ اپنے ساتھ گیند اور فرزبی لائے تھے جبکہ شمیلہ اور فہام ننگے پاؤں ریت پر چلتے ہوئے خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔ عاصم نے گیند کافی فاصلے پر پھینکی تو ردا کو لینے کے لیے بھیجا۔ اس نے وہاں کچھ لوگوں کو اونٹ کی سواری کرتے دیکھا تو خوشی سے چلّانے لگی۔

"حاتم بھائی میں نے کیمل رائیڈنگ کرنی ہے۔"
"نہیں بھئی...... تم گر گئیں تو فہام بھائی سے میری شامت آجائے گی۔" حاتم منہ بنا کر بولا۔
"عاصم بھائی! پلیز......" اب ردا، عاصم کی طرف دیکھ کر بولی۔
"نہیں بھئی...... پچھلی بار تم گر گئی تھیں پھر مما اور فہام بھائی سے میں نے جتنی ڈانٹ کھائی تھی وہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔" عاصم بڑی صاف گوئی سے بولا۔
"مجھے نہیں پتا...... مجھے تو کیمل رائیڈنگ کرنی ہے۔"
"گڑیا...... تم پچھلی بار بھی گر گئی تھیں۔" فہام نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے ردا سے کہا تو شمیلہ نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔
"اب نہیں گروں گی۔" ردا نے معصومیت سے کہا تو فہام کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔
"اب یہ ایسے نہیں مانے گی...... میں ابھی آیا۔" فہام نے شمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
شمیلہ وہیں کھڑی دونوں کو دیکھنے لگی۔
"چلو......" فہام، ردا سے بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے گیا اور اسے ایک اونٹ پر بٹھا دیا۔ ردا بہت خوش تھی لیکن اونٹ جب چلنے لگا تو وہ چیخیں مارنے لگی۔
"فہام بھائی...... بچائیں......" ردا چلاّتے ہوئے کہہ رہی تو فہام تقریباً اسے پکڑ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ حاتم اور عاصم بھی قہقہے لگانے لگے۔ شمیلہ آہ بھر کر حسرت بھری نظروں سے ردا کو دیکھنے لگی۔
"ردا...... کتنی لکی ہے۔ اس کے بھائی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔" شمیلہ نے نم آنکھوں سے بڑی حسرت سے سوچا"اور میرا بھائی مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔" آہ بھر کر سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ حاتم اور عاصم بھی بھاگتے ہوئے آئے اور اونٹ کے ساتھ چلتے ہوئے ردا اور فہام کا مذاق اڑانے لگے مگر فہام، بہن کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ عاصم اپنا کیمرا نکال کر ان کی تصویریں بنانے لگا اور سب خوب انجوائے کرنے لگے مگر شمیلہ کے چہرے پر حسرت اور اب خفگی کے تاثرات نمایاں ہوئے تھے۔ وہ ردا کو جب بھی بھائیوں کے ساتھ اور خاص طور پر فہام کے ساتھ دیکھتی تو اس کے دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی حسد کے جذبات پیدا ہونے لگتے مگر وہ کسی طرح ظاہر نہ کرتی۔ ردا سے ہمیشہ مسکرا کر ملتی۔ اس کے ناز نخرے اٹھاتی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فہام کی جان ردا میں ہے اور ردا کو ناراض کرنے کا مطلب فہام کو ناراض کرنا تھا اور فہام کی ناراضی وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔
فہام اپنی فیملی کے بارے میں بہت زیادہ کانشئس اور کیئرنگ تھا۔ اس لیے شمیلہ نے کمالِ ہوشیاری سے کبھی اپنے اندر کے جذبات کو ان پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ اس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب فہام پوری طرح اس کے قبضے میں آجائے۔

☆☆☆

محسن رضا ٹھیک ہو کر گھر آیا تو اس کا دل کہیں کھو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی کوئی شے کھو گئی ہو۔ اس کا نہ تو اپنی پڑھائی میں دل لگتا اور نہ ہی بچوں کو پڑھانے کو دل چاہتا۔ وہ بات کسی اور سے کر رہا ہوتا اور ذہن میں یمنیٰ ہوتی۔ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتا تو یمنیٰ کی موجودگی اسے اپنے آس پاس محسوس ہوتی۔ دل ایک ایسے احساس سے دوچار ہو رہا تھا جو تکلیف دہ بھی تھا اور مسرور کن بھی...... جو دل کو خوشی بھی دیتا تھا اور آہیں بن کر تکلیف بھی...... وہ اس کے دیے ہوئے موبائل کو بار بار نکال کر دیکھتا رہتا۔ اسے مضبوطی سے تھام کر یمنیٰ کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتا...... کبھی اسے اپنی بند آنکھوں سے لگاتا تو کبھی دل کے ساتھ...... کبھی کبھی اسے اپنی حرکتیں بے حد عجیب لگتیں۔ وہ خود اپنے آپ کو دیوانہ کہتا...... کبھی بے وقوف اور کبھی پاگل...... جو کچھ بھی تھا وہ اب اپنے آپ کو نارمل نہیں سمجھ رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے یقین نہ آتا کہ اتنے امیر

کبیر خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی اس قدر اچھی اور مخلص بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اس کی سیاہ رنگت کہیں نظر نہ آتی۔ اسے تو اس کی اچھائی اور انسان دوستی سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ ایک خوب صورت یاد بن کر اس کے اندر اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں ٹھہر سی گئی تھی۔ اسے دکھ تھا تو صرف یہی کہ یمنیٰ کا نہ تو کوئی ایڈریس اس نے لیا تھا اور... فون میں موجود کوئی نمبر بھی ایسا نہیں تھا جس پر وہ رابطہ کرتا۔ وہ اسے ملی بھی...... اور کھو بھی گئی۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈے۔ اس کی ذات کے اندر ایک بے قراری سی جنم لے چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں تلاش کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا وہ ہر راہ چلتی گہری سیاہ رنگت والی لڑکی کو ایک دم غور سے دیکھنے لگتا۔ کسی لڑکی کی بات سن کر اسے مڑ کر ضرور دیکھتا...... وہ تو جیسے بہک گیا تھا گویا اس کی قیمتی شے کہیں گم ہو گئی تھی۔ زندگی کی کٹھن راہ پر چلتے چلتے اچانک کوئی شجرِ سایہ دار کی طرح نمودار ہوا اور پھر غائب بھی ہو گیا۔
محسن رضا نے میٹرک کے امتحان دیے تھے اور رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا باپ ٹھیکیدار تھا۔ وہ زیادہ خوشحال تو نہیں تھے مگر گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ اچانک جام شورو میں اس کی خالہ کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس کے ماں، باپ دونوں تعزیت کے لیے وہاں گئے اور...... واپس گھر آتے ہوئے بس کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ دونوں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ محسن رضا سے چھوٹے تین بہن بھائی تھے۔ رشتے میں صرف ایک پھوپی حلیمہ تھیں جو.... حیدرآباد میں رہتی تھیں اور ان کے شوہر عرصہ دراز سے فالج کے مرض کا شکار تھے۔ پھوپی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بس تھوڑی بہت زمین تھی جس کی آمدنی اور اناج سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ محسن اور اس کے بہن بھائیوں کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ سوائے ان کے محلے داروں اور ہمسایوں کے جنہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔ اس کا بہت ساتھ دیا اور آگے پڑھنے کا مشورہ دیا۔ وہ لائق بھی بہت تھا ہر کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا۔ اس کی تعلیمی صورتِ حال کو دیکھ کر ارد گرد کے سب لوگوں نے اسے پڑھائی کے ساتھ ساتھ اچھی نوکری اور ٹیوشنز کا مشورہ دیا اور یوں زندگی کا سفر جاری ہو گیا، اس کے بہن بھائی بھی پڑھائی میں اچھے تھے۔ وہ فارغ وقت میں انہیں پڑھاتا۔ ساتھ والی ہمسائی خالہ صابرہ اس کی بہن سمیرا اور بچوں کا بہت خیال رکھتیں۔ ان کے لیے کھانا پکاتیں جو ممکن ہوتا ان یتیم اور بے آسرا بچوں کے لیے کرتیں۔ رفتہ رفتہ سمیرا نے بھی گھر داری سیکھ لی اور اب وہ اسکول سے آتے ہی بھائیوں کے لیے کھانا بناتی اور ان کی دوسری ضروریات کا خیال رکھتی۔ محسن رضا انتھک محنت کرتا مگر بہن بھائیوں کے لیے بہت کچھ کرنے کی تمنا اسے ہر وقت بے چین رکھتی۔ محسن نے اپنی ذات کو بالکل بھلا دیا تھا۔ نہ کبھی نئے کپڑے اور جوتے خریدتا نہ کبھی دوستوں کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے جاتا۔ زندگی کی کوئی تفریح وہ انجوائے نہ کرتا کہ جو پیسے وہ اپنی ذات پر خرچ کرے گا وہی پیسے اس کے بہن بھائیوں کے کام آئیں گے۔ اس کی سوچ بہن بھائیوں سے شروع ہو کر ان تک ہی ختم ہوتی تھی۔ ساتھ والی خالہ صابرہ کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑی کی منگنی ہو چکی تھی اور منجھلی والی طیبہ بی اے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اچھی شکل صورت کی گھریلو اور سگھڑ لڑکی تھی۔ وہ محسن رضا میں خاص دلچسپی لیتی تھی۔ اکثر اس کے لیے خاص کھانے بنا کر اسے خود دینے آتی۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑوں کو اپنے ہاتھ سے سیتی۔ اس کے کمرے کی صفائی کر جاتی۔ محسن طیبہ کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتا کیونکہ اس کے سر پر جتنی ذمے داریوں کا بوجھ تھا ان کی موجودگی میں تو اس نے اپنی ذات کی بالکل نفی کر دی تھی۔ اس نے کبھی طیبہ سے کوئی بات نہ کی تھی اور طیبہ پھر بھی اس پر مرتی تھی۔ اس کی شرافت کے گن گاتی تھی...... اس

کی خوب صورتی کی مداح تھی۔ وہ چھ فٹ کا لمبا تڑنگا مناسب خدوخال کا مالک تھا۔ اس کی گندمی رنگت سیاہ گھنگر الے بال، خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں غرضیکہ وہ ایک انتہائی خوب صورت اور دلکش شخصیت کا مالک تھا مگر اس کا حلیہ اور کپڑے بہت نارمل اور عام سے ہوتے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کھل کر سامنے نہ آتی۔ کبھی کبھار وہ کوئی نیا سوٹ پہنتا تو بہت خوب صورت لگتا۔ گزشتہ ایک دو ماہ سے طیبہ اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی اور محسن بھی اس بات کو محسوس کرتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا مگر اچانک یمنیٰ سے ملاقات کے بعد اس کے حواسوں پر اور دل و دماغ پر صرف یمنیٰ چھا گئی تھی۔ اس کی متلاشی نگاہیں صرف اسے ڈھونڈتی رہتی تھیں اور اب اس کا دل صرف اسی کے لیے مضطرب رہتا۔ اب طیبہ اسے سامنے کھڑی دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ اس کی موجودگی کو محسوس نہ کر پاتا تھا۔ طیبہ کو بھی جب سے سمیرا، حسن اور احسن کی زبانی یمنیٰ کے بارے میں معلوم ہوا تھا وہ محسن کی بدلی ہوئی سوچ اور نظروں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اسے خود بخود محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اب محسن کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی اور یہی سوچ کر وہ پیچھے ہٹ گئی تھی مگر محسن کی یاد سے دستبرداری اس کے لیے بہت مشکل ہو رہی تھی۔

یہ محبت بھی عجیب روگ ہے ناصر
جس کو بھلایا وہ اکثر یاد آئے

☆☆☆

یمنیٰ کو گاؤں میں ماں جی کے پاس چھوڑ کر جمال احمد خود ولیمے کے روز کراچی چلے گئے۔ نیہا کی شادی کا فنکشن تو وہ اٹینڈ نہیں کر سکے تھے مگر ولیمے پر پہنچنے کا وعدہ انہوں نے ایمن سے کر رکھا تھا۔ ایمن پوری شادی میں جس قدر اپ سیٹ رہی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا بات ہے، ایمن۔ تم بہت ڈسٹرب لگ رہی ہو؟'' جمال نے ایمن کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ کو یمنیٰ نے کچھ نہیں بتایا......؟'' ایمن نے سوال کیا۔

''نہیں......لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اس نے ضرور کوئی گڑبڑ کی ہوگی۔'' جمال نے جواب دیا۔

''صرف گڑبڑ...... جمال اس کی وجہ سے نیہا کی مہندی کا فنکشن ملتوی کرنا پڑا اور ہم سب کو اس نے اس قدر ٹینشن دی کہ مجھے دو روز تک نیند کے انجکشنز دے کر سلا دیا گیا۔ جمال...... یہ سب آپ کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ اس بار تو اس نے حد ہی کر دی ہے۔ اسے کسی کا بھی کوئی خیال نہیں...... اتنے سالوں کے بعد میں کراچی شادی کا فنکشن اٹینڈ کرنے آئی اور اس نے وہ بھی سکون سے مجھے اٹینڈ نہیں کرنے دیا۔ جمال وہ حد سے زیادہ irritate کرنے لگی ہے۔'' ایمن شوہر کو دیکھ کر غصے سے پھٹ پڑیں اور رونا شروع کر دیا۔

''تم ہی بتاؤ...... اب میں اسے کیسے سمجھاؤں؟'' جمال نے بے بسی سے پوچھا۔

''اس نے آپ کو سیٹ کنفرم کرانے کے لیے فون کیا اور آپ نے فوراً کروادی۔ کیا آپ اسے منع نہیں کر سکتے تھے۔'' ایمن نے شکایت کی۔

''نہیں!'' جمال نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... میں بھی نہیں پوچھوں گی کیوں...جو دل چاہے کیجیے۔'' ایمن غصے سے کہہ کر باہر نکل گئیں...اور جمال خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر ایمن کی باتوں پر سوچنے لگے۔ اب وہ ایمن کو کیسے سمجھاتے کہ جب بھی انہوں نے یمنیٰ کی بات نہیں مانی تھی انہیں یا تو خود نقصان اٹھانا پڑا تھا یا پھر کسی نہ کسی اور وجہ سے انہیں ٹینشن اٹھانا پڑتی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی اپنی سوچ ہو مگر کچھ ایسا ضرور ہوتا تھا کہ وہ ڈسٹرب ہو جاتے اور ایمن اس بات کو کبھی نہیں مانتی تھیں۔ وہ جمال کی باتوں کو ان کا وہم کہہ کر ٹال

دیتی تھیں مگر جو کچھ جمال محسوس کرتے تھے۔ ایمن اسے قطعیت سے جھٹلاتی تھیں۔ جمال نے ظہیر اور سدیدہ سے یمنیٰ کی وجہ سے پھیلنے والی ٹینشن کے لیے معذرت کی اور ایک روز ٹھہرنے کے بعد وہ ایمن کے ساتھ واپس آ گئے۔

گھر واپس آ کر انہوں نے یمنیٰ کو فون کیا کہ وہ ڈرائیور کو بھیجیں گے اور وہ اس کے ساتھ گھر واپس آ جائے مگر ماں جی نے بتایا کہ وہ یہاں بہت خوش ہے اور چند روز کے بعد ماں جی کو خود ہی شہر میں بینک میں کام کے سلسلے میں آنا تھا وہ تب اسے ساتھ لیتی آئیں گی۔ جمال ماں جی کا کہا نہیں ٹال سکے اور خاموش ہو گئے۔ ایمن نے اس کی کلاسز مس ہونے پر احتجاج کیا تھا انہیں ماں کی ناراضی کا بتا کر خاموش کر دیا۔

☆☆☆

اتنی بڑی حویلی میں یمنیٰ سارا دن گاؤں کی لڑکیوں اور حویلی کی ملازم لڑکیوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہتی۔ حویلی کے ساتھ ملحقہ باغات کی سیر کے لیے صبح سویرے ہی نکل جاتی اور دوپہر کو واپس لوٹتی۔ گاؤں کی لڑکیاں اس سے بہت متاثر ہوتیں۔ اس کے سامنے سب دبی دبی رہتیں اور اس کی جی حضوری کرتی رہتیں۔ ماں جی بھی اسے کچھ نہ کہتیں کہ وہ زندگی میں پہلی بار ان کے ہاں آ کر ٹھہری تھی ورنہ اس سے قبل وہ ایمن اور جمال کے ساتھ صبح آتی اور شام کو ان کے ساتھ ہی واپس چلی جاتی۔ حویلی میں سرِشام ہی اندھیرا چھا جاتا ماں جی بھی کھانا کھانے کے بعد عشا کی نماز پڑھتیں، تھوڑی دیر واک کرتیں اور سو جاتیں کیونکہ انہیں تہجد کے لیے اٹھنا ہوتا تھا جبکہ یمنیٰ کو اتنی جلدی سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ شہر میں تو آدھی آدھی رات تک جاگتی رہتی کبھی ٹی وی دیکھ رہی ہے تو کبھی میوزک سن رہی ہے اور کچھ نہیں تو سہیلیوں سے فون پر باتیں...... اور اب گاؤں میں آٹھ نو بجے ہی سونے کا رواج تھا مگر اسے نیند کہاں آتی تھی۔ ماں جی نے اپنی ایک خاص ملازمہ بشیراں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ یمنیٰ کے کمرے میں سوئے اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھے۔ بشیراں بڑی نیک، پارسا اور اللہ والی عورت تھی۔ اس کی شادی کے فوراً بعد ہی اس کا شوہر قتل ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک وہ ماں جی کے پاس حویلی میں ہی رہ رہی تھی اور اس کی حیثیت ملازمہ کی نہیں بلکہ گھر کے فرد جیسی تھی۔ بشیراں بڑی صاف دل عورت تھی۔ اللہ سے سچی محبت کرنے والی......اس کی زندگی مصائب اور تکالیف سے پُر تھی مگر اس کی زبان سے کبھی خدا سے شکوے شکایت کے الفاظ نہ نکلتے۔

''اماں......آپ نے کبھی اللہ سے شکوہ نہیں کیا کہ اس نے آپ کے ساتھ یہ سب کیوں کیا...... پہلے ماں، باپ چھینے پھر شوہر چھین لیا بچے بھی نہیں۔ ساری زندگی لوگوں کے گھروں میں محنت کر کے گزاری۔ آپ نے کبھی خواہش نہیں کی کہ آپ کو بھی اللہ نوازتا...... آپ بھی خوش رہتیں...... ماں جی کی جگہ آپ بھی تو حویلی کی مالکن ہو سکتی تھیں ناں......'' یمنیٰ نے ایک رات حیرت سے بشیراں سے جانے کیا سوچ کر کہا۔

''بیٹا جس سے محبت کرتے ہیں اس سے شکایت نہیں کرتے بس اس کی مانتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔'' اماں بشیراں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیوں اماں......؟ یہ کیا بات ہوئی، کیوں خاموش رہیں؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''بیٹا! ابھی تم کم عمر ہو، تم کیا جانو......محبت میں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے، یہ تو ایک آگ ہے جو اس میں جل گیا وہ کندن ہو گیا اور کندن کی قدر سنار جانتا ہے۔ دوسرے کیا جانیں؟'' بشیراں نے مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

''اماں...... مجھے نہیں معلوم آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مگر میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ جب اللہ نے سب انسانوں کو ایک جیسا پیدا کیا ہے تو سب کو

زندگی کی ایک جیسی خوشیاں، نعمتیں اور آسائشیں بھی ملنی چاہئیں۔ جن کو کچھ نہیں ملتا اس میں ان کا کیا قصور ہوتا ہے؟'' یمنیٰ نے کہا۔

''یمنیٰ بیٹا...... تو بھی بڑی بھولی ہے۔ بھلا ڈھانچے ایک جیسے بنانے سے سب انسان کیسے ایک جیسے ہو گئے، سب کی عقلیں اور شکلیں اس نے مختلف بنائی ہیں تو پھر کسی کو فرمانبردار اور کسی کو نافرمان، کسی کو ایماندار تو کسی کو بے ایمان بنایا ہے۔ یہ تو سب دنیا داری کی باتیں ہیں اگر وہ سب کو امیر بنا دیتا تو غریبوں کے دکھ کون سمجھتا۔ سب کو خوب صورت بنا دیتا تو خوب صورتی کی قدر کرنے والا کون ہوتا؟ بیٹا وہ بادشاہ جو اتنی بڑی دنیا کا کارخانہ چلا رہا ہے اس کی عقل ہم سب سے بڑھ کر ہے اور ویسے بھی اسے ہمارے کپڑوں، حلیوں اور شکلوں کی پروا نہیں۔ اسے تو ہمارے دل چاہئیں پاک، صاف، دھلے ہوئے۔ ایمان کی دولت سے بھرے ہوئے دل۔'' بشیراں نے بڑی گہری باتیں کیں تو یمنیٰ اسے بس دیکھے گئی پھر کچھ دیر بعد بولی۔

''بھئی پاک و صاف دُھلے ہوئے دل، کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟'' یمنیٰ نے پوچھا۔

''جھلیے تو سمجھتی ہوگی...... واشنگ مشین میں دُھلے ہوئے...... نہیں، نہیں...... ایسے دل جن میں نہ حسد ہو، نہ کینہ...... نہ کوئی دشمنی ہو بس محبت ہی محبت ہو...... سب کے لیے۔'' بشیراں نے اسے سمجھایا۔

''اماں...... سب کے لیے محبت کیسے ایک دل میں جمع ہو سکتی ہے۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔'' یمنیٰ نے حیرت سے کہا۔

''وہ کہتے ہیں ناں......

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ھُو

دل...... دریا اور سمندروں سے بھی زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر کیا، کیا ہوتا ہے۔ کتنے راز چھپے ہوتے ہیں، کسی کو خبر نہیں ہو سکتی اور تو بھی تو بہت سے لوگوں سے محبت کرتی ہے...... جمال بیٹے سے، بہو رانی اور ماں جی...... اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ جو تمہارے دل کو بھلے لگتے ہوں گے پھر جیسے جیسے تو آگے بڑھے گی اور بہت سے لوگ تیرے دل میں سماتے جائیں گے اور پھر ان سب میں سے کوئی ایک تیرے دل کو سب سے زیادہ اچھا لگے گا، اس کی برائیاں بھی تجھے خوبیاں لگیں گی اور اس کے لیے تو اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جائے گی۔ اس کے بدلے میں تجھے ساری دنیا کی نعمتیں بھی دی جائیں تو تو پھر بھی انہیں نہیں لے گی۔ تجھے تو صرف وہی چاہیے ہوگا جسے تیرا دل سب سے زیادہ محبت کرتا ہوگا۔ جس پر تو سب سے زیادہ اعتبار کرتی ہوگی۔ اس لیے بیٹا...... محبت میں بڑا پھیلاؤ ہے۔ یہ ایک ایسا تھیلا ہے جس کے اندر جس جس کو ڈالتی جاؤ گی یہ اسے سمیٹتا جائے گا۔'' بشیراں نے بڑے مدبرانہ انداز میں اسے سمجھایا۔

''اماں...... کیا آپ کی زندگی میں بھی کوئی ایک ایسا آیا جو آپ کے دل کو سب سے زیادہ اچھا لگا؟'' یمنیٰ نے مسکرا کر شرارتی انداز میں پوچھا۔

''ہاں، عبدالغفور سب سے زیادہ اچھا لگا...... مگر وہ بہشتی تو شادی کے چوتھے دن قتل ہو گیا...... ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ میں اس سے سارا دن باتیں کرتی رہتی ہوں اور وہ خاموشی سے سنتا رہتا ہے۔ بیٹا...... وہ مرا نہیں بلکہ ایک یاد بن کر میرے دل میں ٹھہر گیا ہے۔'' بشیراں نے نم آنکھوں سے کہا۔

''اماں، آپ ان کے مرنے پر بہت روئی ہوں گی۔ اللہ سے بہت شکوہ کرتی ہوں گی کہ اس نے اتنی جلدی آپ سے آپ کی محبت چھین لی۔ اماں ویسے آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی تھی۔'' یمنیٰ نے کچھ کنفیوز ہو کر کہا۔

''ہاں! پہلے میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ بہت روتی تھی، رب سے اٹھتے بیٹھتے بہت شکوے کرتی تھی کہ تو

نے تو میرے ہاتھوں کی مہندی اترنے سے پہلے ہی میرا سہاگ چھین لیا۔ ساری دنیا زہر لگتی تھی اور ہر شے بری...... دل چاہتا تھا کہ میں بھی مر جاؤں...... پھر ایک رات اس نے مجھے سمجھایا کہ تو کس کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے۔ تجھے تو میں نے اپنے لیے پیدا کیا ہے۔ تجھے تو مجھ سے محبت کرنی چاہیے اور تو کسی اور سے محبت میں پاگل ہو رہی ہے۔ تیری تنہائیوں کا ساتھی تو میں ہوں...... اور تو کسی اور کو ڈھونڈتی ہے۔ تیری سرگوشیوں کو میں سنتا ہوں اور تو اسے پکارتی ہے، وہ تو دنیا میں تیرا ساتھی تھا اور تیرا میرا ساتھ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ بیٹا، پھر میں بہت روئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بھٹک گئی تھی۔ کہیں کھو گئی تھی۔ وہ مجھے واپس لایا...... پھر اپنی محبت کے درشن کرائے اور پوچھنے لگا'' بتا...... بشیراں اب تو کسے زیادہ چاہتی ہے۔ غفور کو کہ عبدالغفور کو'' اور پھر میں اس کے آگے جھک گئی۔ بہت روئی...... بہت زیادہ میں نے کہا صرف غفور کو پھر وہ بولا۔ ''پھر کاہے کو روتی ہے پگلی جس کو میں مل گیا...... اسے اور کیا چاہیے؟'' بس اس رات کے بعد میں نے اس سے شکوے کرنا چھوڑ دیے...... اور اسے اپنا ہم راز بنا لیا۔ اس سے دوستی کر لی اس پر ایمان لے آئی۔'' بشیراں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسا ایمان......؟ کیا آپ پہلے مسلمان نہیں تھیں؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''جھلیے...... کلمے والا ایمان نہیں...... دل والا ''ایمان۔'' کلمہ تو سارے مسلمان پڑھتے ہیں...... پر دل والا ''ایمان'' کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ صرف ان کو جن سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔'' بشیراں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب......؟ میں سمجھی نہیں......'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''جب ساری دنیا بے اعتبار لگے...... اور صرف ربّ پر دل سچا اور پکا اعتبار کر لے جب...

مصیبت میں بہت لوگ مدد کو آئیں مگر دل اس کے علاوہ کسی اور کی مدد قبول نہ کرے تو یہ دل والا ایمان ہوتا ہے... جو نبیوں، پیغمبروں، ولیوں اور اللہ سے محبت کرنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم عام انسان بھی اس کے مقرب بن جاتے ہیں مگر اس کے لیے بہت محنت چاہیے ریاضت چاہیے خلوص چاہیے جیسے دنیاوی رشتوں میں محبت یا چاہت...... خلوص اور وفا مانگتی ہے، قربانی مانگتی ہے۔ جب کوئی اپنے رب پر سچا ایمان لے آتا ہے تو پھر ایسے ایمان والوں کو سرِعام سولی پر چڑھا دیا جائے یا آگ میں ڈال دیا جائے وہ مطمئن رہتا ہے۔ کسی سے شکوہ نہیں کرتا مگر یہ کسی، کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم کہاں اس قابل؟'' بشیراں نے کہا تو یمنیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مگر...... اماں...... آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ اس پر دل سے ایمان لے آئیں اور اب کہہ رہی ہیں میں اس قابل کہاں؟'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''تو بھی بڑی بھولی ہے۔ بندہ صرف دعویٰ کرتا ہے...... قبول تو وہ کرتا ہے...... معلوم نہیں...... اس نے میرے ایمان کو قبول بھی کیا ہے یا نہیں......'' بشیراں آہ بھر کر بولی۔

''اماں...... ضرور کیا ہوگا...... آپ فکر نہ کریں۔'' یمنیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو کہتی ہے تو مان لیتی ہوں۔'' بشیراں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اماں...... ایک بات تو بتائیں۔ جب اس نے انسان کے دل کو اپنی محبت کے لیے بنایا ہے تو پھر اس میں کسی اور کی اتنی محبت کیوں ڈالتا ہے... جسے انسان سب سے زیادہ چاہنے لگتا ہے اور پھر اسے خود ہی چھین لیتا ہے، یہ کتنا عجیب سا گورکھ دھندا ہے۔ انسان تو تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔'' یمنیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''سن اگر تو گاؤں نہ آتی...... تو تجھے کیسے معلوم

ہوتا کہ یہاں تجھے کون، کون چاہتا ہے اور کتنی محبت کرتا ہے...... اس طرح وہ پہلے بندے کے دل کو بندوں کی محبت کے درشن کراتا ہے۔ اگر وہ بندے کے خالی دل کو سیدھا سیدھا اپنی محبت سے بھر دے تو وہ دل کسی اور کی محبت کو کبھی محسوس نہ کرے۔ پہلے وہ بندے کے دل کو بہت سی محبتوں کی پہچان کراتا ہے مثلاً بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو پہلی آنکھ ہی وہ محبت کی گود میں کھولتا ہے پھر ماں، باپ اور بہن بھائیوں کا محبت سے اسے چھونا۔ اسے پیار کرنا پھر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ محبت کی شکلیں بدلتی جاتی ہیں مگر محبت کا وجود اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ جب بندے کا دل بہت سی محبتوں سے پُر ہو جاتا ہے تو پھر رب کریم پوچھتا ہے 'اے بندے اب تو کس سے زیادہ محبت کرتا ہے' اور جب بندہ اس کی محبت کا اقرار کرتا ہے تو پھر کہتا ہے 'ٹھیک ہے پھر امتحان کے لیے تیار ہو جا۔'' بشیراں کسی بزرگ کی طرح جذب کے عالم میں اسے بتا رہی تھی۔

''پر کیسا امتحان......؟'' یمنیٰ نے چونک کر پوچھا۔

''جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے اور اس کا محبوب پہلا سوال پوچھتا ہے۔ ''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' جانتی ہو وہ کیا جواب دیتا ہے۔ کہتا ہے میں تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا زمین پر نہر کھود ڈالوں گا۔ پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردوں گا...... اور رب کیا کرتا ہے! رب محبتوں کی آزمائش کرتا ہے۔ انسان جس جس شے سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی سے اسے آزماتا ہے اور جب انسان اس امتحان میں پورا اترتا ہے تو پھر اسے اپنی سچی اور سچل محبت سے نوازتا ہے۔ بیٹا وہ بڑا سخت امتحان لیتا ہے۔ یہ تو وہی جانے اور اس سے محبت کرنے والے جانیں۔ محبت کی باتیں...... محبت کے رنگ محبت کے دکھ بڑے نرالے ہوتے ہیں۔'' بشیراں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اماں کیا محبت یوں بھی ہوتی ہے؟'' یمنیٰ نے بشیراں کی باتیں سن کر نہایت حیرت سے پوچھا۔

''ہاں اصل محبت تو یہی ہے بلکہ حقیقی محبت...... ہم، تم انسان تو محبت کا کچھ اور مطلب لیتے ہیں...... مگر اس کے نزدیک محبت کچھ اور ہے۔'' بشیراں نے کہا۔

''کچھ اور......؟ کیا مطلب...... اماں آپ بہت مشکل باتیں کرتی ہیں۔'' یمنیٰ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا مشکل بات نہیں، سیدھی سی بات ہے اس کے نزدیک محبت ختم ہو جانے کا نام ہے۔'' بشیراں نے کہا۔

''یعنی فنا...... مطلب...... مرجانا......'' یمنیٰ نے چونک کر پوچھا۔

''ارے...... نہیں...... اپنی ذات، اپنی خواہشوں، خوشیوں، چاہتوں اور ضرورتوں کو کسی دوسرے کے لیے قربان کر دینا ہے...... اپنے لیے نہیں...... کسی دوسرے کے لیے بھی نہیں...... بلکہ صرف اپنے رب کے لیے اس کی محبت حاصل کرنے لیے...... وہ انسان سے ایسی ہی محبت چاہتا ہے......'' بشیراں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اماں...... آپ تو پڑھی لکھی نہیں...... پھر اتنی مشکل باتیں کہاں سے سیکھیں؟'' یمنیٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

''بیٹا...... ایسی باتوں کے لیے کتابیں ضروری نہیں...... اس سے محبت کرنے والے دل ہی کافی ہوتے ہیں۔ ویسے میں گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب کی بیوی آپا جنتے کے پاس درس لینے جاتی تھی۔ وہ بڑی پڑھی لکھی اور اللہ والی عورت تھیں۔ ان سے یہ علم لیا پھر میری مالکن بھی تو بہت اللہ والی ہے۔'' بشیراں نے اچانک یمنیٰ کی طرف دیکھا وہ سو چکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسے چادر اوڑھا دی اور خود تہجد کی نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئی۔

☆☆☆

توقیر آفس سے لوٹا تھا اور قدرے تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ نجمہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھی کسی سے موبائل پر باتیں کرنے میں مصروف تھیں، بات ختم کر کے انہوں نے چونک کر توقیر کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے بیٹا...... بہت تھکے ہوئے اور اداس لگ رہے ہو؟" نجمہ نے محبت سے پوچھا۔

"بس...... یونہی۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اس اداسی کی وجہ کیا ہے، مجھے کچھ تو بتاؤ؟" نجمہ نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں امی......!" اس نے ایک لمبی آہ بھری۔

"توقیر...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں...... تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں؟" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"کون سی بات......؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ......اب وقت آگیا ہے......تم شادی کرلو، تمہاری اچھی جاب لگ گئی ہے۔ ہمارے پاس اچھا گھر ہے اور ہر نعمت موجود ہے پھر کس بات کی کمی ہے جو تم شادی سے انکار کر رہے ہو؟" نجمہ نے پوچھا۔

"بس انتظار کر رہا ہوں۔" توقیر نے آہ بھرے لہجے میں کہا۔

"کس کا انتظار......؟"

"ایک بات کا......" توقیر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ کاریڈور میں رکھا فون بجا تو نجمہ اٹھ کر فون سننے چلی گئیں۔ توقیر نے اپنا موبائل نکال کر ردا کے نمبر پر کال کی مگر اس نے کال اٹینڈ نہ کی۔ توقیر کو ٹینشن ہونے لگی کہ ردا نے کال کیوں نہیں اٹینڈ کی۔

"ہوسکتا ہے وہ بزی ہو۔" اس نے سوچا پھر اس

کی نظر ٹیبل پر پڑے رشنا کے موبائل پر پڑ گئی اور اس نے جلدی سے میسج لکھ کر اسے سینڈ کر دیا اور فوراً ہی میسج ڈیلیٹ بھی کر دیا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

ردا کا موبائل سائڈ ٹیبل پر پڑا تھا اور وہ واش روم میں تھی۔ حاتم کسی کام سے آوازیں دیتا ہوا اس کے کمرے میں آیا اور وہیں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس کو آواز دینے لگا۔

"ردا کہاں ہو بھئی؟" اسے واش روم سے پانی گرنے کی آواز آئی وہ اس جانب دیکھ کر باہر جانے لگا کہ ردا کے موبائل پر میسج ٹون آئی تو حاتم نے جھک کر اس کے موبائل اسکرین کی طرف نظر کی اس نے چیک کیا تو رشنا کے نمبر سے میسج تھا اس نے ضروری میسج سمجھ کر اسے پڑھا۔

"I just want to know do you love me or not?" حاتم نے میسج کو پڑھا اور بری طرح چونکا۔

"رشنا کے موبائل سے یہ میسج...... رشنا کو ایسے میسج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں ردا نے رشنا کے نام سے کوئی اور نمبر تو سیو نہیں کیا۔ ہاں ممکن ہے۔" حاتم حیرت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بڑبڑایا اور اپنا موبائل نکال کر رشنا کا نمبر سیو کرنے لگا اور ردا کے موبائل سے میسج ڈیلیٹ کر کے کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆

حاتم اپنے کمرے میں کافی پریشانی میں چکر لگا رہا تھا۔ اس کا موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ مشکوک ہو کر سوچ رہا تھا۔ "مجھے ایک بار کنفرم کرنا چاہیے کہ کیا یہ نمبر رشنا کا ہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ردا کسی لڑکے...... اور وہ ہمیں بتانا نہیں چاہ رہی ہو...... ہاں مجھے رشنا کو فون کرنا چاہیے۔" حاتم نے پریشانی سے سوچا اور فوراً نمبر ملانے لگا مگر فوراً ہی رک گیا۔

"نہیں...... نہیں مجھے دوسرے نمبر سے فون کرنا چاہیے...... جس کا ردا کو بھی علم نہیں ہو۔"

"ہیلو...... جی...... کون؟" رشنا نے پوچھا۔

"مس کیا، یہ آپ کا نمبر ہے؟" حاتم نے گلا کھنکھار کر کہا۔

"جی، یہ میرا ہی نمبر ہے۔" رشنا نے جواب دیا۔

"اسے کوئی اور تو استعمال نہیں کرتا۔" حاتم نے پوچھا۔

"نہیں...... اٹس مائی پرسنل نمبر...... آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" رشنا حیرت سے بولی۔

"اپنے فرینڈ "احمد" سے...... آئی تھنک یہ اس کا نمبر نہیں۔" حاتم نے ایک دم بوکھلا کر کہا۔

"آف کورس...... یہ کسی اور کا نہیں، میرا ہی نمبر ہے۔" رشنا نے کہا اور موبائل آف کر دیا۔

"اگر یہ رشنا کا ہی نمبر ہے تو اسے محبت کی یقین دہانی کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی ضرورت صرف لڑکوں کو ہی ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو نہیں...... مجھے اس سے پوچھنا چاہیے۔" حاتم نے سوچا اور پھر رشنا کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ایک بیل گئی۔ "اب میں رشنا سے کیا پوچھوں؟" حاتم نے سوچا پھر کال ڈراپ کر دی اور رشنا کی کال اس کے موبائل پر آنے لگی۔ وہ موبائل ہاتھ میں پکڑ کر پریشانی سے دیکھنے لگا اور قدرے توقف کے بعد اس سے بات کرنے کے لیے بہ مشکل ہیلو کہا۔

"مسٹر...... پہلی دفعہ تو رانگ کال تھی...... دوبارہ کال کرنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی؟" رشنا نے خفگی سے پوچھا۔

"وہ...... ایکچوئیلی......" حاتم بہانہ گھڑنے لگا۔

"سنیے...... یہ lame excuses کسی اور کو دیجیے گا...... آپ کی زبان آپ کا ساتھ نہیں دے رہی۔ بہتر یہی ہے کہ دوبارہ کال نہ کریں۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھے آپ۔" رشنا نے ڈانٹا تو حاتم شرمندگی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

☆☆☆

توقیر اپنے کمرے میں کافی پریشان کھڑکی کے

پاس کھڑا باہر اندھیرے میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور سگریٹ کے گہرے کش لگاتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھا۔

"میں نے رشنا کے موبائل سے ردا کو میسج کر کے کوئی غلطی تو نہیں کی اگر ردا نے رشنا کو وہ میسج دکھا دیا تو......؟ مجھے اس وقت کیوں یہ خیال نہیں آیا...... شاید میں ایموشنل ہو گیا تھا وہ میری کال نہیں لے رہی تھی تو میں نے میسج کر دیا۔" توقیر نے پریشانی سے سوچا۔

"آئی ایم شیور...... وہ رشنا کو نہیں بتائے گی۔ اس نے پہلے بھی تو لیٹرز کا اس سے ذکر نہیں کیا۔" توقیر نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کرتے ہوئے سوچا۔

"لیکن اس کے اس attitude کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی وہ کھل کر اظہار نہیں کرتی۔ اب کیسے پوچھوں...... وہ کچھ بتائے تو سہی......" توقیر نے پریشانی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ دن کافی چڑھ چکا تھا۔

رشنا اپنے کمرے میں بیڈ پر بڑے آرام سے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا موبائل بجنے لگا تو اس نے بغیر دیکھے غصے سے کال ریجیکٹ کر دی۔

"ایک تو فراز کو چین نہیں...... رات کو سونے سے پہلے بھی اس سے بات کرو اور صبح اٹھ کر بھی......" رشنا نے منہ بنا کر سوچا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی تو پھر سے کال آنے لگی۔

"ہیلو......" رشنا نے غصے سے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم ابھی تک سو رہی ہو؟" ردا نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

"ردا...... تم...... اوہ...... یار میں بالکل بھول گئی کہ آج ہم دونوں کو شادی کی شاپنگ کے لیے جانا ہے۔" رشنا نے ایک دم چونک کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم بھی بہت اسٹوپڈ ہو۔" ردا خفگی سے بولی۔

"تم اس وقت ہو کہاں؟" رشنا نے پوچھا۔

"پانچ منٹ تک تمہارے گھر کے باہر ہوں گی۔ اب جلدی سے تیار ہو کر باہر آ جاؤ۔" ردا دھمکی کے انداز میں بولی۔

"اوکے...... اوکے...... میں بس آ رہی ہوں۔" رشنا جلدی سے بولی اور موبائل آف کر کے واش روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

ردا گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے رشنا کے گھر پہنچی اور گیٹ سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر باہر نکل کر کھڑی ہو گئی، توقیر اپنی گاڑی میں گیٹ سے باہر نکلا تو ردا کو گاڑی کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ انتہائی خوش ہوا اور اپنی گاڑی سے باہر نکل کر جلدی سے اس کے پاس آیا اور بڑی خوش اخلاقی سے بولا۔

"ارے آپ......؟"

"میں رشنا کو پک کرنے آئی ہوں۔" ردا نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

"آپ کیسی ہیں؟" توقیر نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟" ردا نے بے رخی سے پوچھا۔

"ردا...... کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟" توقیر نے یک دم چونک کر گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"جو چھچھوری حرکتیں آپ کر رہے ہیں۔ ان پر خفا ہی ہوا جاتا ہے۔" ردا خفگی سے بولی۔

"میں نے تو ایسی کوئی غلط بات آپ سے نہیں کی...... مجھے آپ اچھی لگیں اور میں نے آپ تک اپنی فیلنگز پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کیا برائی ہے؟" توقیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں۔" ردا نے غصے سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا...... میری محبت؟" توقیر نے یک دم چونک کر کہا۔

"کیا...... محبت...... محبت کی رٹ لگا رکھی ہے۔ نہیں ہے مجھے آپ سے کوئی محبت......" ردا نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو توقیر کا منہ کھلا کا کھلا رہ

گیا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”میرے دل میں آپ کے لیے کوئی فیلنگز ہیں اور نہ ہی محبت...... آئندہ مجھ سے اس ٹاپک پر بات کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔“ ردا ٹھوس لہجے میں کہہ کر جانے لگی تو توقیر ہکا بکا اسے نم آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں رشنا بیگ لٹکائے گیٹ سے باہر آچکی تھی۔

”چلو...... میں تیار ہوں...... آئی ایم سوری یار...... تمہیں ویٹ کرنا پڑا۔“ رشنا نے ردا کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ردا خاموشی سے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی اور توقیر دونوں کو دیکھ کر جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

وہ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ رشنا اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ رشنا کافی خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی جبکہ ردا چہرے سے بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ اس نے گاگلز لگا رکھی تھی اور وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔

”میں نے تو ایسی کوئی غلط بات آپ سے نہیں کی، میرے دل کو آپ اچھی لگیں تو......“ اس کے کانوں میں توقیر کے الفاظ گونج رہے تھے۔

”یار یہ محبت بھی کیا عجیب شے ہے۔ اچھے بھلے انسان کو بالکل ہی دیوانہ بنا دیتی ہے، وہ ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہے کہ ہنسی آتی ہے۔“ رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب...... تم کس کی بات کر رہی ہو؟“ ردا نے بری طرح بوکھلا کر کہا۔

”فراز کی اور کس کی، رات کو میں اس سے کسی بات پر ناراض ہوئی تو نہ جانے کتنی منتیں اور واسطے دے کر معافیاں مانگنے لگا۔“ رشنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آئی سی......!“ ردا گہری سانس لے کر بولی اور اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔

”یار ردا...... تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی؟“ رشنا نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں...... اور تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ ردا بوکھلا کر بولی۔

”پہلے مجھے فراز سے خوف آتا تھا اور بالکل اچھا نہیں لگتا تھا مگر اب یوں لگتا ہے جیسے میری دنیا کا محور ہی فراز ہو اب سب کچھ وہی لگتا ہے۔“ رشنا نے مسکرا کر جواب دیا۔

”ریئلی...... فراز کی محبت نے تو واقعی تمہیں بہت بدل دیا ہے۔“ ردا نے ایک دم چونک کر کہا۔

”محبت یونہی بدل دیتی ہے، میں تو کہتی ہوں تم بھی فوراً کسی سے محبت کر لو پھر دیکھنا دن میں چاند ستارے دکھائی دیں گے۔“ رشنا نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں بھئی...... میں اتنی طوفانی محبت نہیں کر سکتی......“ ردا زبردستی مسکرا کر بولی۔

”جب تم محبت کرو گی پھر مجھے بتانا، انسان کو پتا ہی نہیں چلتا۔ وہ کیا کچھ کر گزرتا ہے۔“ رشنا مسکرا کر بولی۔

”یار...... اب ڈراؤ مت......“ ردا مسکرا کر بولی۔

”ڈرا نہیں، بتا رہی ہوں اور سمجھا بھی رہی ہوں۔“ رشنا ہنستے ہوئے بولی۔

”کیا......؟“ ردا نے چونک کر پوچھا۔

”یار...... ایک بات پوچھوں...... میرے توقیر بھائی تمہیں کیسے لگتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ تمہیں پسند کرتے ہیں؟“ رشنا نے اس کی طرف بغور دیکھ کر پوچھا۔

”تم نے مجھے بھابی نہیں بنایا مگر میں تمہیں بنا سکتی ہوں۔“ رشنا قہقہہ لگا کر بولی۔

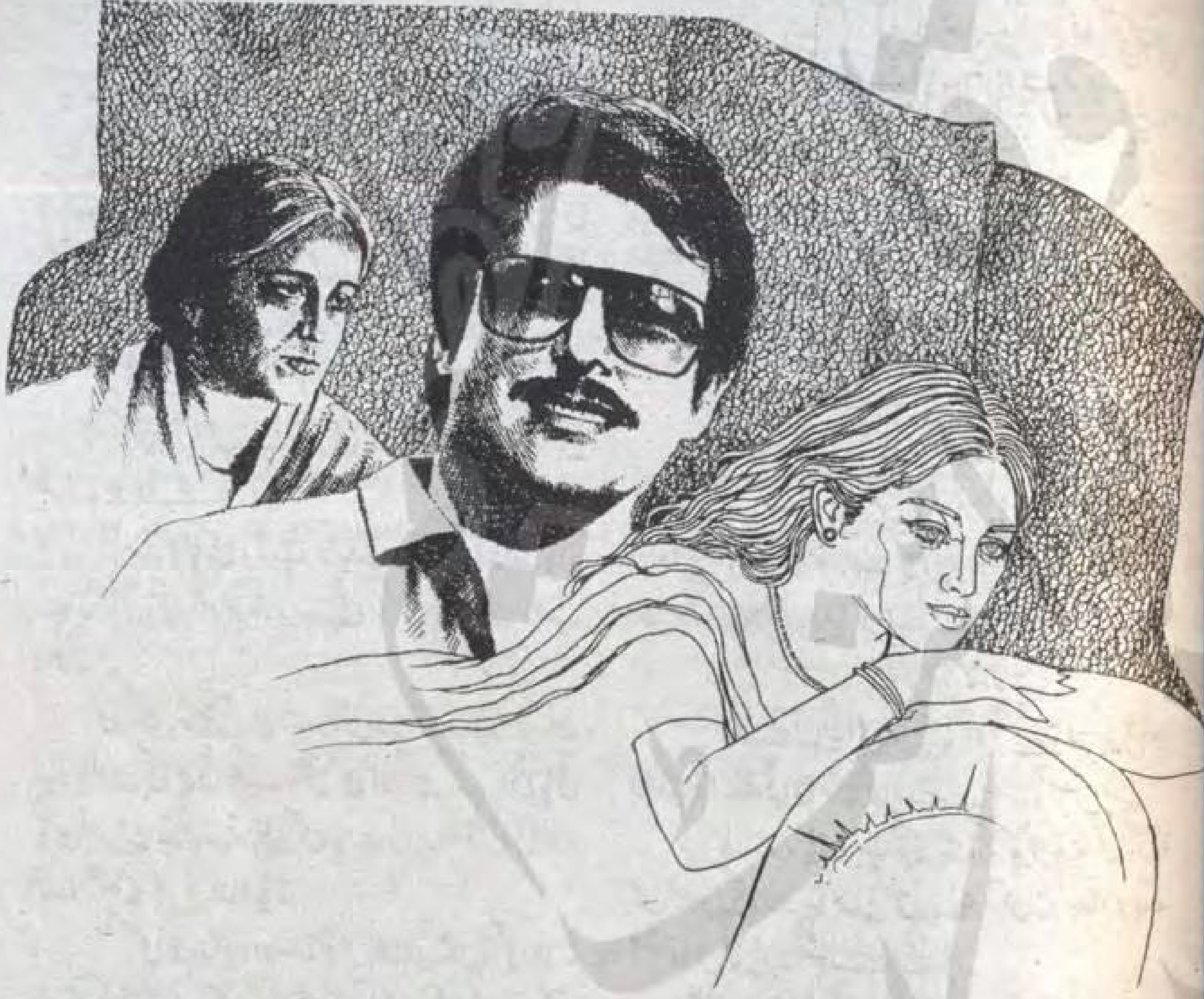
”نہیں...... میرے دل میں ان کے لیے کوئی فیلنگز نہیں۔“ ردا ایک دم منہ بنا کر سنجیدگی سے بولی۔

”ہاں...... اور جب دل میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہ ہو تو وہاں محبت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اچھا کیا تم نے مجھے صاف صاف بتا دیا، ورنہ میں توقیر بھائی سے بات کرنے والی تھی۔“ رشنا نے منہ بنا کر کہا تو ردا نے ایک دم بریک لگائی تو دونوں کو جھٹکا لگا۔ ردا نے جلدی سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

جاری ہے

سارہ کی گڑیا

غزالہ رشید



”سارہ...... سارہ! بارش تیز ہو رہی ہے اندر آؤ۔“

”ابھی آتی ہوں، پلیز بارش اچھی لگ رہی ہے۔“ وہ خود سے کہتی گول گول گڑیا کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

کل ہی اس کی اردو کی مس عذرا نے اسے نظم سنائی تھی جو انہوں نے خود لکھی تھی اور اتفاق سے اس نظم کا عنوان تھا۔ سارہ کی اِک گڑیا تھی۔ اسے وہ نظم

یاد ہوگئی تھی۔ خاص طور پر یہ مصرعے

ساره کی تو جان تھی وه
نگی کی پہچان تھی وه
لیکن کچھ نادان تھی وه
لیکن کچھ نادان تھی وه

''ساره جب سے تم نے میوزک سیکھنا شروع کیا ہے۔ میں تنگ آگئی ہوں۔ تمہاری بے پروائی سے۔ ہر وقت کا گانا بجانا کچھ اور بھی کرلیا کرو۔ ہوم ورک بھی میں کروادوں اور تمہارا یونیفارم استری بھی کردوں۔ نہ جانے کب عقل آئے گی۔'' نسرین خانم کی آواز نے اسے اب بیزار کرنا شروع کردیا تھا۔

''افوه، امی تو بس آرڈر، آرڈر ...... چلو بھئی۔'' اس نے تیزی سے قدم لاؤنج کی طرف بڑھائے۔

''ساره باجی، آپ کو باجی نے کتنی دفعہ بلایا ہے۔'' اس کی ہم عمر ملازمہ بچی نرگس نے بھی رعب ڈالا۔

وه چھپڑ چھپڑ کرتی اندر چل دی۔ خوب صورت سیاه بالوں کی پونی بھیگ چکی تھی اور کپڑے پانی پانی لیکن نسرین خانم نے کسی بھی بات کی پروا نہیں کی اور ایک دھموکا کمر پر جمادیا۔

''منھی بنی رہتی ہو، ساتویں کلاس میں آگئی ہو۔ اس عمر کی لڑکیاں چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھال لیتی ہیں مگر تم .....'' انہیں اس پر ایسے ہی غصہ آتا تھا۔

''اچھا ناں امی، لائیں بانو کو مجھے دے دیں۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''اس حال میں خود بھی بخار میں جلوگی اور اسے بھی۔ جاؤ پہلے کپڑے بدلو۔'' وه ڈانٹ کھاتی، کندھے اچکاتی، اچھلتی کودتی کمرے کی طرف چل دی۔

''اپنے کپڑے نچوڑ کر باہر ڈال دینا ساره رانی، ورنہ تو وه بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔'' ان کی آواز اس کا پیچھا کررہی تھی۔

آوازیں ساری زندگی ہمارا تعاقب کرتی ہیں، کبھی پیار بھری، کبھی نفرت سے جلاتی ہوئی اور کبھی گنگناہٹ، جیسے اردو کی مس عذرا کی خوب صورت آواز، جب وه کوئی بھی نظم سناتے ہوئے گنگناتیں تو ساره کا دل چاہتا ''ہائے کاش مس عذرا ہی میری امی ہوتیں، یہ امی سخت کیوں ہوتی ہیں، ڈانٹتی کیوں ہیں، ہر وقت سمجھاتی ہیں، ہر وقت......

''یوں نہ بیٹھو......''

''زور سے مت ہنسو......''

''چیزیں جگہ پر رکھو......''

''یوں کرو، یوں نہ کرو......''

''اف خدایا...... میں جلدی سے بڑی ہوجاؤں اور پھر مس عذرا کی طرح مسکراتی رہوں، گنگناتی رہوں لیکن ابھی تو بہت چھوٹی ہوں......'' یہ صدمہ ساره کو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا دکھ لگا۔

☆☆☆

''منہ کیوں لٹکائے بیٹھی ہو؟'' ریان کو شاید رعب ڈالنے کی بیماری تھی۔

''ہائے ریان، بارش میں گڑیا بھیگ گئی تھی، میں بھول گئی اور پتا نہیں کس نے اٹھالی۔'' ساره کے آنسو اس کا چہره بھگورہے تھے۔

''لو، دوسری گڑیا لے آئیں گے تمہارے بابا بحرین سے، تمہارے لیے کیا مسئلہ ہے۔'' ریان نے سائیکل کو لان میں دوسرا چکر لگاتے ہوئے مسئلے کا حل نکالا۔

''لیکن وه تو میری سب سے فیورٹ گڑیا تھی۔ پاپا نے میری سالگره پر گفٹ کی تھی، اس کے بال بالکل میرے جیسے تھے۔'' اس کی آواز میں اداسی تھی۔

''تمہارے سر پر تو بال ہی نہیں۔'' ریان نے ہنس کر کہا۔

''فیشن ہے بوائے کٹ بالوں کا، تمہیں کیا پتا

پھیچر۔'' اسے غصہ آگیا۔

''تم تو بڑی ہوکر بیوٹی پارلر کھولنا، سارا وقت یہی باتیں کرتی ہو۔'' ریان نے سائیکل کا تیسرا چکر مکمل کیا۔

''اترو میری سائیکل سے، بڑے آئے۔'' ساره نے ریان کو دھکا دے کر گرادیا۔

ریان نے دانت پیسے، کپڑے جھاڑے، اتنی دیر میں ساره سائیکل سمیت وہاں سے جاچکی تھی۔ دور ہوتی سائیکل اور ریان کی بے بسی پر ساره بالکل بھی دکھی نہ تھی، دکھ تو گڑیا کے کھوجانے کا تھا، جسے کندھے سے لگا کے وه مس عذرا کی نظم پڑھتی تھی۔

اک دن وه اسکول گئی
کھیل میں یہ بھی بھول گئی

بھول جانے کی عادت کا فائده زیاده اور نقصان کم ہے لیکن نہ جانے کیوں کچھ لمحے، کچھ یادیں ایسے ساتھ چلتی ہیں، جیسے آکاس بیل دیوار پر چڑھتی چلی جاتی ہے، مڑ کر ہی نہیں دیکھتی کہ کچھ پتے پیلے، خشک اور اداس ہوکر جھڑ گئے ہیں، گر گئے ہیں اور مسلے جائیں گے، اڑتے جائیں گے، خشک ہوا میں دور تک، بہت دور تک......

☆☆☆

''ریان تم ناں، کبھی کبھی بالکل وه آنٹی لگتے ہو۔'' ساره نے گڑیا کھیلنا چھوڑ دی تھی لیکن ریان سے لڑنا نہیں چھوڑا تھا۔

''کون سی یار...... تم پہلے میتھس کے یہ سوال تو کرلو، کل تمہارا ٹیسٹ ہے۔ عجیب سی لاجک درمیان میں نکالتی ہو۔'' ریان کا اپنا بھی پیپر تھا لیکن کیا کرتا بے چاره۔

''ہاں، ہاں سوال تو کررہی ہوں، وه جو ڈراموں میں طعنے تشنے کرتی، آتی اور جاتی ہیں، جن کو امی بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔'' اس نے ایک مشہور اداکاره کا نام لیا۔

''اب بھلا اس وقت ڈرامے کا ذکر کرنے کی کوئی تک بنتی ہے، تم جہاں ہوتی ہو وہیں رہا کرو، یہ تمہارا Concentration کا پرابلم ہی ہے جو تم میتھس میں فیل ہوجاتی ہو۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''تم سے تو کچھ کہنا بیکار ہے، ٹیوشن ٹیچر بن جاتے ہو، دوست تو اس میلے کے ہو، کیا نام ہے اس کا اچھے میاں کہ سچے میاں۔'' اس نے مذاق اڑایا۔

''وه اس کا پیار کا نام ہے، ورنہ نام تو اس کا وقاص ہے۔'' ریان سے دوست کی بے عزتی برداشت نہیں ہوئی۔ ''اپنی نیلی پیلی سہیلیوں کو دیکھا ہے، ہر وقت موبائل ہاتھ میں لیے ایس ایم ایس کر کے پوچھتی رہتی ہیں، آج کہاں چلیں یار، بوریت ہورہی ہے۔'' ریان نے دوبدو جواب دیا۔

''یہ ہوئی نہ بات، جب تم چڑ کر بات کرتے ہو تو اور بھی رنگ گہرا ہوجاتا ہے، میں تمہیں فیئر اینڈ لولی گفٹ کردوں گی، قسم سے، اچھے لگو گے گورے ہو کر۔ پتا نہیں خالہ جان نے منیر خالو سے شادی کیوں کی، تم سب کا بیڑا غرق کردیا، کسی اسمارٹ، گورے بندے سے شادی کرتیں۔'' ساره نے بے نیازی سے تبصره کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، تم کہیں کی شہزادی لگتی ہو۔'' ریان کا غصہ جائز تھا۔

''تمہیں نہیں لگتی، سب کا تو یہی خیال ہے کہ میں......!'' اس نے شرارت سے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''کہ تم میں، میں کرنے والی بکری ہو، جسے انگلش میں goat کہتے ہیں۔ ویسے بھی، چلو چھوڑو، کیا یاد کروگی، وه نہیں کہتا جسے سن کر تمہارا دماغ خراب ہوجاتا ہے۔'' ریان نے بدلہ لیا۔

''کیا سن کے دماغ خراب ہوتا ہے، بتا نا ذرا۔'' ساره نے بہادری دکھائی۔

''چھوڑو...... ٹیسٹ ہے، غصے میں سب بھول

جاؤ گی، پھر فیل ہوگئیں تو خالہ جانی سے تمہیں جو ڈانٹ پڑے گی، اس کا افسوس مجھے بھی ہوگا۔'' ریان نے بات ختم کی۔

''تم تو ہو ہی امی کے چمچے، ہر وقت ان کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہو۔'' سارہ نے لڑائی کی ابتدا کر ہی ڈالی۔

''اگر خالو جان بحرین نہ گئے ہوتے تو دیکھتا کہ تم کس طرح میری بے عزتی کرتیں، میں دوبارہ قدم بھی نہیں رکھتا تمہارے گھر میں۔'' ریان نے کتابیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر قدم بڑھا دیے۔

''کہاں جا رہے ہو ریان بیٹا، مجھے ابھی تمہارے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جانا ہے۔'' نسرین خانم نے آواز لگائی۔

''آپ فون کر دیجیے گا۔'' وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

کبھی کبھی، انجانے میں ہم ایک سا رویہ کیوں رکھتے ہیں، ان سے بھی جن سے ہمیں بہت پیار ہوتا ہے، بظاہر کتنی عام سی بات تھی ناں، توازن، جس کا سبزی والا بھی خیال رکھتا ہے لیکن ہاں بدلتے وقت نے اسے بھی ڈنڈی مارنا سکھا دیا تھا اسے بھی امی سے یہی شکایت تھی کہ پیار سے کیوں نہیں سمجھاتیں، ہر وقت... یہی کیوں کہتی رہتی ہیں، تمہیں کچھ نہیں آتا، تم نے کچھ نہیں سیکھنا اور ریان بھی امی کا ساتھی ہے ہر وقت کی تقریر، ہر وقت کی نصیحتیں......

سارہ کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خوشی کی تلاش اور خوش رہنا اور بھی اچھا لگنے لگا تھا، اسے دوستوں کی کمپنی بہت اچھی لگتی، جب صومی، فرح، شانی اسے کہتے ''سارہ تمہارے گالوں کے ڈمپل، تمہیں سب سے منفرد کر دیتے ہیں۔''

''اُف، تمہارے بال کتنا شائن کرتے ہیں۔'' شانی تو حیران ہی ہوتا تھا، ایسے میں فرح کہتی۔

''ہماری سارہ تو ہے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار۔'' لیکن نسرین خانم اور ریان کو صرف اور صرف نصیحتیں کرنے کی عادت تھی۔

''سارہ تم نے میتھس میں نمبر کیوں کم لیے؟'' امی کا احتجاج رزلٹ آنے کے فوراً بعد شروع ہو جاتا تھا۔

''سارہ، تمہاری یہ جو عادت ہے ناں کہ جہاں ہوتی ہو، وہاں موجود نہیں ہوتیں۔'' ریان کی ریسرچ، جس پر اسے بڑا مان تھا۔

''روز بروز بھلکو ہوتی جا رہی ہو۔'' ریان نے اب یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا۔

''امی کا چمچہ...... اللہ کرے اس کی شادی کبھی نہ ہو، بے چاری لڑکی کو گھر میں تالا لگا کر جائے گا۔'' سارہ بد دعا دیتے ہوئے بالکل نہ سوچتی۔ اور شاید زیادہ سوچنا بھی انسان کو بزدل بنا دیتا ہے، اسے تو ریان بزدل لگتا تھا۔

☆☆☆

''ریان فلم دیکھنے چلیں، اُف کیا اسمارٹ ہیرو ہے ناں۔'' وہ لے دے کے ریان کی ہی منت کرتی اور کوئی فلم دیکھنے دیتا بھلا، سب کی نصیحتیں کم از کم پچاس منٹ سے زیادہ کی ہوتیں۔ پتا نہیں کیوں......؟

اسے تو مس عذرا پسند تھیں، ایک دن انہوں نے کلاس میں سب اسٹوڈنٹ کے اصرار پر اپنی نظم سنائی تھی۔ جو بے حد اچھی تھی لیکن سارہ کو تو بس وہی نظم یاد تھی اور یاد کیوں رہی...... شاید اسے اپنی گڑیا جیسی وہ نظم لگتی تھی، گڑیا کو کھونے کا دکھ تو تھا ناں......

سارہ کی اِک گڑیا تھی
آنکھیں جس کی بڑی بڑی
رہتی تھی وہ کھڑی کھڑی
سارہ کی تو جان تھی وہ
پگلی کی پہچان تھی وہ
لیکن کچھ انجان تھی وہ
سارہ کی اِک گڑیا تھی

☆☆☆

''ریان، آج ہم سب کا لنچ کا پروگرام ہے، تم بھی ساتھ چلو، اکیلے تو امی کبھی جانے نہیں دیں گی۔'' اس نے شام کو خاص طور پر فرنچ فرائز کے ساتھ کافی بنا کر ریان کو دی۔

''واہ بھئی، ایسے لنچ تو روز ہونے چاہئیں، تم کچھ تو با اخلاق ہو جاؤ گی۔'' ریان جملہ تو ضائع کرتا ہی نہیں تھا۔

''آج میں تمہارے کسی جملے پر برا نہیں مانوں گی اور ناراض ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے کافی کا سِپ لیا۔

''کہاں کا پروگرام ہے کولمبس کی خالہ کا؟'' ریان بڑا افلاطون تھا۔

''نیا چائنیز ریسٹورنٹ ہے، شانی بتا رہا تھا کہ اس کے کزن آسٹریلیا سے آئے تھے تو وہ سب مل کر گئے تھے۔''

''یار، یہ شانی کو اور کوئی کام نہیں ہے سوائے لنچ اور ڈنر کی تعریفیں کرنے کے نہایت احمق لگتا ہے، صرف کھانا... اور کھانے کے پروگرام بنانا...... یار زندگی میں اور بھی مسئلے ہیں۔'' ریان نے فرنچ فرائز اور کافی کی بھی کوئی قدر کی نہ لحاظ، اسے تو وہ اپنی ماں کا بیٹا لگتا تھا۔

''ریان، ایک بات بتاؤ، تم مجھ سے صرف چار سال بڑے ہو یا دس سال یا پندرہ سال؟'' سارہ نے فرنچ فرائز کی پلیٹ اس کے سامنے سے ہٹائی۔

''کیا مطلب؟'' ریان نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

سوال ہی احمقانہ تھا۔ اس پگلی کا، بھلا وہ سائنس کا اسٹوڈنٹ، جس کا خواب صرف اور صرف ڈاکٹر بننا تھا یا پھر سائیکاٹرسٹ بننے کے شوق میں مبتلا تھا۔ لیکن امی اور سب نے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ... ڈاکٹر بنے، ان کا خیال تھا کہ نفسیاتی ڈاکٹر خود بھی آدھے پاگل ہو جاتے ہیں اور اس کی زندگی کا مقصد تابعداری تھا۔

''مطلب تو آسان سا ہے، بندے کو خوش رہنے کے لیے، جینے کے لیے صرف یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کتنا خوش ہے، کس کے ساتھ خوش ہے اور بس، یہ کیا کہ میں ایک جہان کی فکر میں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح زندگی گزار دوں۔'' سارہ نے کافی ختم کی۔

''شاہین بن جاؤ، علامہ اقبال کی شاہین، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر، ہاں بس چیل نہ بننا۔''

''افلاطون کی افلاطونی بات، بیکار، فضول، جلد ہی مر جائے گا، اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تھرڈ ورلڈ کا نیرو مائنڈڈ، عام سا، مڈل کلاس، اردو میڈیم، اللہ کرے مر ہی جائے، بڈھا کھوسٹ۔ اب کبھی نہیں پوچھوں گی، فرح سے کہوں گی وہ اپنا ڈرائیور بھیج دے گی، لنچ بھی اس کے ساتھ! یہ سڑیل تو منہ بنا کر ہی بیٹھا رہے گا، اس کی شادی تو اللہ کرے کسی موٹی، کالی، چشمے والی لڑکی سے ہو اور ہر وقت تقریر سنے اس کی......'' اس نے ٹرے اٹھائی اور خود کلامی کرتے ہوئے کچن کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''برتن دھو کے رکھنا، آج کام کرنے کا موڈ بن گیا ہے تو ذرا مجھے چائنیز کے لیے سبزی کاٹ دو، فضلو آج نہیں آئے گا، ویسے بھی اب تمہیں کھانا پکانا سیکھنا چاہیے۔'' نسرین خانم نے مزید اس کا دکھ بڑھا دیا۔

''جی اچھا امی۔'' سارہ نے نلکا پورا کھول دیا۔

''ارے سارہ، اتنا تیز پانی، برتن دھوتے ہوئے، کیا کرتی ہو۔'' انہوں نے قریب آ کر نلکا آہستہ کیا۔

''یا تو میری شادی ہو جائے یا میں مر جاؤں۔'' اس نے دعا کی۔

وہ قبولیت کا وقت تھا، تب ہی ایک تقریب

میں، مسز احمد کامران کو نازک سی سارہ کچھ اتنی پسند آئی کہ انہوں نے نسرین خانم کی دہلیز پر قدم جما دیے اور پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہوئی، پڑھنے سے اسے بھلا کہاں اتنی دلچسپی تھی کہ بی اے مکمل نہ کرنے کا دکھ سر دردی میں مبتلا کرتا۔ جبکہ امی کا اصرار تھا کہ اس کا بی اے کا فائنل ائیر ہے اور مسز احمد کامران کا کہنا تھا۔ ''ہمیں کون سا نوکری کروانی ہے، ویسے بھی میرے بیٹے رضا کو معصوم، سادہ سی سارہ کچھ ایسی بھائی ہے کہ وہ انتظار نہیں کر رہا اور سچ پوچھیں تو یہ چاندنی تو میرے آنگن کا اجالا بننے کے لیے ہی دنیا میں آئی ہے۔''

☆☆☆

نسرین خانم کو دنیا میں اگر کسی کی بات سمجھ میں آتی تھی تو وہ خالہ تحسین کی اور ریان کی اور ان دونوں کا ہی خیال تھا، حیرت انگیز طور پر کہ سارہ خوش قسمت ہے کہ اتنے اچھے اور رکھ رکھاؤ والے گھرانے سے اس کا رشتہ آیا ہے۔ اب تو اس نے کوکنگ کلاسز بھی جوائن کر لی تھیں کیونکہ مسز احمد کامران کی مسکراہٹ اسے مس عذرا جیسی لگی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ایک روز اس کی دوست فرح نے مس عذرا سے پوچھا کہ آپ نے سارہ کی اِک گڑیا تھی کیوں نام رکھا نظم کا، فرح کیوں نہیں رکھا؟ بقول اس کے۔ ''میرا نام بھی تو اتنا پیارا ہے۔''

مس عذرا نے مسکرا کر کہا۔ ''سارہ نام میں ایک عجیب سا ردھم ہے اور شاید کلاس میں سب سے زیادہ گڑیا کی باتیں سارہ ہی کرتی ہے تو میرے ذہن میں یہ نظم لکھتے ہوئے بار بار اسی کا نام گونج رہا تھا۔''

اس وقت تو اسے بس خوشی تھی کہ کلاس کے بتیس بچوں میں مس عذرا نے اپنی نظم کے لیے اس کا نام چنا تھا اور امی کا کہنا تھا کہ اس کا یہ نام انہوں نے اس لیے رکھا کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کا نام تھا اور جب انہوں نے میڈم سبزواری سے اسلامیات کی کلاس میں یہ نام سنا تھا تو انہیں بہت پسند آیا تھا۔

''لو جناب امی کو بھی میری طرح، اپنی میڈم یاد تھیں۔'' سارہ یہ سوچ کر مسکرا دی کہ اس کی اور امی کی اپنی ٹیچر کے نام پر ہی بس انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ بات تو مزے کی تھی ناں اور یاد رہ جانے والی۔

☆☆☆

بابا جان بھی بحرین سے آ گئے، انہیں بھی وہ لوگ بہت اچھے لگے، یوں لمحے اور دنوں میں اس کی دنیا، اس کا گھر، اس کی خواہشات نے ایک نیا جیون اوڑھ لیا، یوں وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کے قصرِ ہاشمی میں آنے کی تیاری کرنے لگی۔

شہر کے مشہور پارلر سے تیار ہو کر آئی اور پھر رخصت ہوتے وقت، اس نے ایک آنسو نہیں بہایا، میک اپ خراب ہونے کا خدشہ جو تھا۔ فرح، صوی نے تعریفیں کر کر کے اسے شہزادی بنا دیا تھا۔ شانی نے بھی گروپ فوٹو کھنچوائی اور رضا کو مبارک باد دی۔

''رضا بھائی، یہ سارہ جو ہے ناں ہم دوستوں کی گڑیا ہے، جو بس ہنستی اچھی لگتی ہے، آپ بھی اس کے ساتھ ہمیشہ خوش رہیں اور مسکراتے رہیں۔'' شانی بولا۔

رضا نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے گالوں کے خوب صورت ڈمپل کچھ اور گہرے ہو گئے اور چہرہ بے حد خوب صورت۔

رخصتی کے وقت اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ امی اس سے کتنا پیار کرتی ہیں، اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی اور ہاتھ تو بالکل برف کی طرف سرد......

''بیٹا، نیا گھر ہے، بس خاموشی سے سجائے رکھنا، اجڑنے نہ دینا، خوش رہنا ہر حال میں۔'' وہ شاید بول ہی نہیں پا رہی تھیں۔

''پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا، پتھر کی ہو جاؤ گی۔'' ریان کا افلاطونی جملہ، اس کی سماعتوں میں محفوظ ہو گیا۔

''رضا بھائی، ہماری گڑیا کو بھول جانے کی عادت ہے اور آپ تو ویسے بھی وہ شہزادے ہیں کہ جس کو دیکھ کر پریاں بھی راستہ بھول جائیں لیکن یہ ہم سب کو عزیز بہت ہے، یاد بھی بہت آئے گی۔ لہٰذا ملتے جلتے رہیے گا۔'' ریان نے بزرگانہ انداز اختیار کیا۔

بابا نے خاموشی سے سر پر ہاتھ پھیرا، سب لوگ دھندلاتے گئے، بس رضا احمد کامران کا چہرہ چاروں طرف تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی...... شاید بھولنا ہی بہتر تھا۔ بس یاد رہا تو وہ، جس نے کمرے میں آ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بس اتنا کہا۔

ایسا لگتا ہے زندگی تم ہو
اجنبی، کیسے اجنبی تم ہو

☆☆☆

''اُف ریان، رضا اتنے اچھے، اتنے اچھے ہیں کہ میں تو تمہیں بتا ہی نہیں سکتی، نو لیکچر، نو ڈانٹ ڈپٹ اور میری اتنی تعریفیں کرتے ہیں کہ تم لوگوں کو تو میری قدر ہی نہیں تھی۔ کل جب میں نے انہیں کافی کے ساتھ فرنچ فرائز اور کیک بنا کر کھلایا تو امی، ابو اور رضا نے میری اتنی تعریفیں کیں، ابو نے تو خوش ہو کر رضا سے کہا کہ تم دونوں کو میری طرف سے پی سی کے ڈنر کا انویٹیشن ہے، جی جناب اب بتاؤ، تم مجھے کہتے تھے ناں......'' وہ سامنے بیٹھی مسلسل بول رہی تھی۔

''لیکن تم وہاں ایسے سانس لیے بغیر بولتی ہو؟'' ریان کا افلاطونی سوال اسے تپا گیا لیکن آج اسے ریان پر بالکل غصہ نہیں آیا۔

''نہیں......!'' وہ بے اختیار ہنس دی، ڈمپل گہرے ہو گئے۔

''بس فارمولا نمبر ایک کامیابی کی کنجی ہے بچہ۔ عمل نہ چھوڑنا اور فقیر کو ایک اچھی سی کتاب گفٹ کر دینا۔ بس اتنا سوال ہے بابا کا۔'' ریان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''رضا کہہ رہے تھے کہ ایک دن تمہارے ساتھ ڈنر پر چلیں گے۔ میں نے یہی جواب دیا تھا وہ پڑا، برگر کا شوقین نہیں، کتاب کی دکان پر لے جائیں، ساری کتابیں کھا جانے گا اور وہ بھی lime یا green tea کے بغیر۔'' اس نے بے اختیار کہا۔

''ہا، ہا واٹ اے جوک۔'' ریان تپ گیا۔

''ارے مذاق کیا تھا، میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ میرا بھائیوں جیسا دوست ہے۔ امی اور ریان جو ہیں نا، میرے سب سے بڑے دشمن اور سب سے اچھے دوست ہیں۔''

''تمہیں بولنے کی عادت ہے ناں، ذرا خیال سے اور ہاں خالہ جانی کو فون کر لیا کرو، وہ ہر وقت تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہیں۔'' ریان نے لیکچر شروع کیا۔

''اب کیا پریشانی ہے انہیں، وہ سب بہت اچھے ہیں۔'' سارہ نے سونے کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں فکر تو تمہاری ہے۔'' ریان نے سر پر چپت لگائی۔ شام کو رضا آئے، سب ہی نے کھانا ساتھ کھایا، امی ہر بات پر... مسکراتے ہوئے کتنی اچھی لگتی ہیں اور سب بہن بھائی، جو اس سے چھوٹے تھے۔ رضا بھائی کی خاطر داریوں میں مصروف تھے۔ بابا جان نے واپسی میں ان دونوں کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، ان کی صبح بحرین کی فلائٹ تھی۔

''انکل، آپ جب چاہیں سارہ کو فون کریں، بات کریں، بالکل بے فکر ہو جائیں، سارہ کے پاس اس کا اپنا سیل ہے۔'' پھر اس کی طرف دیکھا۔

''سارہ ...... آپ نے اپنا فون نمبر دے دیا ناں؟'' رضا نے مسکرا کے گویا سب کے دلوں میں ڈیرے ڈال لیے۔

''بس بیٹا، اس میں سادگی اور تھوڑا بچپنا ہے، تم سمجھدار ہو، کوئی بات ہو تو نظر انداز کر دیا کرنا......'' امی نے وقتِ رخصت کہا۔

"نہیں امی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں بہت سمجھدار ہوں۔" سارہ نے امی کے گلے لگتے ہوئے کہا۔ "آپ بےفکر ہوجائیں۔"

"میری بیٹی بے حد سمجھدار ہے۔" ابو نے رضا کو گلے لگاتے ہوئے ایک بار پھر اس کا مان رکھا۔

"رات کو زیور نہ ہی پہن کر نکلا کرو، بلاوجہ جان کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں۔" امی نے آہستہ سے کہا۔

"جی اچھا!" اس نے حیرت انگیز طور پر فوراً ہی بات مان لی۔

محبت، تبدیلی چاہتی ہے، شاید محبت ورلسٹائل ہے، کبھی ماں، کبھی بہن، کبھی بھائی اور کبھی اولاد سے اور اگر رب سے ہوجائے تو عشقِ حقیقی...... بات تو ساری علم کی ہے اور وہ ابھی اس سیڑھی پر پہلا قدم رکھ رہی تھی۔ شاید اس نے اطاعت گزاری سیکھنا شروع کردی تھی۔ یوں بھی اس کا واسطہ، اس کا راستہ، ابھی تو صرف خوشی سے تھا، خوش رہنے سے تھا۔ شکر کے سجدے کا لطف اس کی پیشانی نے ابھی سیکھا ہی کہا تھا۔

"عبادت میں سکون ہے۔" مسز احمد کامران نے صبح بند کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر وقت نے بھی جھک کر سارہ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھا دیے۔

☆☆☆

یہ میری گود میں مچلی ہوئی ننھی سی کرن
اِک نئی صبح کا پیغام حسیں ہے کہ نہیں

ماں اور ممتا جیسی غیر مشروط محبت...... سب سے خوب صورت اور پیارا جذبہ، جذبۂ محبت...... اُف گلابی گلابی گال، خوب صورت گھنی پلکیں...... سیاہ خوب صورت بال......

"بالکل تمہارا عکس ہے اور اس کے لیے تمہارا بے حد شکریہ۔" رضا نے کانوں کے قریب آکر سرگوشی کی۔

اسپتال کے کمرے میں صرف پھول ہی پھول تھے۔ مسکراتے چہرے...... امی کی تر آنکھوں کی نمی آج پہلی بار اس کی آنکھوں کو بھی بھگو گئی تھی۔

"خیال رکھنا، اس موسم میں نمونیہ ہوجاتا ہے۔" امی نے سمجھایا۔

"گڑیا مبارک ہو سارہ، تمہاری اپنی گڑیا......" ریان نے بزرگانہ شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اس کے کان میں اذان دیجیے ناں۔" مسز احمد کی سرگوشی خاصی بلند تھی۔

"ہاں بھئی، ہماری ننھی پری ہے۔" دادا ابو آگے بڑھے۔

"اس کا عقیقہ، ساتویں دن ہی کرنا ہے، جب اللہ نے دیا ہے تو اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

چاروں طرف سرگوشیاں تھیں، آوازیں تھیں...... اسے نیند آرہی تھی...... آوازیں، خوشیاں اور وہ دوبارہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ خوشیوں بھرے سپنے جاوداں کیوں نہیں ہوجاتے۔

☆☆☆

اسے دعا نام بے حد پسند تھا لیکن سب نے نام رکھنے کی بھی لگتا تھا نئی رسم نکالی ہے، اسے محبتیں لینا ہی تو پسند تھا، ضد کیا کرتی...... وہ مسکرادی اور پھر اس کی گڑیا کا نام، سب کی پسند سے چاہ سے ماریہ بنت رضا رکھا گیا۔

اس کی معصوم معصوم سی حرکتیں، دن میں کئی کئی بار ان کا موضوعِ گفتگو بنتیں۔ نانو کی جان تھی وہ اور دادو کی پری...... ریان کی پرنسز تھی اور مانو کی ڈولی...... کتنے نام تھے، کتنا پیار تھا...... وہ پاؤں رکھتی تھی اور سب ہی اس کے قدموں کے نیچے دل رکھنے کو تیار رہتے تھے...... اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ بچوں کو کیسے سنبھالتے ہیں، دادو جو تھیں اس کے ہر کام میں پہل

کرنے کو اور پھر بھلا اس جیسی خوش رہنے والی سارہ کو تو بس ہر طرف پیار اور خوشی چاہیے تھی۔ صرف خوشی......

☆☆☆

"سارہ، اس کے فیڈر بوائل ضرور کرنا۔" وہ امی کے گھر آئی ہوئی تھی۔

"جی امی، کرتی ہوں۔" اسے ریان سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔

"لاؤ، اسے مجھے دے دو، مجھے پتا ہے کہ ریان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں مٹھارنی ہیں، تمہیں......" امی کو اب اس پر غصہ نہیں آتا تھا۔

"ریان تم بتاؤ، اسے کون سے اسکول میں ایڈمیشن دلوائیں۔ تم اور رضا جو کہیں گے بس یہ اسی اسکول میں جائے گی، اسے پڑھانا ہے تم نے۔" وہ ریان کے لیے کافی بنا لائی۔

"یار، میرے لیے بھی دلہن تلاش کرلو ناں، بور ہوگیا ہوں، امی کہتی ہیں، اپنی پسند بتاؤ، مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔" ریان نے آج پہلی بار اپنا مسئلہ پیش کیا۔

"تم تو نہ ہی کرنا دلہن تلاش، اُف خدارا، تم تو کسی موٹی عینک والی لڑکی کو پسند کرلو گے اور پھر دونوں مل کر ریسرچ سینٹر کھول لیں گے۔ بے چاری میری خالہ جان...... دو موٹی موٹی کتابوں کو گھر میں کیسے برداشت کریں گی اور وہ بھی فلسفے کی۔" اس نے کافی کا سپ لیا اور بے اختیار بولی۔ "اوئے کتنی گرم ہے میں تو جل ہی گئی۔"

"بتاؤ یار...... امی جب دیکھو کہتی ہیں میڈیکل، میڈیکل کرتے رہتے ہو، پریکٹیکل بھی تو بنو، باپ سر پر نہیں ہے اور نہ میری گھومنے پھرنے کی عادت، تم سارہ سے کہو، وہی لائے گی بھابی۔" ریان نے بالکل خالہ جانی کا انداز اختیار کیا تھا۔

"بالکل درست فرمایا، تم اسکول ڈھونڈو اور میں تمہارے لیے اپنے جیسی کیوٹ سی لڑکی ڈھونڈتی ہوں جو چشمہ نہ لگاتی ہو اور رنگ بھی صاف ہوگا۔" وہ پرانی والی سارہ بن گئی۔

"بدتمیزی نہیں چلے گی، ورنہ میں......" ریان نے آنکھیں دکھائیں۔

"اس کے بغیر زندگی نہیں چلے گی یارا۔"

سیل فون بجنے لگا، وہ کال ریسیو کرتے کرتے باہر نکل گئی۔

"کب عقل آئے گی اس پاگل کو اور کپ اٹھا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا۔"

☆☆☆

"اوہ یار، پک اپ دا فون جلدی کرو، بیٹھا ہوگا، کتاب کی چھاؤں میں۔" سارہ نے ماریہ کو سلا کے کاٹ میں ڈالا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لاؤنج میں آئی۔

"اُف خدایا...... اتنی گھنٹیاں، دو منٹ انتظار تو کرلیا کرو، بندہ مصروف بھی ہوسکتا ہے۔" ریان نے سلام دعا کے بغیر ڈانٹا۔

"بھئی اتنی اچھی خبر ہے کہ رات سے نیند نہیں آرہی۔" سارہ نے تیزی سے اپنی بات شروع کی۔

"کیا مسئلہ حل ہوگیا؟" ریان واقعی پریشان تھا۔

"میں نے رضا کو بتایا، رضا نے امی کو اور پھر امی تو ہر مسئلہ حل کردیتی ہیں۔ چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔" اس کی آواز میں خوشی ہی خوشی تھی۔

"سن رہا ہوں، زور سے مت بولو۔" ریان کا انداز کبھی بدل نہیں سکتا تھا۔

"انہوں نے بات بھی کرلی، تم امی اور خالہ جان کے ساتھ آج شام چھ بجے ہمارے گھر آجانا۔" اس نے جلدی جلدی بتایا۔

"وہاں سے کیا یو ایس اے کی فلائٹ ہے، میں نہیں آؤں گا، تم بس پسند کرلو۔" ریان نے گھبرا کر کہا۔

"افوہ...... ریان، وہ پڑھی لکھی فیملی ہے بالکل تمہارے مزاج کی لڑکی ہے یار۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں اور ہاں رنگت ہے میری پسند کی۔" سارہ بے حد خوش تھی۔

"لیکن یار، مجھے امی کے ساتھ آنا اچھا نہیں لگے گا، بعد میں سہی۔" ریان نے گھبرا کر کہا۔

"تم تو بس بڈھے ہی بنے رہو، پھر نہ کہنا کس سے شادی کرا دی، رضا کی ماموں زاد ہے، فارمیسی کیا ہوا ہے۔ تمہارا کلینک، اس کا میڈیکل اسٹور۔" سارہ نے ہنس کر کہا۔

"پھر بدتمیزی؟" ریان نے گھر کا۔

"رشتہ کرانے کا نیگ، مہندی لگائی... اور نہ جانے کیا کیا...... میں تو خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں، نیند نہیں آ رہی اور ریان اس کے میری طرح ڈمپل بھی پڑتے ہیں۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"میں امی سے کہتا ہوں۔" اس کا جملہ ادھورا تھا اور وہ محترمہ ہمیشہ کی طرح جلد باز...... فون ہی بند کر دیا۔

☆☆☆

گھر آیا تو امی کی مسکراہٹ نے بتا دیا کہ ان سے بات ہو چکی ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ ساتھ چلو، ویسے بھی رضا کی فیملی نے اپنے اخلاق اور رکھ رکھاؤ سے ان سب کو ہی متاثر کیا ہوا تھا۔ اسی لیے سب ہی مطمئن تھے، ورنہ خالہ جان کا خیال تھا کہ آج کل صرف لڑکیوں کے لیے نہیں، لڑکوں کے لیے بھی خاصی سوچ سمجھ کر حامی بھرنا پڑتی ہے۔

ریان حیران تھا، پریشان بھی لیکن عائزہ کو دیکھ کر اسے لگا اس کی تلاش شاید یہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے دعویٰ تھا کہ وہ بچپن سے سارہ کے مزاج کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور وہ سارہ کو لاابالی سی بے وقوف سی لڑکی سمجھتا تھا لیکن وہ تو اس کے مزاج کے ہر موسم سے آشنا تھی۔

خالہ جان بھی بے حد مطمئن تھیں، وہ دو بھائیوں کی بہن تھی۔ بالکل ایسی لڑکی جیسی خالہ جان چاہتی تھیں۔

واپسی پر سب ہی بے حد خوش تھے، رضا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ریان کی طرف دیکھا، مسکرائی اور میسج کیا۔

"لڑکے، تم کنوارے رہ جاتے
مانو ہمارا احسان کہ......
گوری، پیاری لڑکی نے
ہاں کر دی......
ہا، ہا، ہا......"

"تم سات بچوں کی اماں بن جاؤ، بال سفید ہو جائیں، جھریاں پڑ جائیں، دیکھ کر تم پر ترس آئے لیکن... پھر بھی تم سدھر نہیں سکتیں۔" ریان نے جواباً میسج کیا۔ آج پہلی بار اس نے پھولوں اور خوشبوؤں کو اپنے قریب مہکتے ہوئے پایا تھا۔

رشتے محبتوں کے ہوں تو سفر طویل اور تھکا دینے والا نہیں لگتا۔ منافقتوں کا ہو تو بار بار قدم اکھڑنے لگتے ہیں۔ آبلہ پا ہونے لگتا ہے محبت کرنے والا اسی لیے تو کسی شاعر نے کہا ہے اور شاید قلم کو چوم کر ہی کہا ہو گا کہ......

کچھ بت بنا لیے ہیں، چٹانیں تراش کر
دل بھی بہانہ ساز ہے، غم بھی بہانہ ساز

سارہ نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا وہ محبتیں دینا جانتی تھی، صرف لینا تو محبت نہیں ناں...... رب کا بندے سے تعلق کیسا ہے صرف لینے کا...... دینے کا حق ادا کرتا ہے کیا بندہ......؟ یا شاید انسان کا انسان سے رشتہ...... محبتوں کا سفر، نفرتوں کے آبلوں پر ٹھنڈک ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے اپنے بندوں سے کہ میرے بندوں کے حقوق ادا کرو۔

☆☆☆

ریان کی شادی پر سارہ نے سارے ارمان نکالے، سال بھر کی ماریہ کا بھی غرارہ سلوایا گیا تھا...... رنگ تھے، بہار تھی، عائزہ دلہن بنی اتنی پیاری لگ رہی تھی، اس نے ریان کے قریب جا کر مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے؟"
"نیک ترین خیال ہے۔" زیان مسکرایا۔
"ویسے آج تم بھی کم کم بزرگوار لگ رہے ہو، ورنہ تو...... بے چاری عائزہ......" اس کی سرگوشی پر عائزہ بھی مسکرادی۔
"سارہ تم نے کھانا کھالیا؟" رضا نے ماریہ کو اس کی گود میں دیا۔
"آج تو میں امی کے گھر رہنے جاؤں گی، سارے نیگ وصول کرنے ہیں، کھانا بھی وہیں کھاؤں گی، یہاں تو مزہ نہیں آئے گا۔" وہ اِترا رہی تھی۔
"اوکے فائن، مجھے تو بے حد بھوک لگ رہی ہے۔" رضا یہ کہتے ہوئے چل دیے۔
"جان بھی چھوڑو۔" زیان نے سرگوشی کی۔
"اوہ! آج تو ممکن نہیں ہے۔" سارہ نے.... بہ آوازِ بلند کہا۔
"آہستہ بولو۔" زیان نے گھُرکا۔
"ماریہ، ماموں جانی کی گود میں بیٹھ کر تصویر کھنچوائے گی ناں؟" وہ ماریہ کو اس کی گود میں بٹھا کے اسے تنگ کررہی تھی لیکن زیان نے بے اختیار ماریہ کے گالوں کو چوم لیا۔
"ارے شیروانی خراب ہوجائے گی۔" وہ بچی کو واپس لیتے ہوئے بولی۔
رخصتی پر وہ بھی رودی، رضا نے حیران ہو کے اس کے سر پر چپت لگائی۔ بڑے دنوں بعد افسوس ہوا، میرے ساتھ شادی کر کے۔" رضا نے شرارت سے سرگوشی کی۔

☆☆☆

سارہ کی اِک گڑیا تھی
آنکھیں اس کی بڑی بڑی
رہتی تھی وہ کھڑی کھڑی

آج نہ جانے کیوں خواب میں اسے ساتویں کلاس کی مس عذرا نظم گنگناتے ہوئے نظر آئیں۔ وہ صبح سے مسلسل سوچ رہی تھی اور پھر اس نے وہ نظم ایک کاپی پر لکھ ڈالی، کتنے دنوں بعد قلم اٹھایا تھا۔
اُف میری لکھائی کتنی گندی ہوگئی ہے۔ اب مجھے ماریہ کو پڑھانا شروع کرنا ہے، اس لیے مس عذرا خواب میں نظر آئی ہیں۔" اس نے خواب کی تعبیر، خود ہی نکالی اور مطمئن ہوگئی۔
اب زیان سے بات کم ہی ہو پاتی۔ عائزہ سے بات ہوتی تھی، اکثر ڈنر وہ ایک ماہ میں ساتھ ضرور کرتے، رضا کی اور زیان کی دوستی دیکھ کر اسے طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

☆☆☆

امی، ابو عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے۔ وہ ماریہ کو اسکول میں داخل کرا چکی تھی۔ ماشاء اللہ خوب باتیں کرتی، اس نے اسے بھی وہ نظم یاد کرادی تھی اور رضا کا کہنا تھا کہ اس کی آواز بڑی اچھی ہے اور اب تو وہ ٹھیک ٹھاک بیگم رضا کامران بنتی جارہی تھی۔
شہر کے حالات روز بروز خراب سے خراب ہوتے جارہے تھے، ماریہ کو آج اکیلے ڈرائیور اسکول سے لانے گیا ہوا تھا۔
اس کا موبائل بند تھا۔ وہ رات کو اسے چارج کرنا بھول گئی تھی۔ آج پہلی بار اس نے طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ڈرائیور کو اکیلے بھیج دیا تھا۔
"تم نہیں سدھروگی۔" زیان کا جملہ یاد کر کے وہ مسکرادی۔
"اُف لائٹ کو بھی روز ہی جانا ہوتا ہے۔" اس نے آف موبائل کو دیکھا اور سوچا کہ امی کے گھر جا کر وہیں سے ڈرائیور کو فون کردوں گی، وہ ماریہ کو لے کر وہیں آجائے گا۔ گھر سے فون ملایا تو ڈرائیور کا فون بند آرہا تھا۔ اس کا دل تھوڑا سا پریشان تو ہوا لیکن ڈرائیور خاصا قابلِ اعتبار تھا۔ لہٰذا اسے بے فکری تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں طبیعت بے چین سی تھی۔ اس خوش خبری نے اسے تنگ بھی تو کر رکھا تھا۔ آج کل اس کا بلڈ پریشر ہائی تھا۔ وہ پہلے کی طرح فریش نہیں تھی، دوسرے بچے کی آمد نے اسے چڑچڑا بھی کردیا تھا۔ شاید ذمے داریوں سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔
اس نے موبائل اور چارجر بیگ میں ڈالا اور امی کی طرف چل دی، راستے بند ہونا تو اب روز کا معمول ہوگیا ہے۔" رکشے والا ہی بار بار گلیوں سے گزر کر بیزار ہوجاتا۔ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھی بندہ خواہ مخواہ ہی وہمی ہونے لگتا ہے یا شاید آج کل طبیعت نے اسے ایسا کردیا تھا۔
اس نے خود کو سنبھالا۔ اسے آج بار بار امی کی بچپن کی نصیحتیں یاد آرہی تھیں۔
"ننھی بنی رہتی ہو، احساسِ ذمے داری نام کو نہیں ہے..." وہ غلط نہیں کہتی تھیں، جب سے امی، ابو عمرے پر گئے ہیں، میں ماریہ کو اس طرح سنبھال نہیں پارہی، جیسے سنبھالنا چاہیے۔ ایک ہفتے پہلے بخار ہوگیا تھا تو رضا کو میرے ساتھ گھر میں رکنا پڑا تھا۔ میں گھبرا جاتی ہوں، اتنے اعصاب مضبوط نہیں ہے میرے۔" رکشے کے شور میں، وہ نہ جانے کیا، کیا سوچتی رہی۔
"السلام علیکم! امی کیسی ہیں؟" وہ ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر ٹیلی فون کے پاس پہنچی۔ بار بار نمبر ملانے پر بھی ڈرائیور کی طرف سے کوئی بھی جواب نہیں آرہا تھا۔
"آج میں نے پتا نہیں کیوں سستی کی، رات سے سر میں درد نے پریشان کر رکھا تھا۔ ورنہ تو میں ساتھ ہی جاتی تھی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔
ہونی انہونی کے درمیان، پتا نہیں وہ کیوں وہمی ہورہی تھی۔
"خیر تو ہے؟" امی نے اسے دیکھا۔
"وہ امی ڈرائیور کا فون بند آرہا ہے، رات سے سر میں درد تھا، میں نے ماریہ کو لینے ڈرائیور کو اکیلے ہی اسکول بھیج دیا تھا۔ اب گھبراہٹ ہورہی ہے۔"
"تم تو ہمیشہ کی احمق، بے پروا ہو، لڑکی ذات ہے، آج کل رشتوں کا اعتبار نہیں اور تم نے ڈرائیور کے ساتھ ذرا سی بچی کو اسکول اکیلے بھیج دیا۔ سارہ تمہیں عقل کبھی نہیں آئے گی۔" امی نے اسے لتاڑنا شروع کردیا۔
"رضا کو فون کرتی ہوں، ان کی آج سائٹ پر میٹنگ ہے وہاں بیسمنٹ میں شاید سگنل کا پرابلم ہورہا ہے۔" چارجر لگاتے ہی ایک اجنبی نمبر بار بار اس کے موبائل اسکرین پر چمکنے لگا۔ اس نے اٹھانا چاہا تو کال ڈراپ ہوگئی۔ اس نے لینڈ لائن سے اس اجنبی نمبر پر فون کیا وہ شاید کسی اسپتال کا نمبر تھا۔
"ان کی گاڑی فائرنگ کی زد میں آگئی تھی۔"
اور پھر ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی، دوسری طرف ایک آواز مسلسل آرہی تھی... لیکن اس کی سماعتوں میں بس یہی گونج تھی۔
"فائرنگ کی زد میں آکر ڈرائیور اور بچی موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ آپ آجائیں فوراً......"
امی نے زیان کو فون کیا اور اس کے چاروں طرف ایک ہی آواز تھی، وہی ایک آواز...... جس کا ساتھ اسے ہمیشہ عزیز تھا...... سماعتوں میں محفوظ تھا...... یادوں میں خوابوں میں، وہی اک آواز...... وہی اِک رشتہ اور پھر ایک خواب...... ایک حقیقت......
زیان...... !رضا!" اس کی آواز ڈوب رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی۔

"وہ سارہ کو بھولی تھی
یا پھر کالے موٹے جن نے
گڑیا کو جھولے سے اٹھایا تھا
چپکے سے......
چپکے سے...... ماریہ بھی تو گڑیا تھی
ماریہ بھی تو گڑیا تھی
سارہ کی تو جان تھی وہ
پگلی کی پہچان تھی وہ......"



مکمل ناول

خواب حقیقت اور سراب

ذکیہ خلیل

"شبینہ بیٹی، اتنا ہنسنا اچھا نہیں، ویسے بھی مغرب کا وقت ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں یہ وقت بھاری ہوتا ہے۔" دادی ماں نے وضو کرنے کے بعد غسل خانے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"اوہو دادی ماں، آپ بھی ہر وقت نصیحت ہی کرتی رہتی ہیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا اور کمرے سے نکل گئی۔ اسی وقت افسر صاحب گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اماں کی بات سن کر بولے۔



"امی جی بچی ہے، یہی تو وقت ہے ہنسنے کا۔ اب ہنسنے پر بھی کیا ٹوکنا۔"

"بیٹا! ہمارے وقتوں میں کہتے تھے کہ زیادہ ہنسنا زیادہ رونے کا سبب بن سکتا ہے...... تبھی تو روکتی ہوں۔ پرائی امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ آگے جا کر خوب ہنسائے۔" دادی ماں اپنی صفائیاں پیش کرنے لگیں۔

ان کی بہو سلطانہ بیگم کو بھی موقع مل گیا۔ "خدایا، امی جان ایسا تو نہ کہیں۔ میری بچی بھلا کیوں روئے۔ اللہ ہمیشہ اسے ہنستا رکھے۔ نازوں پلی ہے۔ انشاء اللہ سسرال بھی ایسی ہی ملے گی۔" بے چاری دادی ماں سب کی باتیں سن کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

"چلو شبینہ، آج کا پیریڈ مس کرتے ہیں اور خوب گپیں لگاتے ہیں۔" اس کی سہیلی سارہ بولی حالانکہ وہ ابھی ابھی کالج پہنچی تھیں۔ شبینہ بھی ہنگاموں کی دلدادہ تھی فوراً راضی ہو گئی۔ اس کا باقی گروپ بھی آ گیا۔ سب کی سب شوخ و شنگ...... کینٹین کی طرف بڑھ گئیں۔ وہاں ہنگامے کا سماں تھا۔ ان سب نے خوب دھکم پیل کی پھر چائے سموسے لے کر باہر درختوں کی چھاؤں میں آ بیٹھیں۔ دراصل مدیحہ کی دو دن پہلے منگنی ہوئی تھی۔ سب کی سب اس سے تفصیلات سننے کی مشتاق تھیں۔

"اللہ کیا بتاؤں، عمر جرمنی میں پڑھائی کر رہے ہیں، بس دو سال بعد اُن کی تعلیم ختم ہو جائے گی پھر وہیں سیٹ ہونے کا ارادہ ہے۔"

"اور تم بھی جرمنی چلی جاؤ گی؟" یہ سارہ تھی۔

"اور کیا! قسم سے میرا دل تو ابھی سے جانے کو کر رہا ہے۔" مدیحہ نے کہا تو سب ہنس دیں۔ سب کی سب بہت رشک بھری نظروں سے مدیحہ کو دیکھ رہی تھیں۔ آج ان لوگوں نے کوئی کلاس نہیں لی۔ واپسی پر بھی وہ اور سارہ، مدیحہ کے متعلق ہی باتیں کرتی رہیں۔ وہ دونوں ایک ہی گلی میں آمنے سامنے رہتی تھیں لہٰذا واپسی پر وہ کبھی کبھی ایک دوسرے کے گھر چلی جاتیں۔ آج سارہ کو شبینہ اپنے گھر لے آئی۔

شبینہ...... ایک پڑھی لکھی مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد اسلام آباد کے سرکاری دفتر میں معقول عہدے پر فائز تھے اور انہیں سرکاری مکان ملا ہوا تھا جو پرانے طرز کے مکانات میں سے تھا۔ گو مکان کافی پرانا لیکن لان بہت بڑا اور خوب صورت تھا۔ برسوں سے وہ یہاں مقیم تھے۔ شبینہ نے یہاں کے ماڈل اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی اور پھر نزدیکی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ سوئے اتفاق ان کے محلے میں اس کی ہم عمر کافی لڑکیاں تھیں۔ زیادہ تر اس کی اسکول فیلوز تھیں۔ جو اَب کالج فیلو بن گئی تھیں۔ شبینہ طبیعتاً شوخ و شنگ اور جدید فیشن کی دلدادہ لڑکی تھی، دوسرے وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کا فائدہ بھی بھرپور اٹھاتی۔ دونوں بھائی بڑے تھے، وہ بی اے میں پہنچ چکی تھی لیکن ابھی تک طبیعت میں لاابالی پن تھا۔ شکلاً وہ کافی خوب صورت تھی۔ متناسب قد و قامت، کالے لمبے بال، گورا رنگ، تیکھے نین نقش...... جو بھی پہنتی اس پر سج جاتا۔ وہ خود بھی کپڑے سی لیتی تھی اور اکثر کپڑوں پر نت نئی ڈیزائننگ کرتی۔ آج بھی کھانے کی میز پر وہ اور سارہ چہک رہی تھیں۔ دوپہر کے کھانے پر عام طور پر گھر کی خواتین ہی ہوتیں۔ مرد حضرات صرف رات کا کھانا گھر پر کھاتے تھے۔ کھانے پر بھی موضوع مدیحہ اور اس کا منگیتر تھا۔ شبینہ نے ساری روداد سنانے کے بعد بڑے لاڈ سے امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"امی، میرے لیے بھی اچھا سا لڑکا تلاش کیجیے گا۔ میری شادی خوب دھوم دھام سے ہونی چاہیے۔ امی میں بھی شادی کر کے باہر جاؤں گی۔ کتنا گلیمر ہے وہاں کی لائف میں۔ آپ میرے لیے خوب کپڑے بنائیں گی ناں۔" وہ بدستور لاابالی پن سے بولے جا رہی تھی۔

"ہاں، ہاں...... میں اپنی بیٹی کے لیے مہنگے سے مہنگا جوڑا سلواؤں گی۔ میری خواہش ہے کہ خوب دھوم دھام سے میری بیٹی کی شادی ہو۔" بیٹی کی ہاں میں ہاں ملا کر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ دادی ماں کا ہاتھ نوالہ منہ کی طرف لے جاتے لے جاتے رک گیا۔ وہ حیرت سے ماں بیٹی کی گفتگو سن رہی تھیں۔ سلطانہ بیگم کے کچن میں جاتے ہی وہ خفگی سے گویا ہوئیں۔

"شرم و حیا نام کو نہیں۔ کیا لڑکیاں اپنی شادی بیاہ کی باتیں خود کرتی ہیں؟ لڑکیوں کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے رشتے کی تفصیلات خود طے کریں۔ آئندہ میں نے ایسا سنا تو زبان پر جلتا انگارہ رکھ دوں گی سمجھیں......" شبینہ کو سارہ کے سامنے شدید ذلت کا احساس ہوا۔ اس کے گال سرخ ہو گئے اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنہیں وہ پینے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی وقت سلطانہ بیگم کچن سے واپس آ گئیں۔ انہیں ماحول کی تلخی کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے کہنے لگی۔

"دادی ماں نے شبینہ کو اپنے رشتے کی بات خود کرنے پر ڈانٹا ہے۔" سلطانہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ غصے سے بولیں۔

"امی جی، آپ کو کچھ لحاظ ہے؟ بچی کی سہیلی بیٹھی ہے وہ گھر جا کر کیا کہے گی۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور آپ......" دادی ماں گڑبڑا کر رہ گئیں۔

"بیٹا! میری بوبو جی کہتی تھیں کہ لڑکیوں کا اپنے منہ سے بر مانگنا بدشگونی اور قربِ قیامت کی نشانی ہے۔" انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"امی، اب تو لڑکیاں خود اپنا بر تلاش کرتی ہیں۔ پلیز اپنی بوبو کی باتیں اپنی بیٹیوں کو بتائیں جو اپنی لڑکیوں کے لیے ان کے پسند کے رشتے تلاش کرتی پھرتی ہیں۔" صورتِ حال کا رخ دیکھ کر دونوں لڑکیوں نے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی جبکہ دادی کو بھی شدت سے اپنی بے بسی اور ذلت کا احساس ہوا۔ انہوں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہو بیگم، آپ کو اپنی انیس سال کی بیٹی کی دل گرفتگی کا تو خیال ہے لیکن مجھ بڑھیا کو جس طرح آپ نے اپنی بیٹی اور سہیلی کے سامنے ذلیل کیا اس کی شکایت میں کس سے کروں۔" چند لمحوں کے لیے سلطانہ بیگم کو اپنی درشت کلامی پر ندامت ہوئی۔ ان کے ضمیر نے بھی ملامت کی لیکن وہ معافی مانگ کر شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھیں لہٰذا خاموشی سے برتن سمیٹنے لگیں۔

☆☆☆

ڈھیروں ڈھیر چوڑیاں پہنے شبینہ، ہلکے سے کام والے میرون جوڑے میں بہت جچ رہی تھی۔ گھنٹے سے اوپر ہو گیا تھا لیکن اس کی تیاری ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ سب گھر والے بیزار لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"شبینہ اگر تم نے پانچ منٹ اور دیر کی تو ہم تمہیں چھوڑ جائیں گے۔" افسر صاحب نے اونچی آواز میں کہا تو تھوڑی دیر میں وہ آ گئی۔

"ماشاء اللہ میری بچی کو خدا نظرِ بد سے بچائے۔" یہ سلطانہ بیگم تھیں۔

"امی میں کرینہ کپور کی طرح لگ رہی ہوں ناں!" اس نے لاڈ سے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ ہنس دیں بلکہ سبھی ہنس دیے صرف دادی ماں لب بھینچے رہیں۔ آج ان کے ایک محلے دار کی بیٹی کی منگنی کی تقریب تھی۔ لڑکا فوج میں ملازم تھا جبکہ لڑکی ایم اے فائنل میں تھی۔ خوب دھوم دھام سے منگنی کی جا رہی تھی۔ تمام اہلِ محلّہ کو دعوت دی گئی تھی۔ سب لوگ ہال میں پہنچے تو لڑکے والے گا بجا رہے تھے۔

لڑکی والے کب تک خاموش رہتے لہٰذا وہ بھی شروع ہوگئے جس میں شبینہ اور اس کی سہیلیاں آگے آگے تھیں۔ سب نے خوب انجوائے کیا تھا۔ واپسی پر بھی وہ کافی پُرجوش تھی اور اب اس تقریب پر تبصرے ہو رہے تھے۔

''آپ کو لڑکی پکی عمر کی نہیں لگی؟'' یہ سلطانہ بیگم تھیں۔

''بھئی یہ تم عورتوں کے نوٹ کرنے کی باتیں ہیں۔'' افسر صاحب نے جواب دیا۔

''کیوں، امی آپ بتائیں لڑکی کافی عمر کی ہوگی ناں آخر ایم اے میں ہے۔ میں تو شبینہ کی شادی بی اے کرتے ہی کردوں گی۔ لڑکیوں پر دلہناپا چھوٹی عمر میں ہی بجتا ہے، ہے ناں امی، آپ کا کیا خیال ہے؟'' سلطانہ بیگم کو ساس کی تائید کا یقین تھا مگر وہ کہہ رہی تھیں۔

''بیٹا رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں...... پھر لڑکی نے رشتے کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کی خالہ بتا رہی تھی کہ اکنامکس میں ایم اے کر رہی ہے۔ ساتھ ساتھ کسی این جی او میں تجربہ بھی لے رہی ہے۔ وہ تنخواہ بھی دیتے ہیں، میری بو بو جان نے بابا جان کی مخالفت مول لے کر مجھے پڑھایا تھا کہ مشکل وقت میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ دیکھو ان کی سمجھداری میرے کتنی کام آئی۔ بٹوارے کے بعد ہم نے کیا کیا مشکلیں نہ دیکھیں مگر میں نے ہمت نہ ہاری، افسر کے ابا بعد میں آئے تھے اور میں یہاں اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ بچوں کو اسی تنخواہ میں پالا پوسا، چند برسوں بعد افسر کے ابا بھی پاکستان آگئے۔ فسادات میں کہیں کھو گئے تھے۔ تو ان کا دماغی توازن درست نہیں رہا تھا۔ میں نے ان کا علاج کروایا۔ ماشاءاللہ بہت محنت کی میں نے پھر ان کے صحت یاب ہونے کے بعد اللہ نے برکت دی اور میں نے گھر پر بھرپور توجہ دینی شروع کردی۔'' دادی ماں نے کئی دفعہ کی بتائی ہوئی کہانی دوبارہ سنائی۔

''سلطانہ بیٹا، میں نے اپنے تجربے سے دیکھا ہے کہ لڑکیوں کے پاس تعلیم اور پروفیشنل تجربہ ضرور ہونا چاہیے۔ اسی سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اچھے برے وقت میں وہ خود اپنی مدد کرسکتی ہیں۔'' دادی ماں نے بڑے رسان سے کہا۔

''لیکن دادی ماں، میری ساری سہیلیوں کی تو ابھی سے شادی یا منگنی ہو رہی ہے۔ وہ سب کہتی ہیں کہ بعد میں وہ روپ نہیں آتا جو اس عمر میں آتا ہے۔'' شبینہ نے دادی سے بڑی معصومیت سے کہا۔

''بیٹا سنجوگ آسمانوں پر بنتے ہیں۔ شادی وقت پر ہی اچھی لگتی ہے لیکن لڑکی کا سمجھدار ہونا بھی ضروری ہے۔ سمجھداری کا عمر سے کم، طبیعت سے زیادہ تعلق ہے۔ میری جان اگر لڑکی معاملہ فہم نہ ہو تو سسرال میں نباہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا پتا سسرال والے کیسے ہوں۔ بہت بھولی بھالی لڑکیوں کو دبا لیتے ہیں۔ ویسے بھی آج تو سب لڑکیاں یوں تیار تھیں کہ بیاہتا اور غیر بیاہتا میں کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ ان پر کیا خاک روپ آئے گا۔ وہ تو پہلے سے ہی ہر تقریب میں دلہن کی طرح سج جاتی ہیں۔'' دادی جان نے سب کو لاجواب کردیا۔

☆☆☆

شبینہ کے بی اے فائنل کے امتحانات شروع ہونے والے تھے اور وہ بڑے انہماک سے لاؤنج میں کپڑا پھیلائے پینٹ کر رہی تھی۔ سلطانہ بیگم نے اسے یہ سب کرتے دیکھ کر کہا۔

''شبینہ! یہ پھیلاوا سمیٹو، اپنے کمرے میں یہ سب کام کیا کرو۔ کچھ خراب ہوگیا تو ہم پر چیخو گی اور تمہارے امتحان کی تیاری کا کیا ہوا؟''

''امی، امتحان تو ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ سوٹ مکمل کرنا ہے۔ آپ کو پتا ہے ناں کہ پیپرز میں یونیفارم پہننا ضروری نہیں ہوتا تو میں یہ سوٹ پہننا چاہتی ہوں۔''

''تمہاری تو مت ماری گئی ہے، امتحانوں کی تیاری کرو..... کپڑوں کی نہیں۔''

''امی میں نے کون سی نوکری کرنی ہے جو اپنا سر کھپاؤں۔''

''تم نے اپنی دادی کی باتیں نہیں سنی تھیں اس دن...... ابھی پھر شروع ہو جائیں گی' چلو اٹھو پڑھو جا کر۔'' چاروناچار اسے اٹھنا ہی پڑا۔

☆☆☆

''شبینہ کے امتحانات ختم ہوگئے ہیں امی جان!'' سلطانہ بیگم ابھی ابھی محلے کے دورے سے لوٹی تھیں۔

''ہاں، سارا دن ٹی وی، فلمیں، شاپنگ، سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود...... بہو اس سے کہو کہ کوئی کمپیوٹر کورس وغیرہ کرلے یا کوئی اور زبان سیکھ لے۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو جو اس کے کام آسکے۔'' دادی ماں نے وہی سبق پھر دُہرایا۔

''امی وہ بیوٹی پارلر کا کورس کرنا چاہتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی دلچسپی ان ہی چیزوں میں ہے۔'' سلطانہ بیگم کو لگا ابھی دادی ماں پھر شروع ہو جائیں گی۔

''خیر یہ بھی تو ایک ہنر ہے۔ ماشاءاللہ ہماری شبینہ کافی ٹیلینٹڈ ہے۔ اس کا شوق بھی ہے، وقت بھی کسی فائدہ مند مصروفیت میں گزرے گا۔ مجھے تو ٹھیک لگا یہ فیصلہ۔ اب ہر کوئی تو پروفیسر یا ڈاکٹر نہیں بن سکتا ناں۔ ہر کسی کو تعلیم میں دلچسپی بھی نہیں ہوتی۔ یہ قدرت کی تقسیم ہے ورنہ بعض پیشوں کے لیے کوئی بھی موزوں نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانے میں تو سنگھار کا کام برا سمجھتے تھے اب تو یہ عیب نہیں۔ بچیاں گھر بیٹھے عزت سے پیسے کماتی ہیں اور گھر بھی ڈسٹرب نہیں ہوتا......''

''جی امی۔'' سلطانہ بیگم اکتاہٹ کا شکار ہوگئی تھیں۔ ''مجھے تو فکر ہے شبینہ کے رشتے کی۔ آج میں رخسانہ کے گھر گئی تھی اس کی بیٹی شبینہ سے سال چھوٹی ہے اس کا بھی رشتہ طے ہوگیا۔ اس کی ہم عمروں کے اتنے اچھے رشتے آ رہے ہیں اور ہماری بیٹی کا ایک بھی نہیں۔''

''ہاں، بیٹیوں کی مائیں پریشان تو ہوتی ہیں ان کے جوان ہونے پر...... ان کی پریشانی جائز بھی ہے پر بیٹے یہ وقت مجھ پر بھی آیا تھا۔ میں نے اپنے تجربے سے سیکھا ہے کہ یہ فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جلد بازی نہ کرنا۔ دیکھ بھال کر نازوں پلی کو رخصت کرنا۔'' سلطانہ بیگم تپ گئیں۔

''امی جان میری لاڈلی بیٹی ہے۔ دیکھ بھال کر ہی شادی کروں گی لیکن اس کے ساتھ کی لڑکیاں بیاہی جائیں اور وہ بیٹھی رہ جائے...... میں تو اس کی شادی جلدی کرنا چاہتی ہوں۔'' دادی ماں کا دل چاہا کہ ان کو سمجھائیں لیکن اپنی بہو کی تیز مزاجی سے وہ واقف تھیں لہٰذا دل میں یہ سوچ کر رہ گئیں۔

''اکثر مائیں عمر کو مسئلہ بنا کر لڑکی کو چلتا کرتی ہیں اور بعد میں پچھتاتی ہیں۔ ابھی لڑکی میں بہت بچپنا ہے..... بجائے اس کی مزید تربیت کرنے کے انہیں شادی کی جلدی ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ ماں کچھ عرصہ لگا کر اس کی خامیوں کو سدھارنے کی کوشش کرے۔'' پھر انہیں خیال آیا کہ سلطانہ بیگم میں تو خود ہی ان خوبیوں کا فقدان ہے۔ وہ خود بھی جلد باز، بڑبولی اور تیز مزاج تھیں۔ اسی لیے ان کی سسرال میں کسی سے نہیں بنتی تھی۔ میکے میں بھی والدین کی وفات کے بعد ان کا آنا جانا کم ہوگیا تھا مگر اس کی بڑی وجہ ان کے اپنے بھائیوں کی زندگی میں مداخلت تھی۔ ان کے بھائی اچھے عہدوں پر فائز تھے اور وہ اس پر بہت فخر بھی کرتی تھیں مگر وہ بھابیوں کی گرہستی میں بہت نقص نکالتیں...... ان

کے جانے پر بے چاری بھابیاں ٹینشن کا شکار ہو جاتیں...... لڑائی بھی ہو جاتی لہٰذا ان کے بھائی کوشش کرتے کہ وہ نہ ہی آئیں۔ بھائیوں کے بیٹے لائق تھے لیکن وہاں تو رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی ایک بہن اور بھی تھیں جو بالکل اُن کی متضاد تھیں۔ وہ انتہائی زیرک اور بلا کی معاملہ شناس تھیں۔ انہوں نے کئی بار بہن کو سمجھایا۔ اس کے علاوہ بیٹی کی تربیت پر بھی توجہ دینے کو کہتیں۔ چند دن تو سلطانہ بیگم پر اثر رہتا مگر پھر وہی ان کی زود رنجی واپس آجاتی۔

☆☆☆

آج شبینہ کی خالہ اور ممانی آئی ہوئی تھیں جبکہ شبینہ نے اچانک اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر میں ہی فلم دیکھنے اور پھر بیکنگ وغیرہ کرنے کا پروگرام بنالیا۔ ساری سہیلیاں جمع ہوگئی تھیں۔

''شبینہ، آج فلم دیکھنا ضروری ہے۔ ہم بڑے کہاں بیٹھیں جا کر؟'' خالہ اور ممانی نے لاؤنج میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی شبینہ سے کہا۔

''خالہ، آپ ٹی وی لاؤنج میں نہ بیٹھیں ناں، ڈرائنگ روم میں چلی جائیں۔''

''شبینہ، بڑوں کا لحاظ بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ آج یہ پروگرام کینسل کردو کل یا کسی اور دن تم فلم ... دیکھ لینا۔'' خالہ بھی غصے میں آگئیں۔ خالہ کے ساتھ ممانی بھی اس کے رنگ ڈھنگ دیکھتی رہیں۔ سارا دن شبینہ اور اس کی سہیلیوں نے خوب اودھم مچایا۔ اس کے بعد کیک اور پیسٹریاں بھی تیار کیں۔ جانے سے پہلے خالہ نے کہا۔

''سلطانہ تم بھی حد کرتی ہو۔ بھابی کے سامنے تمہیں بیٹی کو سمجھانا چاہیے تھا۔ ان کا بھانجا انتہائی اچھے عہدے پر فائز ہے۔ میں تو اسی نیت سے انہیں یہاں لائی تھی اور تمہاری لاڈلی بچوں کی طرح ضد کرتی رہی۔'' سلطانہ بیگم کو پشیمانی سی ہوئی۔

''لیکن باجی بیکنگ کتنی اچھی کی تھی اس نے۔''

''ہاں ...... پر بہو لانی ہے انہوں نے، بیکری تو نہیں کھولنی۔ آج کل کے لڑکوں کی ڈیمانڈ ہے کہ لڑکی سمجھدار ہو تاکہ وہ ان کے خاندان میں ان کی عزت بڑھائے۔ شبینہ میں ابھی بہت بچپنا ہے۔'' سلطانہ بیگم مزید پریشان ہوگئیں۔

☆☆☆

دادی ماں برآمدے میں بچھے تخت پہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ جاتی سردیوں کی دھوپ ان پر پڑ رہی تھی۔ انتہائی طمانیت سے انہوں نے نماز ختم کی۔ لان میں دھوپ کے گھٹتے بڑھتے سائے پھولوں کو نئی جلا بخش رہے تھے، ہر چیز چمک رہی تھی۔ سامنے بیٹھی شبینہ انتہائی انہماک سے اپنے دوپٹے پر کروشیے کی لیس بُن رہی تھی۔ دھوپ نے اس کے گالوں کو لال کردیا تھا۔ وہ ایک کھلا ہوا پھول معلوم ہوتی تھی۔ دادی نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ انتہائی معصومیت سے وہ بال پرے ہٹاتی اپنے کام میں مگن تھی۔ بے اختیار انہیں اپنی پوتی پر پیار آ گیا۔

''کتنی خوب صورت ہے۔ بس ذرا بھولی ہے۔ جانے کون ہے اس کے نصیب میں۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھائے اور خشوع وخضوع سے اس کے نیک نصیب کے لیے دعا کرنے لگیں پھر اس کی جدائی کے خیال سے ان کا دل بھر آیا۔ اسی لمحے انہیں اپنے نواسے کا خیال آیا جو کچھ عرصہ پہلے ہی ایم بی اے کر کے بینک میں جاب کر رہا تھا۔ ''کتنا سعادت مند اور فرمانبردار بچہ ہے۔ مجھے رفعت سے بات کرنی چاہیے۔ آخر اس کی بھتیجی ہے شبینہ، وہ انکار نہیں کرے گی۔'' اسی لمحے سلطانہ بیگم بھی باہر آگئیں۔

''امی جان! بزرگوں کی دعائیں تو ضرور قبول ہوتی ہیں۔ آپ میری شبینہ کے لیے دعا کریں ناں...... اللہ تعالیٰ اس کا رشتہ کسی اچھی سی جگہ

کردے۔'' انہوں نے دادی کو محبت پاش نظروں سے پوتی کو دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''آمین۔'' یہ شبینہ تھی جس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ دادی نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا۔ ماں نے نظروں ہی نظروں میں تنبیہ کی۔

دادی ماں نے اگلے روز ہی رفعت کے گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔ افسر صاحب نے دفتر جاتے ہوئے انہیں ڈراپ کردیا۔ فون کر کے انہوں نے اپنی دوسری بیٹیوں عفت اور فرحت کو بھی وہیں بلالیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تجویز سب کے سامنے رکھی۔ وہ سب کی رائے جاننا چاہتی تھیں۔ رفعت تو بہت خوش ہوئیں۔

''امی میں تو رضا کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں۔ میرے ذہن میں شبینہ آئی تھی لیکن بھابی کے مزاج سے ڈر لگتا ہے۔''

''بیٹی، یہ گھر کا رشتہ ہے لڑکا دیکھا بھالا ہے۔'' دادی ماں نے کہا۔

''ہاں امی اور پھر افسر میرا بھائی ہے۔ بہنوں سے بڑھ کر بھائیوں کو کون چاہتا ہے۔'' رفعت نے جوش سے کہا۔

''رفعت جوش کے ساتھ ہوش کا بھی دامن پکڑو۔ پہلے بھابی جان کی رائے معلوم کرلو۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ اسٹیٹس کو کتنی اہمیت دیتی ہیں۔'' یہ عفت تھی جو سب بہنوں میں امیر تھی۔ اس کا میاں فیکٹری کا مالک تھا۔ اس لیے اس کی خوب چلتی تھی۔ یہ سن کر رفعت خاموش ہوگئیں۔ یہ سچ تھا ان لوگوں کی مالی حیثیت مستحکم نہ تھی۔ ان کے شوہر کا برسوں پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ خود وہ نرس تھیں حالانکہ اب تو وہ ہیڈ تھیں اور سرجنز کے ساتھ آپریشن تھیٹرز میں موجود ہوتی تھیں لیکن سرکاری نرس کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے۔ اسی تنخواہ میں انہوں نے پانچ بچوں کو پڑھایا، لکھایا۔ لڑکیوں کی شادیاں کیں۔ ایک بیٹی کی میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات برداشت کیے۔ رضا کو ایم بی اے کروایا۔ رہتی وہ سسرال کے آبائی گھر میں تھیں جو ذرا پسماندہ علاقے میں تھا مگر یہاں رہ کر بھی بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کی۔ میاں کی پنشن بھی کچھ زیادہ نہیں ملتی تھی۔

''باجی، اچھے رشتوں کا فقدان ہے۔ رضا تو گھر کا بچہ ہے پھر وہ تو اب اسلام آباد میں مکان دیکھ رہا ہے۔''

''ماشاء اللہ!'' سب کے منہ سے نکلا۔

''پر امی مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ پچھلے کتنے سالوں سے بھابی میرے گھر نہیں آئیں۔ وہ یہاں آنا اپنی بے عزتی سمجھتی ہیں۔ رشتہ تو کبھی نہیں کریں گی۔'' رفعت نے پھر کہا۔

''پر میں ایک کوشش تو ضرور کروں گی۔ آخر وہ میری پوتی بھی تو ہے۔ میرا بھی تو حق ہے۔'' دادی ماں نے فیصلہ سنایا۔

واپسی پر رضا انہیں گھر چھوڑنے آیا۔ دادی ماں اسے زبردستی اندر لے آئیں۔ وہ ممانی سے خاصا گھبراتا تھا۔ افسر صاحب گھر پر ہی تھے، انہیں بھانجے کی قابلیت کا اندازہ تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ دادی ماں جان بوجھ کر اسے ٹی وی لاؤنج میں لے آئیں اور سب کے سامنے اس کی نوکری اور تنخواہ کا ذکر کرنے لگیں۔

''ہاں بھئی ایم بی اے کیا ہے .... یہ تو ڈیزرو کرتے ہیں۔'' افسر صاحب نے فخر سے کہا۔

اس وقت سلطانہ بیگم کی بہن اور بہنوئی بھی موجود تھے، وہ کافی متاثر لگ رہے تھے۔ ان کے بہنوئی نے انگلینڈ سے ایم بی اے کیا تھا۔ آج کل وہ قائداعظم یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بزنس کنسلٹنٹ کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ انہوں نے رضا سے ٹھیک ٹھاک انٹرویو لیا بلکہ کئی پروجیکٹ دینے کا بھی وعدہ کرلیا۔ دادی نے آواز

دے کر شبینہ کو لاؤنج میں بلالیا۔ حسبِ معمول وہ نفیس کپڑے اور میچنگ جیولری پہنے ناک میں نتھنی ڈالے پیروں میں پائل پہنے چھم سے آموجود ہوئی۔ رضا نے کئی سال بعد اسے دیکھا تھا وہ حیران رہ گیا۔ دادی نے نواسے کی نظروں میں پسندیدگی پڑھ کر اطمینان کی سانس لی۔ شبینہ حسبِ معمول بولنے میں مشغول تھی۔ اس نے رضا سے بھی کئی سوال کیے۔ سلیقے سے چائے بنائی اور پھر خالو کی دلچسپی رضا سے انٹرویو میں محسوس کر کے وہیں کشن پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی گانا چل رہا تھا اس نے آواز بڑھائی' خالو نے کئی دفعہ ٹوکا لیکن وہ بھی اپنی ہٹ کی پکی تھی۔ البتہ رضا کی نظریں بار بار اس کی طرف بھٹک رہی تھیں۔ وہ مزے سے پاؤں ہلاتے ہوئے سیب کھا رہی تھی اور گانا بھی انجوائے کر رہی تھی۔ رضا کے جاتے ہی سلطانہ بیگم کے بہنوئی اس کی شان میں رطبُ اللسان ہوگئے۔

''افسر صاحب آپ کا بھانجا ماشاء اللہ خوب ہے۔ اس لڑکے میں ترقی کرنے کی بہت صلاحیت ہے۔ یہ لڑکا بہت آگے جائے گا۔ لگتا ہے معلومات کا ایک خزانہ ہے اس کے پاس۔''

''لیکن بھائی صاحب شاید آپ کو معلوم نہیں۔ بہت ہی معمولی علاقے کا رہنے والا ہے۔'' سلطانہ نے پنڈی کے ایک مضافاتی علاقے کا نام لیا۔ سلطانہ بیگم کو اس کی تعریف ایک آنکھ نہ بھائی۔

''ماشاء اللہ یہ تو قابلِ تحسین بات ہے کہ اس نے بُرے ماحول کا اثر قبول کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ اچھے ماحول میں تو ہر کوئی پڑھ جاتا ہے لیکن رضا کی طرح کے لوگ ہزاروں میں ایک ہوتے ہیں۔'' بہنوئی صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔

''اس کی ماں نے بہت محنت مشقت کی ہے۔'' پھر دادی ماں نے رفعت کی جدوجہد کی داستان سنائی۔ سب لوگ کافی متاثر ہوئے۔

بیچ میں شبینہ یکدم بول اٹھی۔ ''پر پھپو کی فیملی میں خوب صورتی کی کمی ہے۔ رضا نے کالا سوٹ پہنا ہوا تھا اور پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ سوٹ کہاں سے شروع ہو رہا ہے اوپر سے لال ٹائی...... کوئی ڈریس سینس تو ہے ہی نہیں۔'' اس کے اتنا بے تکا بولنے پر سب شرمندہ ہوگئے۔

''شبینہ! یہ برتن اٹھاؤ اور کچن میں لے جاؤ۔'' خالہ نے غصے سے کہا۔ محفل اس کے بعد برخاست ہوگئی۔

دادی ماں کا موڈ شبینہ کے تبصرے کے بعد قدرے مکدّر ہوگیا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے چند روز بعد افسر صاحب کو اپنے کمرے میں بلایا۔

''افسر بیٹے! تمہیں معلوم ہے ناں کہ شبینہ اب جوان ہوگئی ہے۔ سلطانہ اس کے رشتے کے سلسلے میں کافی پریشان ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ باہر نظر ڈالنے سے پہلے اپنے گھر کو ٹٹولنا چاہیے۔'' افسر صاحب سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

''رفعت تمہاری بہن ہے۔ لاتعداد تکالیف اٹھانے کے بعد اس نے بچوں کو اچھے مقام پر پہنچایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے بھائی ہونے کا فرض اس طرح نہیں ادا کیا جس طرح تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ خیر یہ اس کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اپنے بھائی سے رشتہ مضبوط کرنا چاہتی ہے۔ رضا میں جو خوبیاں ہیں وہ تم پر آشکار ہو چکی ہیں۔ وہ بے حد ذمے دار اور فرمانبردار لڑکا ہے اور بھلے کردار کا مالک ہے۔'' افسر صاحب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سلطانہ بیگم جو کچن سے فارغ ہو کر کمرے کے باہر سے گزر رہی تھیں اندر داخل ہوگئیں۔

''امی جی! میں بھی اس گھر کی فرد ہوں۔ شبینہ کی ماں ہوں۔ آپ مجھ سے تو پوچھیے......''

''بہو! میں تم سے پوچھنے ہی والی تھی لیکن پہلے

بھائی کو بہن کا پیغام دینا چاہتی تھی۔'' دادی ماں جلدی سے بولیں۔

''اچھا؟'' سلطانہ بیگم استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔ ''نند نے اپنا رنگ دکھا ہی دیا۔ بالا بالا اپنا معاملہ طے کرنا چاہتی ہے۔ کیا میری اس گھر میں اتنی بھی حیثیت نہیں......''

''سلطانہ خاموش ہو جاؤ۔ معاملے کو اتنا نہ الجھاؤ۔ امی نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔'' افسر صاحب نے معاملہ ختم کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے معلوم ہے آپ بھی اپنی ماں، بہن کی ہی سائڈ لیں گے لیکن سب اچھی طرح سن لیں، میں اپنی بیٹی کی شادی اس گھٹیا علاقے اور اس پانچ مرلے کے معمولی گھر میں ہرگز نہیں کروں گی۔ اس کی سہیلیاں بیاہی جائیں جرمنی اور امریکا اور وہ جائے گاؤں میں۔'' وہ کچھ دیر رک کر بولیں۔ ''ساس کیا کرتی ہے؟ ہم بتائیں گے کہ وہ نرس ہے۔ لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے پیسے لیتی ہے۔''

''بکواس بند کرو، وہ میری بہن ہے۔ بہت مقدس پیشہ ہے اس کا۔ اس نے نوکری کی اس لیے کہ اسے اپنے پانچ بچوں کا پیٹ پالنا تھا۔ ہاتھ نہیں پھیلایا اور تم نے کتنی مدد کی اس کی۔ تم بھی تو بھابی تھیں ناں...... میں نے کون سا فرض بھائی ہونے کا نبھایا۔'' افسر صاحب شدید غصے میں آگئے۔

''انہوں نے بھڑکایا ہے آپ کو میرے خلاف۔'' سلطانہ بیگم نے ساس کی طرف اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں یہ شور وغل سن کر بچے بھی وہاں جمع ہوگئے۔ وہ سب پریشان تھے۔ سلطانہ بیگم نے اپنی حمایت کے لیے فوراً بیٹوں کی جانب رخ کیا۔

''سنو تمہارے ابو کیا کہہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں شبینہ کا رشتہ رضا سے کردو۔''

''میں نے کچھ ایسا نہیں کہا......'' افسر صاحب

نے وضاحت دی۔

"ایک منٹ، ایک منٹ، یہ رضا کون ہے؟" بڑے بیٹے عامر نے فوراً پوچھا۔

"تمہاری پھپو رفعت کا بیٹا۔" سلطانہ بیگم نے چبا چبا کر بتایا۔

"کیا...... وہ اس محلے کا بیکار، آوارہ لڑکا...... پھپو کا گھر دیکھا ہے آپ نے...... ان کے بچے دیکھے ہیں آپ نے...... ابو کیا ہو گیا ہے؟"

"تم نے ان لوگوں کو دس سال پہلے دیکھا تھا۔ اب وہ ایک نامور ادارے سے ایم بی اے ہے اور بہت قابل ہے۔ بینک میں افسر ہے وہ۔" باپ نے وضاحت پیش کی۔

"پھر بھی ابو رہنے والے تو وہ لوگ تھرڈ کلاس علاقے کے ہیں۔ ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے۔ ان کی سوچ اور ہماری سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ابو ہمارا رہن سہن بہت مختلف ہے۔ وہ لوگ زمین پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور ہم کانٹے چھری سے کھانے والے لوگ ہیں۔ آپ بہن کی محبت میں بیٹی کو قربان نہ کریں۔" شبینہ جو ابھی تک شاک میں تھی زور زور سے رونے لگی۔ افسر صاحب گھبرا گئے۔ انہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"رو کیوں رہی ہو، میں کچھ ایسا نہیں کر رہا جو بھی ہوگا تمہاری مرضی سے ہوگا۔"

"ابو مجھے ان لوگوں میں شادی نہیں کرنی۔ رضا کی پرسنیلٹی کچھ بھی نہیں ہے۔ کالا، سوکھا سا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پتلی سی آواز۔ ابو سہیلیوں میں میری انسلٹ ہوگی پھر اس کی بہنیں بھی ویسی ہی ہیں۔" وہ ہچکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے بیٹا، ہم کچھ بھی ایسا نہیں کریں گے۔ اب رونا چھوڑو۔" افسر صاحب نے بیٹی کو تسلی دی۔ دادی ماں کا تو سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو گالوں پر آ رہے تھے۔ ان کے اتنے قابل سیلف میڈ نواسے کی اتنی توہین...... ان کا دکھ سے برا حال تھا لیکن وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھیں۔

دونوں گھروں میں اس واقعے کا چرچا تھا۔ عامر اور سہیل، شبینہ کو رضا کا نام لے کر چھیڑتے۔ وہ غصے سے بے قابو ہو کر انہیں مارنے دوڑتی۔

"بینو ہم تم سے ملنے آئیں گے تو گاڑی کہاں کھڑی کریں گے؟ گلی تو بہت تنگ ہے۔" سہیل کہتا۔

"بھئی ہم تانگے میں جایا کریں گے اس طرح پارکنگ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" عامر کہتا۔ وہ اور چڑ جاتی۔ دادی ماں نے اس واقعے کے بعد سے کمرے سے نکلنا کم کر دیا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا تھا۔ ان کی خبر گیری کے بہانے تینوں بیٹیاں بھی آئی تھیں۔ دراصل ان کی جانب سے رشتے کی کوئی خبر نہ پا کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ شبینہ کو سلطانہ بیگم نے کچھ روز کے لیے خالہ کے گھر بھیج دیا تھا۔ تینوں نندوں کو ان کے رویے سے تمام صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ماں کی خاموشی بھی بہت کچھ بتا رہی تھی۔ رفعت کو بہت دکھ ہوا۔ اس دن رضا سے انہوں نے کُرید کُرید کر ملاقات کی تفصیلات معلوم کی تھیں۔ افسر صاحب اور ان کے برادرِ نسبتی کے رویے نے ان کے اندر امید کے دیپ روشن کر دیے تھے لیکن یہاں بھابی کے سرد رویے نے سارے چراغوں کو بجھا دیا۔ وہ ملول ہو کر واپس چلی گئیں۔

☆☆☆

بی اے کیے ہوئے شبینہ کو دو سال ہو گئے تھے۔ عامر نے ایم بی بی ایس کر کے اب ہاؤس جاب شروع کر دی تھی۔ سہیل کی گرافک ڈیزائننگ کی ڈگری بھی مکمل ہو گئی تھی۔ سلطانہ بیگم نے کئی جگہ رشتوں کے لیے کہہ رکھا تھا۔ کچھ آئے بھی لیکن انہیں پسند نہیں آئے۔ وہ بہت اونچی امیدیں لگائے ہوئے تھیں کسی لڑکے کا رنگ پسند نہیں آتا تھا تو کسی کے نقش، کوئی نوکری اچھی نہیں کرتا تھا تو کسی کے گھر والے مزاج دار تھے۔ خامیاں نکالنے میں دونوں بیٹے پیش پیش رہتے۔ وہ تو لڑکے والوں کے جانے کے بعد ان کا اتنا مذاق اڑاتے کہ سب کا دل برا ہو جاتا۔ کئی دفعہ خالہ نے سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی کا مذاق اڑانا، توہین آمیز فقرے کہنا اچھی ذہنیت کی دلیل نہیں لیکن سلطانہ بیگم کے اندر پلا ہوا احساسِ برتری انہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔ البتہ پھپو عفت کے گھر وہ کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ ان سے امپریس بھی تھے لیکن واپس آ کر ان کے بچوں کا بھی خوب مذاق اڑاتے۔ افسر صاحب یہ سب سنتے رہتے۔ دادی ماں البتہ رنجیدہ ہو کر جواب دیتیں تو ان سے بحث شروع کر دیتے۔ ان حالات میں شبینہ کی زود رنجی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ کسی کی شادی سے واپس آتی تو ڈپریس ہو جاتی۔ ان کی خالہ کا بہت آنا جانا تھا ان کے گھر...... وہ یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک دن بہن کو اپنے گھر بلایا اور کہنے لگیں۔

"تم پتا نہیں کس دنیا میں رہ رہی ہو۔ میں تمہیں شبینہ کے رشتے کے سلسلے میں پریشان دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ جب گھر ہیرے کی جگمگاہٹ سے بھرا ہوا ہے تو تم باہر کوئلے کیوں تلاش کر رہی ہو؟"

"کیا مطلب! باجی لگتا ہے آپ آج کل ڈرامے بہت دیکھتی ہیں۔ اللہ جانے کیا کہہ رہی ہیں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" سلطانہ بیگم کنفیوزڈ ہو گئیں۔

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تمہیں رفعت کا بیٹا رضا نظر نہیں آتا؟"

"کیا مطلب...... کیا کسی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

"کون کہتا! میں خود عقل بھی رکھتی ہوں اور آنکھیں بھی۔ پوری دنیا اس کی تعریف کر رہی ہے۔ اب تو وہ تمہارے بہنوئی کے ساتھ visiting lecturer ہو گیا ہے۔ تمہارے ہی گھر میں تو ملاقات ہوئی تھی اور اب وہ تو باہر کے پروجیکٹس پر کام کر رہا ہے۔"

"پر باجی کوئی پرسنالٹی بھی تو ہو۔" سلطانہ بیگم سے رہا نہ گیا۔

"تمہیں امی کی بات یاد نہیں جو ہمارے رشتوں کے سلسلے میں کہا کرتی تھیں کہ لڑکا شریف اور کماؤ پوت ہو اور وہ تو اتنا ذمے دار لڑکا ہے اب اپنا گھر بھی بنوا رہا ہے۔ بہنوں کو بھی بیاہا ہے۔ بھائیوں کا خرچ بھی اٹھا رہا ہے۔ نیک ہے، کوئی بری عادت نہیں ہے اس میں۔"

"پر باجی شبینہ اس علاقے میں جانے پر تیار نہیں ہوگی۔"

"شبینہ کو تو تم نے مہارانی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ سسرال جائے گی تو کیا، کیا تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ سو اچھا سو برا ہوتا ہے۔ انسان کو اس سب کی عادت ہونی چاہیے۔ پھر وہ لوگ جلد ہی اپنی نئی کوٹھی میں اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے۔" انہوں نے بہن کو رسان سے سمجھایا۔

"پر باجی، ہمارا لائف اسٹائل بہت مختلف ہے۔ وہ اور طرح کے ہیں۔ ان کے طور طریقے غریبانہ ہیں۔" انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"غریبانہ ہیں ناں کوئی ہندوانہ تو نہیں پھر شبینہ نے سارا گھر چلانا ہے...... اس لڑکے میں ترقی کرنے کا جذبہ ہے۔ بدل جائے گا۔ ویسے میں گئی تھی ان کے گھر...... اچھا بھلا گھر ہے۔ سادہ لوگ ہیں۔ بہنیں پڑھی لکھی اور پروفیشنل عہدوں پر ہیں۔ اچھے گھرانوں میں ان کی شادیاں کی ہیں، مجھے تو کوئی خامی نظر نہیں آئی۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے انکشاف کیا۔

"آپ کیا کرنے گئی تھیں وہاں؟" حسبِ عادت سلطانہ بیگم برہم ہوگئیں۔

"تمہارے بہنوئی لے کر گئے تھے۔ عید پر ہماری دعوت کی تھی رفعت نے۔" انہوں نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"اور ہم مر گئے تھے کیا؟" سلطانہ بیگم کو اور غصہ چڑھا۔

"دراصل ہم خود ہی جانا چاہتے تھے، اس لیے رفعت نے کھانے کا اہتمام کرلیا۔" وہ صفائیاں دینے لگیں۔ اچھی خاصی بات بگڑ گئی تھی۔

☆☆☆

عامر نے ہاؤس جاب کرتے ہی انگلینڈ جانے کی کوششیں شروع کردیں کہ مزید پڑھائی بھی کرے گا اور وہیں سیٹل ہوجائے گا۔ افسر صاحب تو نہیں چاہتے تھے لیکن سلطانہ بیگم اس کی حوصلہ افزائی کررہی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے اپنے میکے والوں کو بتاتیں کہ ان کی لائق فائق اولاد کو انگلینڈ والے بلا رہے ہیں۔ جلد ہی عامر اسکاٹ لینڈ روانہ ہوگیا۔ اب سلطانہ بیگم نے شبینہ کے رشتے کے لیے مزید سرگرمی دکھانی شروع کردی۔ ان کا معیار خاصا بدل گیا تھا۔ اب وہ شبینہ کی شادی باہر کرنا چاہتی تھیں۔ آخر باہر جانے کا رعب ہی کچھ اور ہے۔ شبینہ کی عمر زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن گھر کی آرام دہ زندگی کی وجہ سے موٹاپا چڑھ رہا تھا۔ اس وجہ سے اپنی عمر سے زیادہ لگنے لگی تھی۔ اسے دیکھ کر انہیں اپنے کہے ہوئے فقرے یاد آجاتے کہ چھوٹی عمر کی دلہن ہی خوب صورت لگتی ہے۔ وہ کئی وظیفے بھی پڑھ رہی تھیں۔

☆☆☆

موسمِ سرما کا آغاز تھا۔ کئی دنوں سے موسم ابر آلود تھا اور بارش ہورہی تھی۔ افسر صاحب چھٹی پر تھے۔ ان کو بخار ہورہا تھا اور جسم درد کی شدت سے ٹوٹتا محسوس ہوتا تھا۔ ایک دن تو طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ اسپتال لے جانا پڑا۔ معلوم ہوا کہ شدید جوڑوں کا درد لاحق ہوگیا ہے...... علاج سوائے پین کلرز کے کچھ نہیں۔ وہ گھر واپس تو آگئے لیکن فزیوتھراپسٹ کے پاس جانا پڑتا تھا۔ سہیل کو لاہور کے ایک پروڈکشن ہاؤس میں جاب مل گئی تھی۔ اسے ہر حال میں جانا ہی پڑا۔ گھر میں گاڑی کسی اور کو چلانا ہی نہیں آتی تھی اور کسی ڈرائیور کا بھی بندوبست نہیں ہورہا تھا ایسے میں بے چارہ رضا اپنے دفتر سے چھٹی لے کر آتا اور ماموں کو لے کر جاتا۔ افسر صاحب کو اپنے گھر والوں کی باتیں اس کے متعلق یاد آتیں تو شرمندہ ہوجاتے۔ کبھی عفت کا ڈرائیور بھی لے جاتا۔ ان کے گھر والوں نے بہت ساتھ نبھایا۔ انہیں ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ سلطانہ بیگم سے پہلے شبینہ کو اعتماد میں لینا چاہتے تھے۔ شبینہ کی سہیلیاں اب اپنے اپنے گھر کی تھیں۔ اس کا باہر نکلنا کم ہوگیا تھا۔ البتہ شاپنگ کا شوق ویسے کا ویسا ہی تھا۔ باورچی خانے کا انتظام اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھر میں جز وقتی ملازمہ بھی تھی مگر شبینہ چونکہ گھر میں زیادہ رہتی تھی۔ اس لیے اب گھرداری بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے جہیز کا بہت ارمان تھا۔ بے شمار برتن...... کپڑے اور دیگر سامان جمع کرلیا تھا دونوں ماں بیٹی نے...... افسر صاحب اب شبینہ کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ انہی دنوں انہیں رضا کی بات طے ہونے کا پتا چلا۔ سلطانہ بیگم کے بہنوئی نے اپنی بھانجی سے اس کی منگنی کروائی تھی۔ انہوں نے ہی لڑکی کو باپ کی طرح پالا تھا کہ اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ انتہائی خوب صورت اور دھیمے مزاج کی لڑکی تھی۔ دادی ماں خوش بھی تھیں اور اداس بھی۔ انہیں بیٹے کی مجبوریوں کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لڑکی جس کا نام سارہ تھا کافی جائداد کی مالک تھی۔ دادی ماں کا دل خوش ہوگیا تھا اس سے مل کر۔

شبینہ کے چڑچڑے پن میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ اپنے رشتوں کے واپس لوٹنے کا الزام سلطانہ بیگم کو دیتی تھی جو کسی کو بھی اپنے معیار کا نہیں سمجھتی تھیں۔ انہی دنوں رشتہ کروانے والی نے انگلینڈ سے آئے ایک رشتے کے متعلق بتایا۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مہمانوں کی آمد کی تیاری ہونے لگی۔ مہمان میزبانوں سے بھی بڑھ کر احساسِ برتری کا شکار تھے۔ انگلینڈ میں رہنے کا غرور ان پر چھایا ہوا تھا۔ لڑکا، فرید، آئی ٹی کی فیلڈ میں تھا۔ اس کی تین بہنیں اور ایک بھائی اور بھی تھا۔ ایک بہن کی شادی خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ فیصل آباد کے رہنے والے یہ لوگ خاندان سے باہر شادی کرنے کے خواہش مند تھے بقول ان کے انگلینڈ کے ماحول میں رچنے کے لیے وہ ماڈرن لڑکی بیاہنا چاہتے تھے۔ فرید کی ماں دیکھنے میں دیہاتی لگتی تھیں۔ پتلی دبلی، چھوٹے سے قد کی عورت۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ انگلینڈ میں گزشتہ تیس برس سے مقیم ہیں۔ وہ سب لوگ آپس میں اپنی مادری زبان بولتے تھے۔ اردو ان میں سے کوئی بھی نہیں بول سکتا تھا۔ البتہ بہن بھائی آپس میں انگریزی بولتے تھے۔ شبینہ کے گھر والوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ وہ لوگ بھی آپس میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔

"آپ بتائیں ناں کیا، کیا جائے؟" سلطانہ بیگم نے مہمانوں کے جاتے ہی بات شروع کردی۔

"بھئی، جلدی نہ کرو، سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے۔" افسر صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔

"عامر سے کہو وہ وہاں پتا کرے کیسے لوگ ہیں۔ جو کچھ وہ لوگ بتا رہے ہیں وہ سچ ہے بھی یا نہیں۔" خالہ نے رائے دی۔

"ہاں، وہ تو معلوم کرے گا ہی پر بالکل انجانے لوگ ہیں دل ڈرتا ہے۔" دادی ماں بولیں تو سلطانہ بیگم اور شبینہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

"پر جلدی نہ کرنا یہ سوچ کر کہ لڑکی کی عمر نکل جائے گی۔ اپنا اطمینان کرنا بہت ضروری ہے۔" دادی ماں کو سو طرح کے دھڑکے لگے ہوئے تھے۔

عامر ماں کے کہنے پر برمنگھم چلا تو جاتا لیکن فرید کی ساری فیملی ابھی پاکستان میں ہی تھی۔ سلطانہ بیگم کے چند رشتے دار برمنگھم میں رہتے تھے لیکن وہ لوگ انہیں اتنی اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ ویسے بھی وہ برمنگھم سے باہر کے علاقے وال سال میں رہتے تھے۔ لڑکے والوں نے البتہ ہاں کردی تھی اور انہیں جلد... ہی واپس بھی جانا تھا۔ افسر صاحب اور سلطانہ بیگم فیصل آباد جاکر ان کا گھر بھی دیکھ آئے تھے۔ عام سے محلے میں، عام سا گھر، خاندان بہت تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ عورتیں سیدھی سادی تقریباً ان پڑھ تھیں۔ مرد حضرات کی پرچون یا منیاری وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ رہن سہن سلطانہ بیگم کے گھر کے مقابلے میں بہت سادہ تھا۔ دونوں میاں بیوی خاصے مایوس ہوئے وہاں جاکر۔ واپسی پر سلطانہ بیگم یہی کہتی رہیں۔

"بھئی فرید کے گھر والے تو انگلینڈ میں رہتے ہیں۔ باقی خاندان والے گنوار اور ان پڑھ ہیں۔ تبھی تو باہر سے لڑکی لا رہے ہیں۔ اسلام آباد کی لڑکی پھر ماڈرن اور تعلیم یافتہ ہوگی۔ یقیناً لڑکے والے اپنا معیار بدلنا چاہتے ہیں اور وہ ہماری لڑکی کی قدر بھی کریں گے کہ اتنی پڑھی لکھی، اتنی کلچرڈ، اتنے اچھے گھر سے آئی ہے۔ ہمارے طور طریقے کتنے ماڈرن ہیں۔" سلطانہ بیگم اپنے ہی غرور میں تھیں۔ باقی تفصیلات عامر کے وہاں سے ہوکر آنے پر طے ہونا تھیں۔ عامر چلا تو گیا تھا لیکن صرف ایک دن کے لیے جونیئر ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے نو سے سترہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اپنے ملک کا آرام کہاں صرف والدین کے کہنے پر وہاں چلا گیا مگر واپسی پر وہ بھی کافی زیادہ خوش نہیں تھا مگر ماں، باپ کو اس نے تسلی دے دی۔

"لڑکے کی جاب اچھی ہے۔ سیدھے سادے لوگ ہیں گو مکان کافی بڑا ہے لیکن سلیقے طریقے کی تھوڑی سی کمی ہے۔"

عامر کے اس تجزیے کے بعد شبینہ کے گھر والوں نے ہاں کردی شادی کے لیے ماہ جولائی کی تاریخ طے ہوئی۔ شبینہ کو سخت غصہ آیا۔

"اتنی گرمی میں شادی کا کیا خاک مزہ آئے گا۔ میک اپ بھی خراب ہوجائے گا۔" لیکن لڑکے والوں کو یہی ماہ سوٹ کرتا تھا سو ان کی ماننا پڑی۔ لڑکے والوں نے کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد میں کرائے پر گھر لے لیا تھا۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شبینہ نے ڈھیر سارے زیورات اور کپڑے بنوائے۔ ان کے گھر کی پہلی شادی تھی۔ وہ خوب دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے۔ افسر صاحب کی ساری جمع پونجی خرچ ہو چکی تھی۔ مہنگے سے مہنگے جوڑے بنوائے گئے۔ سلطانہ بیگم نے سمدھن اور ان کی بیٹیوں کو تحفے کے طور پر سونے کے جھمکے دیے۔ آخر سمدھیانہ انگلینڈ میں تھا۔ شادی اور مہندی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی پھر ولیمہ بھی اسی ٹکر کے ہوٹل میں کیا گیا۔

شادی پر لڑکے والوں کو دیکھ کر جہاں دوسرے لوگوں میں چہ مگوئیاں ہوئیں وہیں سلطانہ بیگم کی نندیں تو شاکڈ رہ گئیں۔ وہ کسی بھی طور سلطانہ بیگم کے ہم پلہ لوگ نہیں تھے۔ لڑکیاں بے شک انگلینڈ سے آئی تھیں اور پٹر پٹر انگریزی بول رہی تھیں مگر لہجہ ان کا اپنے علاقے کا ہی تھا۔ کپڑے بھی جدید فیشن کے نہ تھے۔ ان کے مقابلے میں یہاں کی لڑکیاں زیادہ اسٹائلش لگ رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر رفعت نے ماں سے کہا۔

"امی! بھابی نے یہ کیا، کیا ہے؟" دادی ماں نے سر جھکا لیا۔ "امی آپ کو پتا ہے کہ جو باتیں بھابی ہمارے متعلق کرتی رہی ہیں اور ہم جیسے لوئر مڈل کلاس لوگوں کے متعلق جو وہ کہتی رہی ہیں وہ آج خدا نے ان کے سامنے لا کھڑا کیا ہے...... رضا کالا ہے، ہم لوگ کم صورت اور کم حیثیت ہیں...... چھوٹے محلے میں رہتے ہیں، بولنا چالنا نہیں آتا...... رہن سہن بھی فیشن ایبل نہیں ہے۔ یہی سب کہہ کر انہوں نے میرے رضا کو مسترد کیا تھا ناں...... آپ نے تو یہ سب کچھ چھپایا لیکن زمانے والوں کی زبانیں سب کچھ اگل دیتی ہیں۔" رفعت غم و غصے سے لال پیلی ہورہی تھیں اور عفت بہن کی حالت دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"امی، آپ تو اپنے بیٹے، بہو کا پردہ رکھتی رہیں لیکن بھابی نے اپنے میکے میں جو ہماری کم حیثیت، کم شکلی کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا ذرا میں ابھی بھابی کو ان کی اوقات یاد دلاتی ہوں۔" اب عفت بھری محفل میں باقاعدہ لڑنے چلی تھیں لیکن پھر دونوں بہنوں نے روک لیا کہ خدا کا فیصلہ انسان کو بہت کچھ سمجھا دیتا ہے۔

اُدھر سلطانہ بیگم کے میکے والوں پر یہ رعب پڑا کہ لڑکے والے انگلینڈ سے آئے ہیں۔ بہت بڑا بنگلا ہے اس کا۔ لڑکا آسٹن یونیورسٹی برمنگھم کا تعلیم یافتہ ہے۔ البتہ لڑکے کے چھوٹے قد اور تیزی سے کم ہوتے بالوں پر شبینہ کی سہیلیوں نے بہت سے گانے بنائے وہ تو خیر ہوئی کہ لڑکے والوں کو زیادہ سمجھ نہیں آئی ورنہ لڑائی ہوجاتی تھی البتہ شبینہ بہت جز بز ہوئی۔ افسر صاحب ماں سے مستقل نظریں چُرا رہے تھے۔ انہیں اپنے بھانجے کی کی گئی توہین یاد تھی۔

شادی کے دو ہفتے بعد فرید کو واپس چلے جانا تھا۔ اس نے ویزے کے لیے اپلائی کردیا تھا۔ شبینہ کے چہرے کا گلال دیکھ کر ماں، باپ کو اطمینان ہوجاتا۔ دو ہفتے تک وہ لوگ شمالی علاقہ جات گھومتے رہے۔ فرید اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ شبینہ کو گھوما پھرا رہا تھا اور خوب شاپنگ کروا رہا تھا۔ شبینہ تو جیسے ہوا میں اڑ

رہی تھی۔ فرید صاف اردو بولنے کی کوشش کرتا تو شبینہ کی ہنسی نکل جاتی۔ اس نے شبینہ کو انگلینڈ کے بہت سے قصے سنائے۔ شبینہ کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ہفتے بعد جب فرید واپس چلا گیا تو شبینہ بہت اداس ہوگئی، وہ اسے بہت مِس کر رہی تھی۔ شادی کے بعد یہ پندرہ دن انہوں نے خوب انجوائے کیے تھے اور یہی خوب صورت یادیں اسے مزید اداس کر رہی تھیں۔ فرید بھی شاید اسی کیفیت کا شکار تھا۔ جاتے ہی اس نے شبینہ کو تفصیلی فون کیا۔ وہ مدھر کیفیت میں مبتلا تھی۔ ہر طرف فرید کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔ گرمیوں کے دن بہار کے دن معلوم ہوتے تھے۔ وہ انگلینڈ جانے کے سپنوں میں کھوئی رہتی۔ یہ سپنا اس وقت ٹوٹا جب اس کا ویزا مسترد ہو گیا۔ وجہ تھی فرید کا کم ٹیکس بھرنا، ذاتی مکان نہ ہونا اور مستقل نوکری کی کمی...... اس نے غصے میں آکر فرید کو فون کیا تو وہ اور پریشان ہوگیا۔

''شبینہ! ہائی کمیشن کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو ٹیکس بھی دیتا ہوں، اپنی نوکری کے کاغذات درست بھی لگائے تھے اور مکان امی، ابو کا ہے۔'' پورے گھر میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شبینہ بار بار سوچتی کہ اگر میں یہیں رہ گئی تو......

''بہو، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ انجانے لوگ ہیں۔ سوچ سمجھ کر رشتہ کرنا۔'' دادی ماں کو بھی موقع مل گیا۔

☆☆☆

انہی چکروں میں کئی ہفتے گزر گئے۔ موسم سرما آتے ہی افسر صاحب کی طبیعت پھر خراب ہونے لگی تھی۔ سب گھر والوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ انہی دنوں فرید کی نانی انگلینڈ سے فیصل آباد آئی ہوئی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ شبینہ ان سے آکر مل لے۔ شبینہ کبھی نہ جاتی لیکن کچھ کاغذات پر اس کے دستخط چاہیے تھے جو نانی کے پاس تھے۔ شبینہ اکیلی نہیں جانا چاہتی تھی۔ چاروناچار سلطانہ بیگم کو اس کے ساتھ جانا پڑا لیکن عین روانگی کے وقت افسر صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی لہٰذا سلطانہ کا جانا تو ملتوی ہوگیا لیکن اس کا جانا ضروری بھی تھا۔ رفعت آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی تھیں۔ سلطانہ بیگم نے دل کڑا کرکے ان سے درخواست کی کہ وہ شبینہ کے ہمراہ چلی جائیں۔ انہیں اپنی انا کو سرنگوں کرنے میں بہت وقت ہوئی اور بار بار شبینہ کو سناتی رہیں کہ اولاد کے ہاتھوں کیسے کیسے لوگوں کو منہ لگانا پڑ رہا ہے۔ رضا نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور کا انتظام کر دیا تھا۔ فیصل آباد جا کر رفعت نے انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ وہ خواب میں بھی بھابی کا ایسا سمدھیانہ نہیں سوچ سکتی تھیں، کچی کچی گلیوں میں بنا چھوٹا سا گھر کچا صحن اور جدید سہولیات سے بے نیاز معمولی سامان...... ان لوگوں کی وہاں خوب پذیرائی ہوئی لیکن پھپھو کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے تھے انہیں دیکھ کر وہ شرمندہ ہوگئی۔ رفعت نے بھی بھتیجی کا شرمسار چہرہ دیکھ لیا تھا۔ انہیں بہت دکھ ہوا۔ اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔ وہ تو کم عقل ہے، زندگی نے اسے گرم ہوا سے دور رکھا۔ وہ تو نا تجربہ کار تھی۔ یہ تو ماں، باپ کا فرض تھا کہ جیسی زندگی اسے دی تھی اس کے مطابق اس کا رشتہ بھی کرتے لیکن مقدر کے کھیل عجیب ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی بیٹی کا رشتہ فقیر کے ساتھ کرتے ہیں، وہ مہینوں میں وزیر بن جاتا ہے۔ کبھی وزیر کے ساتھ کرتے ہیں تو وہ فقیر بن جاتا ہے۔ پھر افسر صاحب نے دنیا دیکھ رکھی تھی کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ شبینہ نے جارجٹ کا ہلکے رنگوں والا خوب صورت سا سوٹ پہن رکھا تھا جسے گھر کی عورتیں بار بار چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ فرید کی نانی ریشمی کپڑے پہنے، مہندی سے رنگے بالوں کی پتلی سی چوٹی بنائے مسلسل انگلینڈ کی تعریفیں کرنے میں مشغول تھیں اور وقفے وقفے سے بڑے رعب کے ساتھ

ڈانٹ ڈپٹ کررہی تھیں جبکہ اس کی دادی انتہائی دھیمے مزاج کی سوبر خاتون تھیں۔ انتہائی شائستہ اور نرم لہجے میں بات کرتی تھیں، مطالعے کا بھی انہیں بہت شوق تھا۔ ایسی ہی اس کی تینوں پھوپیاں تھیں۔وہ یہاں سب کے ساتھ گھل مل گئی تھیں۔ آخر بھتیجی کی سسرال تھی۔

رفعت کو یہاں کا واش روم دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ انہیں بھتیجی کی نفاست پسندی کا شدت سے احساس ہوا...... کس دل سے شبینہ نے وقت گزارہ ہوگا وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئیں۔ گھر واپس پہنچ کر شبینہ نے سب کے سامنے تو ضبط سے کام لیا لیکن جب ماں نے دیگر تفصیل پوچھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ گھبرا گئیں پریشان ہوگئیں۔ اس نے روتے ہوئے سب بتایا۔

”میرا دل تو چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں وہاں سے، کہاں شادی کردی آپ نے میری؟ آپ نے تو ان کا گھر دیکھا تھا ناں......“ سلطانہ بیگم کو حسبِ عادت غصہ آگیا۔

”ہم نے تمہاری کیا شادی کرائی، تم نے تو خود شادی، شادی کی رٹ لگا رکھی تھی۔ ہم رشتوں کو جانچتے تھے تو تمہیں اعتراض ہوتا تھا کہ ہم choosy ہیں۔ یہ رشتہ نہ کرتے تو تم ہمیں ہی الزام دیتیں......“

اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھا کر حیرت سے ماں کو دیکھا۔ یہ وہی ماں تھی جو ہیکلی کے سامنے ذرا سی سرزنش کرنے پر ساس کو ڈانٹ دیتی تھیں اب کیسے بدل گئیں وہ۔ افسر صاحب نے جو بیوی کی اونچی آواز سن کر وہیں آگئے تھے...... بیٹی کا دکھ اس کے چہرے پر پڑھ لیا تھا۔

”سلطانہ، شبینہ کو حوصلے کی ضرورت ہے، اسے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ یہ وقت ہے اسے زندگی کے حقائق بتانے کا۔ تم نے شادی کے لیے سامان تو بہت جمع کیا لیکن جو پند ونصائح جو حقائق بتانے ضروری تھے ان سے کوتاہ نگاہی کی۔ خدا کے لیے اب تو وقت کی نزاکت سمجھو۔ میری ماں نے لاکھ کہا تھا کہ سوچ سمجھ کر لڑکی کا ہاتھ کسی کو پکڑانا، تمہیں تو بس باہر بھیجنے کی دُھن سوار تھی۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اولاد نیک اور شریف ہے۔ تم نے جہاں کہا اس نا سمجھ نے ہاں کردی۔ اس نے اپنی مرضی سے تو یہ شادی نہیں کی ناں...... یہ تو سراسر ہماری ذمّے داری تھی۔“

شوہر کا غصہ دیکھ کر سلطانہ بیگم خاموش ہوگئیں۔ بیٹی کا دکھ انہیں بھی زخمی کر گیا تھا لیکن معاملات کو ہوش سے طے کرنے کی صلاحیت نہیں تھی ان میں۔ اب وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔

☆☆☆

فرید نے وکیل کرلیا تھا اور شبینہ نے نئے کاغذات جمع کروادیے تھے۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی وہ انگلینڈ پہنچ جائے گی۔ ماں کے رویّے نے اسے بہت ٹھیس پہنچائی تھی۔ انہوں نے تو کبھی اسے پھولوں کی چھڑی بھی نہیں لگائی تھی۔ دادی ماں نے اسے یوں اداس دیکھا تو پاس بیٹھا کر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں۔ فرید نے اس کے لیے تحائف بھی بھجوائے تھے لیکن شبینہ اتنی پژمردہ تھی کہ اس نے انہیں کھول کر بھی نہ دیکھا۔ دادی نے جان بوجھ کر وہ تحائف دیکھے اور بہت تعریف کی۔ اس کا دل بہلانے کو وہ اپنی زندگی کے حالات سنانا شروع ہوگئیں۔ انہوں نے بہت مشکل وقت دیکھا تھا۔ شبینہ کو پہلی بار ان کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ دیر تک ان کی باتیں سنتی رہی اب وہ اکثر دادی ماں کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اسے زمانے کے سرد وگرم سمجھانے کی کوشش کرتیں، ازدواجی زندگی کی باریکیاں بتاتیں۔ شبینہ نے ہمیشہ زندگی میں رنگوں کو دیکھا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہوسکتا ہے۔ دادی، پوتی دیر تک باتیں کرتیں، اب شبینہ میں کافی سمجھداری آگئی تھی۔ جتنا اسے انتظار تھا اتنا ہی ویزا لیٹ ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی شروع کرنے کی جلدی تھی۔ انہی دنوں سلطانہ بیگم کی چھاتی میں گلٹی نکل آئی۔ سب گھر والے بے انتہا پریشان ہوگئے۔ وہ پہلے ہی شبینہ کی وجہ سے وظائف پڑھ رہی تھیں اب ان میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور ٹیسٹ کے بعد رپورٹ آئی کہ صرف بے ضرر گلٹی تھی۔ سب نے سکھ کا سانس لیا گھر میں میلاد اور قرآن خوانی کروائی گئی۔ سلطانہ بیگم بیٹی کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتیں، دعا کے سوا اور کیا کرسکتی تھیں۔ بہرحال سال بعد شبینہ کا ویزا لگ گیا۔ ایک سال میں دنیا ہی بدل گئی تھی۔ سلطانہ بیگم بہت خاموش ہوگئی تھیں۔ مذہب کی جانب ان کی توجہ بڑھ گئی تھی۔ ہر وقت تسبیح کرتی رہتیں، شبینہ خود بھی کافی سمجھدار ہوگئی تھیں۔ ویزا لگتے ہی شبینہ نے جانے کی تیاری شروع کردی۔ فرید نے اس کا ٹکٹ کروادیا تھا اسے اپنے جہیز کا سامان دیکھ کر افسوس ہوتا رہا۔ وہ کچھ بھی تو ساتھ نہ لے جاسکی۔ کتنے ارمانوں سے اس نے یہ سب خریدا تھا۔ ماں اور بیٹی ائرپورٹ پر بہت روئیں۔ سب ہی لوگ اسے چھوڑنے آئے تھے۔ سلطانہ بیگم کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو بہت دور بھیج رہی تھیں۔ انہیں اپنے فیصلے پر اب بڑا افسوس ہورہا تھا۔

فلائٹ برمنگھم ائرپورٹ پہنچی تو اسے پوری سسرال لینے آئی ہوئی تھی۔ فرید کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے عجیب سے اسٹائل کے بال کٹوا کر ماتھے پر ڈالے ہوئے تھے گلے اور کلائیوں میں زنجیریں پہنی ہوئی تھیں۔ قمیص انتہائی تنگ تھی اس کی نندیں جو انتہائی دبلی پتلی تھیں کھلے پائنچوں والے ٹراوزر پہنے ہوئے تھیں۔ سب نے بال کھولے ہوئے تھے۔ شبینہ کافی تیاری سے گئی تھی۔ وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا وزن

بھی کم کرلیا تھا۔ اس کی نندوں نے بڑی عجیب سی نظروں سے اسے سرتاپا دیکھا۔ ائرپورٹ سے گھر آتے ہوئے وہ گاڑی سے شہر کی سڑکیں اور مناظر دیکھتی رہی۔ فرید کا مکان دیکھنے کے بعد اسے خاصی مایوسی ہوئی وہ تو بنگلے کا خواب دیکھ کر آئی تھی جبکہ یہ تو عجیب لمبوترا سا مکان تھا۔

گھر آتے ہی اسے پورا مکان دکھایا گیا۔ باہر ایک چھوٹا سا لان تھا پھر گھر کا داخلی چھوٹا سا دروازہ جو گیلری میں لے جاتا تھا۔ جس کے ایک طرف ایک ڈرائنگ روم اور لونگ روم تھا، گیلری میں ہی سیڑھیاں تھیں۔ گیلری ڈائننگ روم میں جا کر ختم ہوجاتی تھی۔ وہ کمرا کافی بڑا تھا، وہ شاید ٹی وی روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے پیچھے کچن تھا۔ کچن میں ہی ایک طرف واشنگ مشین لگی ہوئی تھی۔ کچن کا دروازہ باہر چھوٹے سے گارڈن میں جا کر کھلتا تھا۔ اوپر بڑے چھوٹے پانچ کمرے تھے۔ باتھ روم البتہ ایک ہی تھا۔ شبینہ کو تو نقشہ مضحکہ خیز لگا بعد میں اسے پتا چلا کہ یہ مکان واقعی بڑے مکانوں میں شمار ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ نقشہ تو یہاں کے ہر مکان کا تھا۔ چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ اس کا کمرا سب سے پیچھے کی طرف تھا اس نے شکر ادا کیا۔ کمرے میں عجیب سی ناگوار بو تھی جو برسات کے مہینے میں اسلام آباد کے گھروں کے تہ خانوں میں سے یا خود رو گھاس میں سے آتی تھی۔ فرید نے اسے بتایا کہ وہ damp کی بو تھی۔ مکان لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ اکثر گھروں میں سے ایسی ہی بو آتی ہے کیونکہ بارش کی کثرت نمی کو جنم دیتی ہے اور نمی سورج کی کمی کے باعث سوکھتی نہیں ہے اور بو بسی رہ جاتی ہے۔ اسے مشترکہ باتھ روم کی عادت نہیں تھی اس کا تو اپنا اٹیچڈ باتھ روم تھا لیکن یہاں سارا گھر صبح لائن میں لگ جاتا۔ اسے بہت کوفت بھی ہوتی اور کراہیت بھی آتی۔ اس سے ملنے کے لیے بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ زیادہ

تعداد عورتوں کی تھی۔ یہ سب ان کے رشتے دار اور ملنے جلنے والے تھے۔ ساٹن کے ریشمی قمیص شلوار میں ملبوس ان عورتوں نے بے شمار زیور لاد رکھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ گویا کسی مقابلے میں حصہ لینے آئی ہوں۔ بچوں نے الگ کھینچا تانی مچا رکھی تھی۔ عورتیں بے انتہا اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ چند ایک نے اس سے باتیں بھی کیں۔ اکثریت ایسی پنجابی بول رہی تھی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اسے بہت کم کسی کی بات سمجھ آ رہی تھی مگر بعد میں اسے معلوم ہوا کہ یہ زبان میرپوری کہلاتی ہے جو پنجابی، پوٹھوہاری اور پہاڑی زبان کا مکسچر ہوتی ہے۔ برمنگھم میں بسنے والوں کی اکثریت میرپور آزاد کشمیر کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے بچے انگریزی بول سکتے تھے۔ یا میرپوری...... وہ لوگ ... اردو سے نابلد تھے۔ فرید بھی اسی لیے پنجابی بولتا تھا کیونکہ اسے گھر میں یہی زبان سکھائی گئی تھی۔ لمحے بھر کو شبینہ بھول گئی کہ وہ انگلینڈ میں ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ میرپور کے کسی گاؤں میں ہے۔ وہ اپنے والدین سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اپنا وطن پاکستان شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہی پاکستان جس کی برائیاں کرتے اس کے گھر والے اور وہ خود نہیں تھکتی تھی اسے اب بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔ بلکہ بے شمار پاکستانیوں کی طرح وہ سارا دن چار گھنٹے وقت کو آگے کر کے سوچتی کہ اب اذان ہو رہی ہوگی اور ابھی ابا پکاریں گے۔ "شبینہ چاند...... کرسی کعبہ کے رخ کر دینا مجھے نماز پڑھنی ہے۔" اب شام ڈھل رہی ہوگی چڑیاں درختوں پر بیٹھی کتنا شور کر رہی ہوں گی۔ اب میں امی سے پوچھنے جاتی تھی کہ کیا پکنے والا ہے؟ پھر اب میں روٹیاں بنا رہی ہوتی تھی۔ اس کا دل بھر آیا تھا، وہ خیالوں میں پاکستان میں گھوم رہی تھی۔ شروع کے چند روز تو مہمانوں کے سہارے بیت گئے...... بعد میں اس کی ساس اسے قریبی stratford rd پر لے گئیں جو انڈین شاپس کے لیے مشہور ہے۔ اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ انگلینڈ میں ہے۔ سڑکوں پر کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے پائنچے ہلاتی عورتیں پرام میں بچے دھکیلتی چلی جا رہی تھیں۔ دوپٹے انہوں نے کانوں کے پیچھے اڑسے ہوئے تھے، دکانوں کے باہر تک سامان رکھا ہوا تھا۔ برتن ایسے تھے کہ اس نے پہلی دفعہ اپنی سسرال فیصل آباد میں دیکھے تھے۔ کپڑے ایسے تھے کہ ان کی نوکرانی بھی ناک بھوں چڑھائے۔ ڈیزائن بہت عامیانہ سے۔ اس کا واپس پاکستان بھاگ جانے کو جی چاہا۔ درد کی ایک لہر تھی جو اس کے اندر امڈی جا رہی تھی۔ اس نے نئی زندگی کے کیا کیا خواب دیکھے تھے اور کیا حاصل ہوا۔ اسے دادی کی باتیں شدت سے یاد آنے لگیں مگر درد کی لہروں کو وہ سینے میں ہی روک لیتی تھی۔ چند دن بعد عامر بھائی آ کر اسے اپنے ساتھ ڈینڈی، اسکاٹ لینڈ لے گئے۔ سفر بہت لمبا تھا۔ وہ بری طرح تھک گئی تھی تقریباً ساری رات انہوں نے سفر کیا۔ اگلا پورا روز اس نے سونے میں گزارا...... سو کر اٹھی تو بھائی کا گھر دیکھنا شروع کیا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا گھر...... دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بڑا کمرا اس کے پیچھے کچن، کچن سے سیڑھیاں ایک اور کمرے میں لے جاتیں جس کے پیچھے باتھ روم تھا۔ اتنا مختصر تو اس کا سرونٹ کوارٹر تھا۔ اسے عامر بھائی پر ترس آیا۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بھائی جاب پر تھا۔ اس نے بجلی کے چولھے پر ناشتا بنایا۔ برتن دھونے لگی تو کوفت سے برا حال ہو گیا۔ سنک میں گرم پانی اور ٹھنڈے پانی کے نلکے الگ الگ لگے ہوئے تھے۔ یہی حال باتھ روم کا بھی تھا۔ برمنگھم میں بھی اس نے یہی دیکھا تھا۔ انگریزوں نے پوری دنیا پر راج کر لیا مگر اتنا نہ سمجھ سکے کہ ان الگ الگ نلکوں سے پہلے منہ کو جلاؤ پھر برفاؤ بھلا یہ کون سا

طریقہ ہے۔ ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام نہیں آ رہا تھا۔ اس کی دلچسپی تو انڈین فلموں اور گانوں میں تھی جو یہاں دستیاب نہیں تھے۔ مایوس ہو کر وہ دوبارہ جا کر لیٹ گئی۔ چھوٹا سا کمرا جس میں چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ دیر تک وہ چھت کو گھورتی رہی۔ کروٹ لیتی تو پورا کمرا ہل کر رہ جاتا۔ ایک ایک کر کے اسے پچھلے واقعات یاد آنے لگے۔ پوری زندگی کا نقشہ...... اس کا بچپن...... اس کی سہیلیاں...... بچپن کی شرارتیں...... اسکول کے دن...... کتنی شرارتیں کی تھیں اس نے پھر کالج کی باتیں اور خصوصاً اسٹوڈنٹس ویک پر کتنا مزہ آتا تھا۔ کالج کا دور کتنا حسین تھا، کینٹین کی سموسہ چاٹ کیسے مزے لے کر کھاتی تھی۔ پیریڈ بنک کرنا، گراؤنڈ میں بیٹھ کر شادی منگنی کی باتیں، باہر جانے کی دھن، امریکا، انگلینڈ کی باتیں، شاپنگ کا کریز، امی سے ضد کر کے نئے کپڑے بنوانا، عید پر ہنگامہ کرنا، کیا کچھ نہیں تھا اس کی زندگی میں اور آج وہ یہاں کتنی تنہا ہے، اسے تنہائی سے وحشت ہوتی رہتی تھی۔ گھر میں شام کو ملنے جلنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا کچھ نہیں تو اپنی سہیلیوں کے سنگ ہوتی اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ کیسے اکیلے رہتے ہیں۔ کیسے کتابیں پڑھ لیتے ہیں، کیسے اکیلے بیٹھ کر سوچتے ہیں۔ آج اسے تنہائی کوئی خاص بری نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ وہ ماضی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ماضی میں اتر جائے جیسے کہ ماضی پانی ہو اور وہ اس میں تیرتی رہے۔

☆☆☆

شام کو عامر بھائی واپس آئے تو اس نے گھومنے کی فرمائش کی۔

"کہاں گھومنے جاؤ گی۔ یہ پاکستان نہیں ہے یہاں پانچ بجے ہی ساری دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ ریسٹورنٹ گھومنے پھرنے کی جگہیں سب ڈیڈ۔ صرف شراب خانے اور چند کلب کھلے رہتے ہیں۔ بہرحال میں تمہیں ابھی city cant لے جاتا ہوں۔" وہ بولے۔ اس نے سارے راستے دیکھا واقعی ساری دکانیں، پلازے بند تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کبھی یہاں کوئی انسان آیا ہوگا۔ عامر بھائی اسے ڈینڈی سے باہر لے گئے۔ اسکاٹ لینڈ واقعی خوب صورت جگہ تھی۔ پہاڑی علاقہ دور دور تک ہریالی، جس میں بنا خوشبو کے جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ذرا دور چھوٹی سی آبشار دھیمے دھیمے گنگنا رہی تھی۔ دھوپ نے مناظر میں کچھ حرارت بھر دی تھی۔ ایک لمحے کو تو اسے بہت اچھا لگا۔ پر وہ تو اسلام آباد کی رہنے والی تھی جہاں یہ مناظر جابجا موجود تھے۔ اس کے کوچے میں تو یہ سب ارزاں تھا۔ ہر سال وہ لوگ گھومنے کے لیے شمالی علاقہ جات جاتے۔ کالج، اسکول ٹرپس کے ساتھ وہ کئی دفعہ مری، ایبٹ آباد، کاغان وغیرہ جا چکی تھی۔ یہ سب دیکھنے کے لیے بھلا اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔ وہ گھر لوٹے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ عامر بھائی نے بڑے پیار سے کہا۔

"شبینہ کئی مہینے ہو گئے گھر کا کھانا کھائے ہوئے، تم مزیدار سا کھانا تو بناؤ۔" بجلی کے چولھے پر کئی دفعہ کھانا جلتے جلتے بچا۔ بہت مشکل تھا وہاں کھانا پکانا۔ چھوٹا سا کچن جبکہ وہ کھلی جگہ کی عادی تھی۔ مسالا تیار کیا تو سارا گھر دھوئیں اور بو سے بھر گیا۔ مسالے بھری ہوا ان کے اندر جانے لگی۔ عامر بھائی نے کھڑکیاں کھول دیں پھر بھی بو رچ بس گئی تھی۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو عامر بھائی نے اسے پلاسٹک کے دستانے دیے برتن دھونے کے لیے کہ گرم پانی میں ہاتھ نہیں جلے گا مگر وہ تھک گئی تھی۔ لہٰذا فرید کو فون کرنے لگی۔ وہ اسے مس کر رہا تھا۔ اس سے بات کر کے شبینہ کو تھوڑا سا سکون ملا۔ وہ وہیں ٹی وی دیکھتے دیکھتے صوفے پر ہی سو گئی۔

☆☆☆

صبح صبح عامر بھائی نے اسے جگایا اور ناشتا بنانے کو کہا۔ وہ کچن میں گئی تو رات کے جھوٹے برتنوں کا ایک ڈھیر تھا۔ جانے کیسے اس نے ناشتا بنایا پھر برتن دھوئے، کھانا بنایا، آدھا دن تو نکل گیا۔ اسے سخت الجھن ہونے لگی یہ کیسی مشینی زندگی تھی گھر میں زیادہ تر ماسی ہی برتن دھوتی تھی۔ برتن پھسل پھسل جاتے تھے اس کے ہاتھ سے۔ گوشت دھونے لگی تو ابکائی آگئی۔ یہ کام نوکرانی کرتی تھی وہ تو صرف کھانا پکاتی تھی۔ اسے سب یاد آرہا تھا۔ باقی دن اس نے یہ مشکل گزارے۔ وہ پاگل ہونے کے قریب تھی۔

بھائی واپس آیا تو پھٹ پڑی۔

''عامر بھائی آپ مجھے واپس چھوڑ آئیں۔ ایک تو وڑبے جتنا گھر اوپر سے کام کروں، مرغی دھوؤں، برتن صاف کروں اور پھر دیواروں کو گھوروں۔ پاکستان میں، میں نے کبھی یہ کام کیے تھے؟'' غصے سے اس کا منہ لال ہورہا تھا۔

''یہ انگلینڈ ہے شبینہ! پاکستان والے عیش بھول جاؤ۔ یہاں تو کمپنی ڈائریکٹر بھی اپنے برتن خود دھوتا ہے اور اپنا ٹوائلٹ خود صاف کرتا ہے۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔ جس گھر کو تم وڑبا کہہ رہی ہو ہم لوگ تو وہ بھی افورڈ نہیں کرسکتے۔ دادی ٹھیک کہتی تھیں۔ امی، ابو نے لاڈ کرکے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔ سسرال میں ہمیں شرمندہ مت کروادینا۔ سارے ماں باپ لڑکیوں کو سلیقہ شعاری سکھا کر بھیجتے ہیں اور تم نے کیا سیکھا ہے؟ یہاں کی زندگی کا اندازہ بھی نہیں ہے تمہیں۔ لہٰذا اپنا گھر بنائے رکھنا چاہتی ہو تو خود میں لچک پیدا کرو۔''

عامر بھائی نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

شبینہ کے دل پر بھائی کے الفاظ کچوکے بن کر لگے۔ اس کا محبت نچھاور کرنے والا بھائی آج اسے کیسے کیسے طعنے دے رہا تھا۔ عامر بھائی سے تو وہ بچوں کی طرح لڑتی تھی اور وہ اسے گدگدی کرکے مناتے تھے۔ ان کی چیزیں ہتھیالیتی اور وہ ماتھے پر شکن بھی نہ لاتے مگر اس دیس کی سرد ہوا نے ان کے جذبات پر برف ڈال دی تھی۔ جیسے اسکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں پر جمی برف اس نے خود دیکھی تھی۔ توہین کے شدید احساس سے اس کے کان کی لویں تک سرخ ہوگئیں۔ وہ سختی سے آنکھوں میں آئے پانی کے سیلاب کو روکنے لگی۔ عامر جھنجلا کر باہر نکل گیا تھا۔ شاید اسے بھی دکھ تھا کہ اس کی بہن دکھی ہوگئی تھی۔ وہ واپس آیا تو بہت رات ہوچکی تھی۔ شبینہ رو دھو کر اپنے دل کا غبار نکال چکی تھی۔ عامر بہت شرمندہ تھا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ آخرکار شبینہ بولی۔

''فرید کا فون آیا تھا۔ مجھے کل واپس جانا ہے۔''

عامر نے خاموشی سے فون اٹھایا اور شبینہ کی کوچ کی ٹکٹ بک کروادی۔ ڈینڈی سے برمنگھم کا راستہ دس سے بارہ گھنٹے کا تھا۔ سارا راستہ وہ روتی رہی، وہ کھڑکی کی جانب بیٹھی تھی۔ اسے زندگی کا ہر پل یاد آرہا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر بادلوں کی جھل تھل تھی اور اندر اس کی یادوں کی۔ اس کے ساتھ بیٹھی گوری پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار اسے دیکھتی جب رہا نہ گیا تو بول اٹھی۔

"are you alright? is something bothering you,can I help you?"

گوری کی باتیں کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ تھوڑی دیر میں Services پر بس رک گئی۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی۔ تمام مسافر اتر گئے تھے مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ سب لوگ واپس آئے تو گوری نے چپس سینڈوچ اور جوس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لو، یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی ابھی بہت لمبا سفر ہے۔'' اس

وقت وہ گوری میم اسے اپنوں سے زیادہ اچھی لگی۔ اس کا دل رکھنے کے لیے اس نے کھانا شروع کردیا۔ نوالے اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔ بہ مشکل اس نے سینڈوچ تمام کیا۔ اس کے پاس ابو کے دیے ہوئے چند سو پاؤنڈز تھے۔ فرید نے ابھی تک اسے ایک پاؤنڈ بھی نہیں دیا تھا۔ البتہ عامر بھائی نے چلتے ہوئے اسے کچھ پاؤنڈز دینے کی کوشش کی جو اس نے نہیں لیے۔ اس کا برمنگھم جانے کا بھی من نہیں تھا اس سیلن بھرے بے ترتیب گھر میں اس کی نفاست پسند طبیعت الجھتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ پاسپورٹ لے اور واپس پاکستان چلی جائے۔ شادی سے صرف افسانے وابستہ ہیں۔ حقیقت بہت مختلف اور تلخ ہے۔

گوری شاید بہت باتونی تھی اس نے پھر پوچھا۔

"are you pakistani or indian?"

''پاکستانی۔'' مختصر سا جواب تھا۔

''nice out fit'' گوری نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے لینن کا سرخ و کالا پرنٹڈ... سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ تھوڑی سی حیران ہوئی۔ گوروں کے متعلق سنا تھا کہ مغرور ہوتے ہیں۔ بد دماغ ہیں، سب کٹھور ہوتے ہیں اور اجنبیوں سے زیادہ باتیں نہیں کرتے مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اب اسے دادی ماں کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ کہتی تھیں ''شبینہ چندا! زندگی سدا ایک سی نہیں رہتی، کبھی بہار ہے تو کبھی خزاں...... انسان کو چاہیے کہ صبر ہمت سے کام لے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے انہی خوبیوں سے نوازا ہے وہ چاہے تو دنیا تسخیر کرلے اور چاہے تو پستی میں گرجائے۔ جیسے بھی حالات ہوں بیٹا روشنی کھوجنے کی کوشش کرنا...... اجالا سیاہ رات کے بعد ہی آتا ہے۔'' آج دادی کی باتیں اس کو حوصلہ دے رہی تھیں۔ دراصل جن لوگوں کو زندگی نے میٹھی لوریاں سنائی ہوں ان کے لیے معمولی سی تکلیف بھی اندوہ ناک صدمہ بن جاتی ہے۔ یہی کچھ شبینہ کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ذہنی طور پر کسی جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ انگلینڈ جاتے ہی افسانوی زندگی اس کے استقبال کے لیے تیار ہوگی۔ خوابوں کا شہزادہ اسے محل میں لے جائے گا اور وہ کنیزوں کی فوج پر حکمرانی کرتے ہوئے ایک شاندار زندگی بسر کرے گی جبکہ حقیقت اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔

نیو کاسل پر جاکر کوچ ٹھہر گئی۔ شام ہورہی تھی۔ یہاں پر کوچ نے کافی دیر قیام کرنا تھا۔ وہ گوری یہاں پر اتر گئی اور ایک قمیص شلوار میں ملبوس خاتون اس کے ساتھ آبیٹھی۔ شبینہ کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرکے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ خاتون نے خود ہی بات چیت شروع کردی۔

''کہاں سے ہو؟''

''پاکستان سے۔''

''کہاں جارہی ہو؟''

''برمنگھم۔''

''نئی نئی آئی ہو؟''

''جی۔''

''کیا نام ہے؟''

''شبینہ۔''

''میرا نام مریم صفدر ہے۔ میں بھی برمنگھم جارہی ہوں۔ small heath میں رہتی ہوں۔ پاکستان میں ہم سرگودھا میں رہتے تھے۔ یہاں شادی ہوکے آئی ہوں۔ اب تو دس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں ماشاء اللہ چار بچے ہیں میرے۔''

اس نے شبینہ کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی سب کچھ بتادیا۔ خاصی باتونی تھی۔ وہ پھر شروع ہوگئی۔

''پاکستان میں کہاں رہتی ہو؟''

''اسلام آباد میں۔''

''شادی کرکے آئی ہوگی یہاں۔''

"جی ہاں۔"
"نیو کاسل میں کون ہے تمہارا؟"
"بھائی ہوتے ہیں ڈینڈی میں۔"
"اچھا اتنی دور سے آرہی ہو؟"
"اور کیسا لگا یہ ملک؟"

"اسلام آباد اس سے اچھا ہے۔ یہاں تو چھوٹے گھر، تنگ سڑکیں، جانے لوگ کس بات کی تعریف کرتے ہیں۔" شبینہ نے اپنے شہر کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"عادی ہو جاؤ گی۔ پہلے پہلے سب کو ہی لگتا ہے پھر سب عادی ہو جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جاتا اس ملک سے، دیکھنا تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔"

"آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ میں کیسی زندگی چھوڑ کر آئی ہوں یہاں۔ میرے ابو بڑے آفسر تھے۔ بڑے عیش تھے۔ گاڑی بنگلا سب کچھ تو تھا۔" شبینہ نے اِک آہ بھر کر کہا۔

"ہاں، تم اچھی فیملی کی لگتی ہو۔ اسی لیے ایڈجسٹ ہونے میں وقت ہو رہی ہے۔ جو لوگ گاؤں سے آتے ہیں وہ تو دنگ رہ جاتے ہیں۔ ویسے کتنا پڑھا ہے تم نے؟"

"بی اے انگلش لٹریچر کے ساتھ۔" اس نے فخریہ بتایا۔

"بہن سمجھو تو میرا ایک مشورہ مانو کہ سب سے پہلے تم انگلش کی کلاسیں لو۔ مانا کہ تم نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی ہے مگر ان لوگوں کے بولنے اور لہجے میں بڑا فرق ہے۔ یہاں مختلف accents ہیں۔ برمنگھم کا لہجہ سب سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال زبان کسی بھی رکاوٹ کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خود مختار ہونا بہت اہم ہے۔ اس طرح تمہیں بہت جلد یہاں کا سسٹم سمجھ آجائے گا اور زبان بھی، تم کوئی بہت ہی دور دراز کے گاؤں سے تو آئی نہیں جس نے کبھی water taps (پانی کے نلکے) بھی نہ دیکھے ہوں۔" اسے ہمدردی کی تو ضرورت تھی۔ سو مختصراً ابھی تک سہے ہوئے تمام واقعات بیان کر دیے۔ مریم صفدر کافی سمجھ دار عورت تھی۔ وہ بچپن سے اس ملک میں آتی رہی تھی گو تعلیم پاکستان سے حاصل کی تھی مگر اس کی شادی انگلینڈ میں رہنے والے اس کی خالہ کے بیٹے سے ہوگئی جو برمنگھم یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ اسی نے مریم کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے یہاں آکر کچھ عرصہ پڑھائی کی پھر وہ esol میں پڑھانے لگی۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو دوسرے ملکوں سے برطانیہ آتے ہیں اور انگریزی زبان پر عبور نہیں رکھتے۔

مریم نے شبینہ کی پوری داستان سننے کے بعد کہا۔

"یہ داستان میں سیکڑوں دفعہ سن چکی ہوں۔ میں جہاں پڑھاتی ہوں وہاں اکثریت پاکستان، انڈیا اور بنگلا دیش سے آنے والوں کی ہے۔ ابھی تو تمہیں اپنی سسرال میں صرف چند دن رہنے کا اتفاق ہوا ہے میری دعا ہے کہ وہ بہت اچھے لوگ ثابت ہوں ورنہ بے چاری لڑکیوں کو تو رول دیتے ہیں یہ لوگ۔ میں قصے سنا سنا کر تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتی لیکن سب سے پہلے تم اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کی کوشش کرو۔ اب تو کلاسز میں داخلہ ہو چکا۔ جنوری میں نئی کلاسز شروع ہوں گی تم ضرور داخلہ لینا۔ یہ لو میرا نمبر کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے فون کرنا ویسے مسئلے کے بغیر بھی مجھے فون کر سکتی ہو۔"

مریم سے باتیں کر کے وہ بہت حد تک ہلکی پھلکی ہوگئی۔ digbeth coach station پر فرید اسے لینے آیا تھا۔ اس کا موڈ کافی بہتر ہو چکا تھا۔ فرید نے اس کے لیے ایک سوٹ خریدا تھا۔ وہ خوش ہوگئی اگرچہ کپڑا بالکل گیا گزرا تھا پر کیا ہو سکتا تھا یہاں ایسے ہی کپڑے ملتے تھے۔ گھر پہنچی تو وہاں حسبِ معمول میلا لگا ہوا تھا۔ ساری نندیں حاضر تھیں۔ ساس کی بہنیں اور ماں بھی موجود تھیں۔ شبینہ بہت تھک چکی تھی۔ مارے باندھے سلام کیا۔ ساس نے طنزیہ پوچھا۔

"کیا بات ہے اتنی تھکی ہوئی ہو۔ کیا ضرورت تھی اتنا لمبا سفر بس پر کرنے کی۔ بھائی جہاز پر نہیں بھیج سکتا تھا؟" اسے شدید غصہ آیا پر چپ رہی۔ کسی نے چائے تک کا نہیں پوچھا۔ سب بدستور گپوں میں مشغول رہیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور شدید تھکن کے باعث جلد ہی سو گئی۔

صبح اٹھی تو معلوم ہوا ابھی سب سو رہے ہیں۔ صبح کے چھ بجے تھے مگر دن کا اجالا پھیل چکا تھا بلکہ اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ اس نے پچھلے بارہ گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ باورچی خانے میں گئی تو رات کے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا دیکھا اسے غصے کے ساتھ ساتھ رونا بھی آنے لگا۔ برستی آنکھوں سے اس نے برتن دھونے کے دستانے پہنے اور برتن دھونے لگی۔ برتن دھوتے دھوتے گھنٹا گزر گیا۔

فرید نیچے آگیا اور چلّا کر بولا۔ "اے کی کر رئی ایں توں۔ رہن دے، ڈش واشر لگا لیں گے۔" (یہ کیا کر رہی ہو ڈش واشر چلا لیں گے) اس کا جی جل گیا۔ وہ اس وقت تو چپ ہوگئی مگر رات کو تنہائی میں فرید سے کہا۔

"آپ نے ہمارا گھر دیکھا ہے نا اسلام آباد میں... کتنا صاف ستھرا رہتا ہے۔ میرا کمرا تو میری نفاست کے لیے مشہور تھا۔ میری الماری اتنی اچھی طرح سیٹ ہوتی تھی کہ لوگ دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ کچن میں تو کبھی پھیلاوا ہوا ہی نہیں۔ میں اسے چمکاتی رہتی تھی۔"

فرید نے اطمینان سے کہا۔ "پاکستان میں سرونٹ ہوندے ہیں، وہ کام کرندے ہیں۔ آپ کو صرف tiny bits کرنا ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں سب کچھ خود کرنا پیندا اے۔ no one can do so much فیر ممی بڈھی ہے، اتا کم (کام) نہیں کرسکدی، تمہیں soon یہاں کی لائف پتا چل جائے گی۔" وہ اس کی ملی جلی زبان سنتی رہی۔ فرید ٹیبل پر بیٹھ گیا اور انگلی سے خون نکال کر چھوٹی سی مشین پر چیک کرنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" شبینہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"sugar level چیک کر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی مجھے diabeties ہے ناں۔"

"کیا......؟" شبینہ چیخ پڑی۔ "پر پاکستان میں تو آپ نے کبھی نہیں بتایا۔"

"اگر بتا دیتا تو تم شادی نہ کرتیں، اب مجھے بریک فاسٹ دو۔ milk and just bran flakes" اسے دھوکا دہی کا شدید احساس ہوا فرید کو ذیابیطس کی بیماری تھی انسولین کے انجیکشن لیتا تھا اور اس سے یہ چھپایا گیا تھا۔ اسے شدید دکھ اور افسوس ہوا۔ فرید ناشتا کر کے اسے عامر بھائی اور پاکستان سے آنے والی فون کالز کے متعلق بتانے لگا۔ وہ فوراً امی، ابو سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں سے فون کرنا کافی مہنگا تھا۔ فرید نے کہا کہ وہ اسے فون کارڈز لا دے گا جن سے کالز سستی پڑتی ہیں۔ اب اسے شام کا انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھنے لگی۔ اس کی ساس نے زی ٹی وی لگوایا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوئی کیونکہ زی ٹی پر تمام پرانے پروگرامز چل رہے تھے۔ پاکستان میں تو قسطیں بہت آگے جا چکی تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب اس کی ساس نیچے

اتریں۔ انہوں نے اسے اپنی مختلف بیماریوں کے نام گنوانے شروع کردیے۔ آخرکار شبینہ نے انہیں ناشتا بنا کر دیا تو وہ خاموش ہوئیں۔ دیور، نندیں اپنی مرضی کے مالک تھے۔ جب کالج یا کام پر جانا ہوتا اٹھ جاتے ورنہ سوتے رہتے۔ انہیں باہر سے کھانے کی بہت لت تھی۔ دراصل جگہ جگہ پاکستانیوں نے ٹیک اوے کھول لیے ہیں۔ نہایت ارزاں قیمت پر فش اینڈ چپس، نان کباب، تکا چپس فروخت کرتے ہیں۔ ہیلتھ اتھارٹی کی جانب سے اکثر انہیں نوٹس بھی ملتے رہتے ہیں جنہیں وہ بڑی دیدہ دلیری سے نسلی منافرت کا نام دے کر نظرانداز کردیتے ہیں۔ آئے دن ان اسٹالز پر چھاپے پڑتے ہیں بند ہوجاتے ہیں لیکن پھر شروع ہوجاتے ہیں۔

شام کو فرید اس کے لیے فون کارڈ لے آیا تھا۔ امی سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ درد کم ہے لیکن تھکن طاری رہتی ہے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کرلیا ہے۔ رقم بھی اچھی خاصی مل جائے گی۔ گھر میں فل ٹائم ایک میاں بیوی کو ملازم رکھ لیا ہے لیکن شاید وہ لوگ کچھ عرصے میں لاہور شفٹ ہوجائیں گے اکیلے یہاں ان کا دل نہیں لگتا۔ کم از کم کچھ رشتے دار نزدیک رہیں گے۔ اب وہ لوگ یہاں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ شبینہ کا دل بھر آیا وہ رونے لگی۔ ابو سے بات نہ ہوسکی کیونکہ رات کافی ہوچکی تھی اور وہ سوگئے تھے۔ وہ خود کو تنہا محسوس کررہی تھی۔ اس کو لگا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ کوئی اس کا جگر مٹھی میں لے کر دبا رہا تھا۔ اس کی سانسیں سینے میں گھٹ رہی ہیں۔ فرید سے اس نے پاکستان جانے کی بات کی تو اس نے کہا۔

''میں افورڈ نہیں کرسکتا۔ شادی پر بہت خرچا ہوا ہے پھر وکیل کرنے پر بھی خرچا ہوا اور باقی پیسے اس کے ٹکٹ پر لگ گئے۔ البتہ اگر تمہارے ماں، باپ پیسے بھیج دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے کچھ نہیں کہا۔ سوائے اس کے کہ اول تو وہ فرید کی ذمے داری ہے اور اگر وہ افورڈ نہیں کرسکتا تو اس کے ماں، باپ کے پاس اللہ کی مہربانی ہے۔ وہ میکے کا مان نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

اس نے خود پر جبر کرکے عامر بھائی کو فون کیا۔ اسے بچپن سے لاڈ پیار ملا تھا۔ سمجھوتا کیا ہوتا ہے...... جھکنا کسے کہتے ہیں' وہ بے خبر تھی۔ ہمیشہ اسے منایا جاتا تھا۔ آج پہلی بار اس نے پہل کی تھی۔ ویسے تو عامر بھائی نے اسے فون کیا تھا مگر وہ سو رہی تھی خیر...... وہ گھر پر مل گئے تھے۔ انہوں نے اس کی ساری بات سن کر کہا۔

''میں فرید کو الزام نہیں دیتا۔ یہاں مہنگائی ہی اتنی ہے...... پھر خرچے بے شمار ہیں۔ خیر میں چاہوں بھی تو تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔ پاکستان جانے کا ٹکٹ 600 پونڈ ہے یعنی 60,000 ہزار روپے۔ میری تنخواہ میں سے اتنا تو ٹیکس کٹ جاتا ہے پھر گھر خریدا ہے میں نے اس کا لون لیا ہوا ہے وہ ادا کرتا ہوں، ہر ماہ باقی بلز...... آئی ایم ریئلی سوری ڈیر سسٹر...... امی' ابو کی بھی کوئی نہ کوئی ضرورت ہوتی ہے۔ ابو کے پاس شاید ہی کوئی بچت ہو ورنہ تمہاری شادی پر بھی کافی خرچا ہوگیا تھا۔ میری مانو تو نوکری کرلو اور پھر عیش سے پاکستان جاؤ۔'' اس کا مان ٹوٹ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا اپنا بھائی اپنی ذمے داریوں سے نظریں چرا رہا ہے۔ اس کا دل انہیں کھری کھری سنانے کو چاہا پر فرید کے سامنے چپ رہی اگلے دن کا آغاز بھی گزشتہ روز کی طرح ہوا۔ بلکہ آگے کئی ہفتے ایک جیسی روٹین کا شکار ہوگئے۔ اس گھر کا نقشہ ہی عجیب تھا۔ فرید صبح جاب پر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ اس کی ساس کو ٹی وی دیکھنے اور باہر پھرنے کی لت تھی۔ سارا علاقہ پاکستانیوں کا تھا۔ وہ سارا دن گھر گھر پھرتیں۔ سسر کو مذہب سے لگاؤ

تھا۔ وہ مسجد میں محفلیں لگاتے، لوگوں کو مسئلے سمجھاتے۔ بوڑھے حضرات کی مجلس ان کے گھر روز جمتی۔ وہ انگریزوں کی اور نوجوان نسل کی برائیاں کرتے۔ اپنے زمانے کو اور اپنے علاقوں کو یاد کرتے۔ باقی لوگوں پر تنقید ہوتی۔ بڑی نند کوثر تین دن کسی کلینک میں ریسپشن پر ہوتی تھی۔ بچے ماں کے پاس چھوڑ جاتی۔ بڑا بیٹا اسکول جاتا۔ نانا اسکول سے اسے لاتے اور وہ بھی یہیں رہتا۔ رات کو کھاپی کر وہ لوگ اپنے گھر جاتے اس کی ساس کا سارا میکا اردگرد کے علاقوں میں آباد تھا۔ آئے دن محفلیں لگتیں۔ وہ لوگ اس سے پاکستان میں اس کے رہن سہن کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتیں اور پھر لاحول پڑھتیں کہ پاکستان بہت ماڈرن ہوگیا ہے۔ وہ تیس سال پہلے پاکستان سے آئے تھے۔ آج تک پاکستان ان کے لیے وہی تیس سال پہلے والا تھا۔ شبینہ کے طور طریقے پورے خاندان میں باعثِ حیرت تھے۔ پاکستان سے آئی تھی پر پنجابی نہیں اردو بولتی تھی...... انگریزی کچھ سمجھ لیتی تھی اور جواب بھی دے دیتی تھی۔ اس کے لباس، تراش خراش اور اٹھنا بیٹھنا سب کچھ انوکھا تھا سب کے لیے۔ اسے بن سنور کر رہنے کا شوق تھا، خود فیشیل کرتی، ناخن فائل کرکے رکھتی، شکل صورت کی اچھی تھی لہٰذا سب سج جاتا۔ اس کی ساس نندوں کے چہروں پر جلن صاف نظر آتی۔

گزرتے وقت کے ساتھ اس کی اپنی شخصیت دھندلاتی جارہی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز یکسانیت کا شکار تھے۔ اسے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ سارا دن کھانا بنانے میں گزر جاتا۔ نندیں اس سے زیادہ بات نہ کرتیں فرید البتہ اس کو سراہتا لیکن اس پر ماں کا کنٹرول بہت تھا۔ فرید کو اس کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ بہانے بہانے سے اسے اٹھاتیں۔ سسر ہردم مذہبی احکامات جاری کرتے رہتے۔ ایسے میں مریم یاد آئی۔ شبینہ نے اسے فون کیا پر وہ گھر پر نہیں تھی۔ وہ بہت اداس ہورہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کاش دادی کا کہا مان کر کمپیوٹر سیکھ لیا ہوتا تو آج انٹرنیٹ کے ذریعے سب سے رابطہ کرسکتی تھی پر ان دنوں وہ کہاں ان چیزوں پر کان دھرتی تھی۔ وہ یاسیت کا شکار ہورہی تھی کہ بیل بجی۔ اس کا نندوئی محمود تھا۔ وہ اندر چلا آیا۔ کبھی اس نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ کسی دکان پر کام کرتا تھا۔ ہفتے میں ساتوں دن وہ کام پر ہوتا۔ اسے اکیلا دیکھ کر بولا۔

''پھپھو وغیرہ گھر پر نہیں؟ چلو کوئی بات نہیں اسی بہانے آپ سے ملاقات ہوگئی۔'' شبینہ کے کان اردو سننے کے لیے ترس رہے تھے۔ اسے بہت خوشی ہوئی جب اس نے مہینوں بعد کسی کو اس گھر میں اردو بولتے سنا۔ معمولی باتیں اتنی اہمیت رکھتی ہیں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ محمود سے باتیں کرے۔ اسے خود پر حیرت ہوئی۔ پاکستان میں ہوتی تو وہ محمود جیسے آدمی سے بات کرنا تو درکنار ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتی لیکن وقت کی کاٹ بہت ظالم ہے۔ وہ انسان کو باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی بدل دیتا ہے۔ شبینہ کو خود بھی احساس تھا کہ وقت نے اسے بہت بدل دیا ہے۔ محمود کو اس نے چائے بنا کر دی وہ بہت پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر بولا۔

''شبینہ! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ میں تم سے کچھ پوچھوں تو برا تو نہیں مانو گی؟''

''نہیں بھائی جان۔''

''تم اتنے اچھے گھر کی ہو...... پڑھی لکھی اور اچھی شکل صورت کی مالک۔ تمہارے والدین اور بھائی تعلیم یافتہ تھے پھر ان لوگوں میں تمہارا رشتہ کیسے ہوگیا؟'' یہ سوال پہلی بار کسی نے نہیں کیا تھا۔ بارہا وہ یہ سوال نظروں میں پڑھ چکی تھی۔ کچھ لوگوں نے تو پوچھ بھی لیا تھا اب اس نے شرمندہ ہونا یا وضاحت کرنا

چھوڑ دیا تھا۔

”محمود بھائی! آپ نے بھی تو اسی گھرانے میں شادی کی ہے پھر امی تو آپ کی پھپو بھی ہیں۔ آپ اپنے ہی خاندان کے بارے میں ایسی باتیں کررہے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”you're just not a pretty face ذہین بھی ہو، خیر میری شادی ویسے ہی ہوئی تھی جیسے ہزاروں لوگوں کی باہر کے ملکوں میں ہوتی ہے۔ مغربی دنیا کی چکا چوند کو اپنانے کی چاہت میں۔۔ میں نے پاکستان سے بی اے کیا اکنامکس میں پھر ریلوے میں ملازمت کی۔ ملازمت کے دوران میں پاکستان بھر میں پھرتا رہا۔ اسلام آباد مجھے بہت پسند آیا۔ بہت خوب صورت شہر ہے۔ بہترین آب وہوا بھی ہے۔ پھر پھپو نے میرا رشتہ مانگا۔ ہمارے گھر میں تو خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انگلینڈ آنا تو سب کا خواب ہوتا ہے۔ میں نے نوکری بھی چھوڑ دی۔ اچھا خاصا کیریئر بنا سکتا تھا۔ یہاں آیا تو صحیح حقیقت کا سامنا ہوا۔ سلمٰی میری بیوی نے بہ مشکل جونیر کیمرج کیا۔ اسے اپنے برٹش ہونے پر بہت ناز ہے۔ مجھے وہ پاکستانی نہیں کہتی تھی back yardi جس کا مطلب ہے پچھواڑے سے آیا ہوا۔ سب پاکستانیوں کو یہ لوگ یہی کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے پاکستان میں شادی ہی اسی لیے کی تھی کہ جو بھی آئے گا وہ ان پر dependent ہوگا۔ اسے دبا کر رکھیں گے بہن، سبھی یہاں یہ کرتے ہیں۔ کیا پاکستانی اور کیا انڈین...... اپنے ہی بھائیوں کو نوکر بنا کر رکھتے ہیں۔ خیر...... میں اس زندگی کا عادی نہیں تھا۔ پاکستان میں تو ہم مرد بیویوں پر رعب ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ رعب سہنا ہماری انا کو ضرب پہنچانا ہوتا مگر یہاں یہ مجبوری تھی۔ ہمیں جو ویزا ملتا ہے وہ spouse یعنی میاں بیوی کا نہیں منگیتر کا ہوتا ہے۔ جس کا مطلب ہے ہم برطانوی قانون کی نظر میں منگنی شدہ ہیں۔ اگر منگنی سال بھر یا دو سال قائم رہتی ہے تو ہم اس ملک میں ٹھہر سکتے ہیں ورنہ اپنے ملک واپس جاؤ ڈیر خدا حافظ۔“ محمود نے اپنے اور یہاں کے حالات تفصیلی بتائے۔

”اس کی کیا وجہ ہے؟“ شبینہ نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ آپ اس ملک میں کسی اور کی وجہ سے آرہے ہیں۔ وہ آپ کو شادی کرکے لارہا ہے تو اگر آپ کی شادی کامیاب نہیں ہوتی تو آپ کو واپس جانا ہے۔ آپ کے رہنے کا جواز ہی ختم ہوگیا۔ لہٰذا آپ کو پہلے دو سال ٹرائل کے ملتے ہیں۔ شادی کامیاب تو آپ رہ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ خیر میں بتا رہا تھا کہ میں یہاں آیا تو سب نے رعب ڈالنا شروع کردیا۔ سلمٰی پہلے سے ہی کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ گھر والوں نے سوچا کہ اس سے پہلے وہ اس معاشرے کا کوئی اثر قبول کرے اس کی شادی کردینی چاہیے۔ مجھے ہمیشہ وہ back yardi سمجھتی ہے۔ میں نے شروع میں انگریزی کی کلاسیں لی تھیں۔ میں کیریئر بنانا چاہتا تھا لیکن گھر بھی چلانا تھا۔ سسرال والوں نے کچھ گائڈنس نہیں دی۔ وہ مجھے آگے تعلیم حاصل کرنے نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ میں ان کی چاکری نہ کرتا۔ مجھے قسائی کا کام مل گیا۔ ابھی تک اس میں ہی ہوں۔ کچھ کرنے کی خواہش ہی ختم ہوگئی۔ کیا کروں گا آگے بڑھ کر۔ سلمٰی بھی اس لائف میں خوش ہے۔ اس کی کبھی کوئی منزل نہیں رہی۔ میری منزل انگلینڈ آنا تھی وہ پوری ہوگئی۔“

”فرید کی شادی انہوں نے اپنے خاندان میں یا انگلینڈ میں ہی کیوں نہیں کی؟“ اس کے ہونٹوں پر دل کا سوال آگیا۔

”فرید کافی موڈی اور مزاج دار ہے۔ وہ پہلا

ہے پورے خاندان میں جس نے گریجویشن کی ہے لہٰذا خود بخود وہ choosy ہو گیا۔ اسے خاندان کی کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ پھپو کی بہنوں کی نظر تھی اس پر اپنی لڑکیوں کے لیے۔ کافی عرصہ وہ ناراض بھی رہیں یہاں کی لڑکیوں کے بہت نخرے ہیں۔ اس کا قد چھوٹا ہے، مذاق اڑاتی تھیں اس کا۔ پھر وہ خود بھی پاکستان میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کی لڑکیاں برابری کرتی ہیں مردوں کی۔ پاکستانی بیویاں رعب میں رہتی ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں اپنے حقوق سے واقف ہیں اور ان کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ یہی سوچ کر فرید نے پاکستان جا کر شادی کا فیصلہ کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ بہترین لڑکی حاصل کر سکتا ہے یا نہیں اور تمہاری تو پورے خاندان میں دھوم تھی۔ اتنے اعلیٰ گھرانے سے تعلق...... خوب صورت...... فیشن ایبل اور پڑھی لکھی...... دیکھا نہیں تم نے کہ سلمیٰ وغیرہ تم سے لیے دیے رہتی ہیں۔ یہ ان کا احساسِ کمتری ہے۔ تم پاکستان سے ہو لیکن تمہاری ڈریسنگ ان سے اچھی ہے۔ بات چیت کا انداز ان سب سے بہتر ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ اردو نہیں بول سکتیں۔"

"لیکن محمود بھائی گھر کا خرچا کون چلاتا ہے، کیا فرید کے پیسوں سے؟" اس نے سوال کیا۔

"تعجب ہے۔ تمہیں ابھی تک پتا نہیں چلا! بھئی low income ظاہر کرتے ہیں گورنمنٹ کو یہ سب۔ پھوپا نے صرف دس سال کام کیا پھر جھوٹ بول کر خود کو disable ظاہر کر کے allowance لیتے ہیں۔ کوئی ٹیکس نہیں دیتے۔ ویسے ٹیکس تو میں بھی نہیں دیتا۔ ہم سب کم آمدنی دکھاتے ہیں تاکہ گورنمنٹ ہماری مدد کرے۔ یہ جو گھر ہے پہلے یہ کونسل کا تھا۔ کرائے کے بغیر یہ سب رہتے تھے۔ پھر فرید کی نوکری کے بعد انہوں نے کونسل سے انتہائی سستے داموں خرید لیا۔ پھوپا اِدھر اُدھر کام کر کے پیسے کماتے تھے لیکن ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ہم سب بھی یہی کرتے ہیں ورنہ ٹیکس اتنا ہے کہ گزارہ نہیں ہوتا۔ پھپو کو بھی الاؤنس ملتا ہے۔ تمہاری نندیں بھی job seekers allowance لیتی ہیں البتہ سعید (دیور) فل ٹائم اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ نہیں ملتا سوائے گزارہ الاؤنس کے کیونکہ اس کا باپ کاغذوں میں disable ہے۔ فرید بھی ٹک کر نوکری نہیں کرتا۔ دراصل نوکری کرنے کے نقصانات ہیں۔ دیکھو نا پہلے تو انکم ٹیکس دینا پڑتا ہے پھر مکان کا کرایہ، کونسل ٹیکس، نوکری نہ کرو تو سب گورنمنٹ مہیا کرتی ہے۔ بس گزارے جتنا دیتی ہے تبھی لوگ چھپ چھپا کر کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ ٹیکس نہ دینا پڑے اور مراعات بھی ملتی رہیں۔"

باتوں باتوں میں انہیں پتا ہی نہیں چلا ...... جانے کب مختار بیگم (فرید کی ماں) اندر آ کر دروازے میں کھڑی تھیں۔ دونوں نے باتیں کرتے کرتے مڑ کر دیکھا تو دھک سے رہ گئے۔ وہ انتہائی خشمگیں نظروں سے گھور رہی تھیں۔ محمود تو انہیں دیکھ کر کھسک گیا البتہ شبینہ سے انہوں نے سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ ایک ایک بات جاننا چاہتی تھیں جو محمود نے کی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے انہیں ٹالا۔

☆☆☆

شام کو فرید کے گھر آتے ہی انہوں نے اس سے شبینہ کی شکایت کی۔ اس نے بھی شبینہ کو آئندہ محمود سے دور رہنے کی تنبیہ کی اور پوچھا کہ ان دونوں کی آپس میں کیا بات چیت ہوئی۔ انہیں شک تھا کہ محمود اسے خاندان کے راز بتا رہا تھا۔ فرید کی تو شوگر ہائی ہو گئی۔ شبینہ کو اتنی معمولی ذہنیت رکھنے والے لوگوں پر افسوس ہوا۔ وہ صرف نندوئی سے باتیں ہی تو کر رہی تھی اور ان لوگوں نے کیا سے کیا بنا دیا۔ اس کی ساس نے تو شک کا بھی اظہار کر ڈالا۔ اگلے دن بھی ان کا موڈ خراب رہا۔ شبینہ نے فرید سے شکایت کی تو اس نے اسے صبر کرنے کو کہا۔

"ممی دل کی بری نہیں بس غصہ جلدی آجاتا ہے۔"

☆☆☆

تمام خاندان بریڈ فورڈ کسی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا، ان کے خاندان میں آئے دن فنکشن ہوتے تھے۔ شروع میں شبینہ نے بھی شوق سے شرکت کی۔ وہ نت نئے کپڑے پہن کر سج بن کر جاتی لیکن وہاں کی عورتوں کے طرح طرح کے سوالات نے اس کا دل اچاٹ کر دیا۔ عورتیں اسے عجیب طریقے سے ٹریٹ کرتیں۔ اس کی کسی سے بھی نہ بن پائی۔ فرید نے خراب طبیعت کا بہانہ کر کے نہ جانے کا جواز تلاش کر لیا۔ شبینہ کو وہ برمنگھم کے city center لے کر گیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ انگلینڈ میں ہے۔ بڑے بڑے اسٹور چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میک اپ کا اتنا عمدہ سامان تھا کہ وہ تو پاگل ہو گئی۔ اسٹور پر میک اپ کی ایکسپرٹ بھی اس کا جنون پہچان گئی تھیں۔ وہ اسے باری باری میک اوور کے لیے اکساتی رہیں۔ اسے کچھ سمجھ آتا کچھ نہیں۔ فرید تو اسے چھوڑ کر اپنے دوست کے ٹی اسٹال پر چلا گیا۔ وہ ہر اسٹور پر گئی۔ اس نے میک اپ کروایا۔ طرح طرح کے پرفیومز tester پر لگے تھے۔ اسے پرفیومز کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ گئی اور فرید کو بلا لائی۔ زبردستی اس نے دو برانڈڈ پرفیوم خریدے۔ میک اپ خریدا۔ سیلز گرلز نے اس کے اسکن کلر اور اسکن کی بہت تعریف کی۔ اس کی سنہری رنگت، بلیکش براؤن بال اور گہری براؤن آنکھیں ان کے لیے آئیڈیل تھیں۔ وہ بڑے شوق سے اس کا میک اپ کر رہی تھیں۔ فرید بڑے فخر سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے دو لانگ اسکرٹ اور ٹراؤزرز خریدے۔ اس کا فگر اچھا تھا۔ سیلز گرل اس کو نت نئے...... مشورے دے رہی تھیں۔ اچھا خاصا رش تھا۔ رنگ و بو کا گویا سیلاب تھا۔ ایسی دکانیں، ایسی چیزیں وہ تو خوش ہو گئی۔ فرید اسے مارک اینڈ اسپنسر کے ریسٹورنٹ لے گیا اور اسے برطانیہ کی نیشنل ڈش فش اینڈ چپس بھی کھلائی۔ واپسی پر وہ یہی کہتا رہا آج بہت خرچا ہو گیا۔ میں اتنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ پر وہ بہت خوش تھی اس لیے اس نے فرید کی بات کو محسوس نہیں کیا۔ گھر واپس آ کر فرید نے ساری چیزیں چھپا دیں۔ وہ ماں کو خبر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

شبینہ بے قرار تھی چیزیں استعمال کرنے کے لیے لیکن فرید نے منع کر دیا تھا۔ بس فرید کو میک اپ کر کے اور جیولری پہن کر دکھا دیتی تھی۔ ان چیزوں کی وجہ سے ان کے درمیان کئی دفعہ لڑائی بھی ہو چکی تھی۔ وہ روز بازار جانا چاہتی تھی لیکن فرید کی ہمت نہیں پڑتی تھی ماں سے اجازت لینے کی۔

☆☆☆

اس روز عامر بھائی کا فون آیا اور انہوں نے جو خبر سنائی تو اس کی تو جان ہی نکل گئی۔ امی کو گلٹی پھر سے نکل آئی تھی۔ اس دفعہ بریسٹ کینسر کی خبر دی تھی ڈاکٹروں نے۔ ابو نے طبیعت کی خرابی کے باوجود ریٹائرمنٹ لینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب تک وہ جاب پر تھے ان کا اور اہلِ خانہ کی بیماری کا سارا خرچ محکمہ اٹھاتا۔ مجبوراً انہیں انتظار کرنا تھا کہ سلطانہ بیگم صحت یاب ہو جائیں تو وہ کوئی فیصلہ کریں۔ کینسر کا علاج اتنا مہنگا تھا کہ افسر صاحب افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ شبینہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس کی ساس نے چند الفاظ تسلی کے کہے۔ شام کو فرید آیا تو اس نے پاکستان جانے کا مطالبہ کر دیا۔ عامر بھائی تو جلد ہی جا رہے تھے۔ فرید کا ایک ہی جواب تھا میرے پاس پیسے نہیں، نہ ہی وہ کسی سے ادھار لینے کو تیار تھا۔ اس بات

کی وجہ سے اس کے اور شبینہ کے درمیان بحث شروع ہوگئی۔ ساس اور اس کی نندیں بھی کمرے میں داخل ہوگئیں۔ مختار بیگم نے تو کھلم کھلا فرید کا ساتھ دینا شروع کر دیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ شبینہ خود غرض ہے جو شوہر کی مجبوری نہیں سمجھ رہی ہے۔ اس کی نندیں ماں کی ہمنوا تھیں۔ شبینہ نے زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا لاچار اور بے بس محسوس کیا۔ وہ دن رات کڑھتی۔ اسے سب سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ لوگ کیسے انسان تھے جنہیں کسی کی تکلیف کی پروا نہیں تھی۔ فرید کی بے حسی اسے بہت دکھ دے رہی تھی۔ وہ تو اس کا جیون ساتھی تھا اور اس کے ساتھ صرف اس کے دیور نے ہمدردی کے چند بول بولے تھے۔ عامر بھائی نے بھی اسے ساتھ لے جانے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اسے پھر سے دادی ماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''زندگی صرف پھولوں کی سیج ہی نہیں بلکہ کانٹوں کے ساتھ جینے کا بھی نام ہے۔'' اس نے کب کانٹے دیکھے تھے۔ دادی ماں نے کتنا کہا تھا کمپیوٹر سیکھ لو کام آئے گا۔ آج وہ ای میل پر گھر والوں کے ساتھ رابطہ رکھ سکتی تھی، بات کر سکتی تھی۔ فرید اسے خرچ کے نام پر ہفتے میں صرف بیس پونڈ دیتا تھا جس میں سے بیشتر وہ فون کارڈز پر خرچ کر دیتی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد از جلد انگلش لینگویج اور کمپیوٹر کلاسز میں داخلہ لے گی۔

☆☆☆

لگتا تھا کہ قسمت کے ستارے گردش میں آگئے تھے۔ ایک کے بعد ایک پریشانی اسے گھیر رہی تھی۔ اس کی سمجھ ہی کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی کیوں یہ سب ہو رہا ہے۔ اسے ایک اور دھچکا لگا جب فرید نوکری چھوڑ کر آگیا۔ گویا محمود کی بات درست تھی کہ بنک کی نوکری کرنے کا قائل نہیں۔ وہ نوکری چھوڑ کر آگیا تھا کیونکہ کام کا بوجھ کافی تھا جس سے اس کی شوگر ہائی ہو جاتی تھی۔ شبینہ کو اپنا پاکستان جانا مزید مشکل نظر آنے لگا۔ اس کی پریشانی سوا ہو گئی جبکہ فرید نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ حکومت ہے ناں ہماری فکر کرنے کے لیے۔ ٹیکس دینے والوں کی خون پسینے کی کمائی سے حکومت اتنا پیسہ جمع کر لیتی ہے کہ ہم جیسوں کی جیب بھر سکے۔ پھر میں diabetic ہوں۔ پرفیکٹ ریزن ہے کہ میں کام نہیں کر سکتا۔ مزے سے تم بھی کھاؤ اور میں بھی عیش کرتا ہوں۔''

''لیکن فرید وہ تو ہفتے کے اتنے ہی پیسے دیتے ہیں جس سے دال روٹی چل سکے۔'' شبینہ نے فکر مندی سے کہا۔

''دال روٹی ہی کافی ہے۔ باقی گھر اپنا ہے۔ گاڑی ڈیڈی کی ہے اور کیا چاہیے۔'' انتہائی اطمینان سے اس نے پاؤں بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں کس طرح کی لائف اسٹائل سے آئی ہوں۔ یہ زندگی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ہمارے گھر میں کیا نہیں تھا۔''

شبینہ کو امید تھی کہ فرید بھی تو ماں، بہن کے چنگل سے آزاد ہوگا تب وہ اپنی دنیا الگ بسالے گی۔ اس کا خیال تھا کہ دو چار سالوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا اور یہاں تو فرید کا آگے بڑھنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی مختصر سی دنیا میں خوش تھا۔

شبینہ پر بجلی تب گری جب اس نے فرید سمیت تمام گھر والوں کو کمرے میں بند باتیں کرتے سنا۔ اس کی ساس کمالِ مکاری سے کہہ رہی تھیں۔

''فرید تم نے بہت اچھا کیا نوکری چھوڑ کر۔ تمہاری طبیعت تو ویسے بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ کیا ضرورت ہے اتنی محنت کرنے کی جب گزارہ ویسے ہی چل سکتا ہے ویسے بھی اگر تم نوکری کرتے رہتے تو شبینہ کی فرمائشیں بڑھتی رہتیں۔ ہم تو فیشن ایبل لڑکی

سے شادی کر کے پھنس گئے۔ کیا نخرے ہیں، کیا ادائیں ہیں، غلطی ہوگئی بیٹا! ایسی عورتیں شوہر کے پیسوں پر عیش کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔ تم کماتے رہتے اور وہ اڑاتی رہتی۔''

''وہ ممی ویسے بھی اس کی ماں بیمار ہے۔ اب تو پاکستان ہی جاتے رہنے تھا اس نے...... وہ الگ خرچا۔'' یہ اس کی نند تھی۔

''ویسے بھی پاکستان سے آئی ہوئی کو ہر وقت واپس جانے کی پڑی رہتی ہے۔ وہ یہاں سیٹل ہی نہیں ہوسکتیں۔'' یہ دوسری نند تھی۔ فرید بت بنا بیٹھا تھا۔ شبینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ انجام تھا دن رات کی خدمت کا۔ جس نند کے بچے وہ سنبھالتی تھی وہی یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ ان لوگوں میں انسانیت کہاں تھی۔ پر سچ ہے جو انسان بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ کبھی وہ بھی دوسروں کے بارے میں ایسی ہی باتیں کرتی تھیں۔ اس نے خدا سے صدقِ دل سے معافی مانگی۔ عظیم ہوتا ہے وہ انسان جو اپنی غلطی مان لے اور پھر شرمندہ بھی ہو۔ اس کے لیے فی الحال اس کا ازالہ کرنا تو ممکن نہیں تھا لیکن ندامت اس کے بس میں تھی جو اس نے بہت شدت سے محسوس کی۔

وہ اتنی ڈسٹرب تھی کہ گھر میں ٹھہرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے مریم سے بات کی تو اس نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ شبینہ نے صبح آنے کا وعدہ کر لیا۔ فرید کمرے میں آیا تو وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ شبینہ نے بھی کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بھرم قائم رکھنا چاہتی تھی۔ صبح وہ ساس سے بہانہ کر کے نکل آئی۔ وہ بھی ساتھ آنا چاہتی تھیں لیکن اس نے ٹال دیا۔ پہلی بار اکیلی نکل رہی تھی۔ بری طرح نروس تھی۔ اس نے بس کا ٹکٹ لیا۔ مریم کے گھر جانے تک اسے دو بسیں بدلنا تھیں۔ دوسری بس بدل کر وہ مریم کے گھر کے قریب پہنچی تو راستہ بھول چکی تھی۔ راستے میں ایک انگریز نے اسے اکیلا دیکھ کر مدد کی اور مریم کے گھر تک چھوڑ آیا۔ اس کا دل احسان مندی سے بھر آیا۔ مریم نے اس کی باتیں سن کر وہی کچھ کہا جو پہلے کہہ چکی تھی۔ البتہ شبینہ کا جی کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ جلد ہی گھر آئی تو پتا چلا کہ عامر بھائی واپس آچکے ہیں۔ اس سے ملنے آئیں گے۔ وہ امی کے متعلق جاننے کے لیے بے چین تھی۔ وہ آئے تو انہوں نے بتایا کہ امی کا علاج ہو رہا ہے۔ کیموتھراپی شروع ہوگئی ہے۔ بال جھڑ رہے ہیں اور وہ کافی کمزور ہوگئی ہیں۔ ابو کی حالت بھی بہتر نہیں ہے۔ سہیل لاہور سے واپس نہیں آسکتا کیونکہ اسے اسلام آباد میں جاب نہیں مل رہی۔ دادی ماں رضا کے ساتھ شفٹ ہو گئی تھیں۔ وہ ہونا نہیں چاہتی تھیں لیکن ان کی دیکھ بھال اب امی سے ممکن نہیں تھی۔ رضا اور پھپو بھی ضد کر کے انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اب اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد پاکستان چلی جائے۔

☆☆☆

سردیوں کی آمد تھی۔ سرد ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ اس کے پاکستان سے لائے شال، سوئیٹرز ناکافی لگ رہے تھے۔ اس نے فرید کو گرم کوٹ لانے کو کہا۔ وہ اسے سستے اسٹور پر لے گیا اور کوٹ دلا دیا۔ مختار بیگم نے دیکھا تو بولنا شروع ہوگئیں۔

''کیا ضرورت تھی کوٹ دلانے کی جب اس پر سیل لگتی تب لے دیتے۔ ویسے بھی یہ گھر پر ہی تو رہتی ہے۔ اس نے کہاں جانا ہے جو کوٹ چاہیے۔''

اس نے بھی غصے سے جواب دے دیا۔ ''سردی اتنی ہے کہ دروازے تک جانے کے لیے کوٹ چاہیے۔ کیا میری اتنی بھی حیثیت نہیں کہ میں اپنے شوہر سے کوٹ کی فرمائش کر سکوں۔ میری ضرورتیں پوری کرنا اس کا فرض ہے۔ میں نے کوئی ناجائز مطالبہ نہیں کیا۔'' مختار بیگم کو جواب کی توقع نہیں تھی۔

ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

شبینہ کو احساس ہو گیا تھا کہ فرید ماں کے کنٹرول میں ہے انہوں نے لاڈ پیار سے اسے بچہ بنا رکھا تھا۔ گیارہ بجے وہ سو کر اٹھتا اور اکثر دوستوں کے ساتھ پھرتا رہتا۔ ان کی گاڑیوں کو تیز اسپیڈ پر دوڑاتا اور اونچی آواز میں میوزک سنتا۔ کئی دفعہ پولیس نے اسے اوور اسپیڈ پر روکا بھی تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ وہ ایک دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اگر اسے باہر نکلنا ہے تو خود ہاتھ پیر مارنے ہوں گے۔ بیوٹی پارلر کا کیا ہوا کورس اب اس کے کام آنے لگا۔ وہ فرید کی کزنز کی ویکسنگ، تھریڈنگ کر دیتی اور وہ اسے عام پارلرز کی نسبت کم پیسے دیتیں لیکن بہر حال وہ کچھ نہ کچھ کمانے لگی تھی۔ فیشیل، کٹنگ، میک اپ بھی وہ کم داموں کر دیتی اس لیے اس کی مانگ میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ کھانا بہت اچھا بناتی تھی۔ ان کی ہمسائے کے آفس میں پارٹی تھی۔ اس کی فرمائش پر اس نے پکوڑے، سموسے اور کباب بنا دیے پھر کیا تھا۔ اسے کیک اور دوسرے کھانوں کے آرڈر ملنے لگے۔ گھر میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی۔ وہ جلد از جلد پیسے جمع کر کے پاکستان جانا چاہتی تھی۔ مختار بیگم بہت جز بز تھیں۔ وہ اس کے کیٹرنگ آرڈر سے بہت ناراض ہوئیں وہ ان کی ناراضی کی وجہ جانتی تھی لیکن پیسے دے کر ان کی عادتیں نہیں بگاڑنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر امی، ابو سے ملنے کی دُھن سوار تھی۔ کبھی کبھار فرید بھی اس سے پیسے مانگ لیتا تھا جو وہ بہانے سے ٹال دیتی تو وہ بھی اس سے لڑ پڑتا۔ وہ اسے کام تلاش کرنے کو کہتی تو اس کا موڈ مزید خراب ہو جاتا۔ وہ اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ زندگی کو احسن طریقے سے گزارے، بیوی کے حقوق پورے کرے لیکن فرید یہ سب سننے پر تیار نہیں تھا۔

عامر بھائی کا فون آیا یہ بتانے کے لیے کہ انہیں ایک انڈین مسلمان ڈاکٹر پسند آ گئی ہے۔ وہ بھی اسپتال میں ان کے ساتھ کام کرتی ہے۔ وہ اس سے جلد ہی شادی کرنا چاہتے ہیں اور شبینہ کو بری بنانے کا کام سونپا انہوں نے۔ وہ حیران پریشان رہ گئی۔ امی بیمار ہیں اور انہیں شادی کی سوجھی ہے۔ اسے عامر کی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ اسے ڈر تھا امی، ابو کی ناراضی کا۔ انہیں فون کیا تو امی کو بہت بدلا ہوا پایا۔

”بیٹے کی پسند میری پسند...... اس نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہوگا۔ زندگی اس نے گزارنی ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ یہ اعتراض بھی نہیں کہ ہم شریک نہیں ہو سکیں گے۔ خدا کی یہی مرضی ہے۔ انسان کو ہر حال میں پروردگار کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ امی کے خیالات جان کر وہ بہت حیران ہوئی۔ کتنا بدل گئی تھیں وہ۔ وہ تو گرج چمک کی توقع کر رہی تھی اور یہاں ٹھنڈی پھوار پڑ رہی تھی۔ وقت ہر موسم کو بدل دیتا ہے۔

☆☆☆

سردیوں کا موسم شدت اختیار کر رہا تھا۔ اسے انگلینڈ آئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ یہ چھ ماہ سسک سسک کر گزرے تھے۔ اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اسے زندگی نے رنگینی سے سنگینی تک کے موڑ دکھا دیے تھے۔ اس نے سیکھنے اور آگے بڑھنے کا پختہ فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک روز انگریزی اور کمپیوٹر کلاسز میں داخلہ لینے کے لیے جا پہنچی۔ سینٹر start ford road پر ہی تھا۔ اس نے پہلے بھی دیکھ رکھا تھا۔ کلاسز جنوری میں شروع ہو رہی تھیں۔ ہر جگہ کرسمس کی چہل پہل تھی۔ ہر جگہ سجی ہوئی تھی۔ وہ بس پر سوار ہو کر سٹی سینٹر جا پہنچی جو دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہر اسٹور سجا ہوا تھا۔ وہ ان کی سجاوٹ میں کھو گئی اور ہوش تب آیا جب دکانیں بند ہونے لگیں۔ وہ جلدی سے بس اسٹاپ کی طرف بھاگی۔ لمبی لمبی قطاریں بنائے لوگ انتظار کر رہے

تھے۔ بس میں بے پناہ رش تھا۔ واپسی پر اندھیرا ہو گیا تھا۔ سجے ہوئے گھر بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔ لوگوں نے طرح طرح سے گھر سجا رکھے تھے۔ کہیں روشنیاں تھیں اور کہیں فادر کرسمس...... بچوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ تحفوں کے تصور سے خوش ہو رہے تھے۔

گھر پہنچی تو ایک طوفان اس کا منتظر تھا۔ گھر کا ہر فرد موجود تھا۔ اس کی ساس اور سسر نے اس پر چڑھائی کر دی۔ دونوں یہ جاننے پر مُصر تھے کہ وہ کہاں گئی تھی۔ وہ طرح طرح کے شکوک کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کی بات سن ہی نہیں رہے تھے۔ نندیں بھی کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے بھی غصہ چڑھ گیا۔ اس نے فرید سے چیخ کر کہا۔

”تم کیا سب کا منہ دیکھ رہے ہو۔ کچھ تو بولو، تم مجھے جانتے ہو۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تمہارے گھر والے جانے کیا کیا بول رہے ہیں۔ خدا کے لیے انہیں بتاؤ کہ میں تمہیں بتا کر گئی تھی۔ میں بھی انسان ہوں۔ میرا بھی باہر نکلنے کو جی چاہتا ہے۔ تم تو کہیں لے کر نہیں جاتے۔“

”شبینہ یہ انگلینڈ ہے۔ یہاں کوئی پتا نہیں ہوتا کہ کون کیا کر جائے۔ تمہیں امی کو ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا“ فرید ہکلا ہکلا کر بولنے لگا۔

شبینہ کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ میں یہاں کی پیداوار نہیں ہوں کہ چھوٹی سی پتلون چڑھا کر بچے ماں کے سر پر ڈال کر کہیں بھی پھرتی رہوں۔“

یہ سننا تھا کہ اس کی نندوں کو آگ لگ گئی۔ اس کی ساس نے آگے بڑھ کر شبینہ کے بال جکڑ لیے اور بولیں۔ ”فرید اس کی زبان کاٹ ڈال۔ یہ تمیز ماں، باپ نے سکھائی ہے۔ ہم اچھے گھرانے کی سمجھ کر لائے تھے اور یہ نکلی ذلیل...... طلاق دے اسے...... پاکستان واپس بھیج۔ میں تیرا رشتہ خاندان سے کروں گی۔ عزت تو کرے گی وہ۔ کہاں ہے اس کا پاسپورٹ...... ابھی اس کو ٹکٹ دلا اور واپس دفع کر۔ ہمارا احسان ہے کہ یہ انگلینڈ آ گئی۔“

”کوئی احسان نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود تھا میرا۔ یہ میری بدقسمتی ہے جو اس گھر میں شادی ہو گئی۔ سارا دن تم لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کام کرتی ہوں اور تب بھی میری کوئی عزت نہیں۔ کوئی اہمیت نہیں۔ اگر نوکر رکھتے تم لوگ تو اسے بھی پیسے دیتے۔ میں تو غلام ہوں۔“ شبینہ نے بھی اپنا غبار نکالا۔

”ہاں تو ہم پاکستان سے بیاہ کر لاتے کیوں ہیں؟ تم لوگ کیڑوں کی طرح ہو وہاں پر۔ مرتے ہو یہاں آنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوتے ہو۔ اتنی نواب زادی تھی تو کیوں کی تمہارے ماں باپ نے یہاں شادی...... ہم کیا یہاں ساری دنیا اسی لیے شادی کرتی ہے کہ وہاں سے لائی ہوئی کو مٹھی میں رکھیں اسے اس کی اوقات یاد دلاتے رہیں۔“ یہ اس کے سسر تھے جو لوگوں کو قرابت داروں کے حقوق اور احسن سلوک پر لیکچر دیتے تھے۔ یہ ان کا اصل روپ تھا۔ بیوی کے اشارہ کرنے پر چپ ہو گئے۔ اس وقت اس کا دیور اس کی حمایت میں آگے بڑھا۔

”مم، ڈیڈ...... اس طرح کی باتیں کرنا اچھی بات نہیں۔ وہ آپ کی بہو ہے۔ اس کی ماں بیمار ہے۔ اسے سپورٹ کی ضرورت ہے۔ وہ نئی ہے اس ملک میں۔ زبان کا مسئلہ ہے۔ سسٹم مختلف ہے بالکل...... اسے مدد کی ضرورت ہے وہ تو new born baby کے مانند ہے جسے سب کچھ سیکھنا ہے۔ اس میں صلاحیت بھی ہے اگر پولیس کو پتا چل گیا کہ اس پر abuse ہو رہا ہے تو آپ کو پتا ہے ناں کہ کیا ہو سکتا ہے؟“ فرید جلدی سے شبینہ کو کمرے میں لے گیا۔

ماں، بیٹے میں بحث چھڑ گئی تھی۔ سارا گھر ماں کا ساتھ دے رہا تھا۔

فرید نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ بہت دکھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اسے لگا کہ وہ ساری دنیا میں تنہا ہے۔ اس نے خدا سے شکوہ کیا۔ ''یا خدا! میں نے ایسا کیا کیا ہے جس کی سزا اتنی بڑی ہے۔'' اتنی اکیلی پڑ گئی تھی وہ اجنبی دیار میں۔ غریب الوطنی کیا ہوتی ہے اسے پہلی بار احساس ہوا۔ مسافروں کے حقوق کیوں رکھے گئے ہیں آج اسے معلوم ہوا۔ وہ بے بس تھی، ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔ جتنی توہین آج اس کی ہوئی تھی اگر وہ پہلے والی شبینہ ہوتی تو کب کی پاکستان جا چکی ہوتی لیکن ماں، باپ کی مجبوریاں اس کے سامنے تھیں۔ اپنا وطن اپنا ہے اس نے آہ بھری۔ وہ کہاں جائے اور کس سے مدد مانگے جو اپنا لایا تھا وہ کنفیوزڈ پرسنلٹی ہے۔ وہ تو اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتا بھلا اس کی زندگی کو کیا سدھارتا۔

سارا دن وہ کمرے میں بند رہی...... بھوکی پیاسی کسی نے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہیں پوچھا۔ وہ غریب الوطن ہی نہیں تھی بلکہ بے اماں بھی تھی۔ رات کو فرید نے اسے چاکلیٹ بار لا کر دی تو اس نے انکار کر دیا۔ دو روز بعد کسی آرڈر پر اسے کیک بنا کر دینا تھا۔ آخر اگلے روز ڈھیٹ بن کر اٹھی اور روز کے معمول میں گم ہو گئی۔ گھر والوں سے البتہ اس کی بات چیت بند تھی۔

کرسمس کا تہوار آیا اور گزر گیا۔ ساری دنیا نے چراغاں کیا پر اس کی دنیا میں اندھیرا رہا۔ نیا سال چڑھا۔ سب نے آتش بازی کا لطف لیا۔ اس کی ویرانی میں اضافہ ہوا۔ وہ دن رات کام کر رہی تھی تاکہ جلد از جلد پاکستان جا سکے۔ وہ ہنوز منگیتر کے ویزے پر تھی۔ لہٰذا حکومتی مراعات سے محروم تھی۔

جنوری میں داخلے کھل گئے۔ وہ انگریزی اور کمپیوٹر کلاسوں میں بھی جانے لگی۔ اس نے ابتدائی ٹیسٹ بہ آسانی پاس کر لیے۔ اسے لیول فور میں داخلہ مل گیا جس میں بول چال اور ایڈوانس written english سکھائی جاتی تھی۔ کلاسز میں جانے سے اسے سکون ملا۔ چند گھنٹوں کے لیے وہ گھر کے شوریدہ ماحول سے دور ہو جاتی۔ نئے لوگوں سے ملنے کی وجہ سے اس میں اعتماد بیدار ہوا۔ اس کی کلاس میں زیادہ تعداد ان لڑکیوں کی تھی جو پاکستان اور بنگلا دیش سے شادی کر کے آئی تھیں۔ اس کے علاوہ دوسرے غیر ملکی بھی تھے۔ شبینہ ان میں سب سے الگ تھی، اپنی ڈریسنگ اور مینرز کی وجہ سے۔ باقی پاکستانی دیہاتی انداز کے تھے اور اپنے فرسٹ کزنز میں بیاہے ہوئے تھے۔ اس کی خوش پوشاکی اور خوب صورتی کی اس کی گوری ٹیچر بھی مداح تھی۔

جب اس نے پاکستان میں اپنے گھر والوں کے متعلق بتایا تو وہ سب بہت متاثر ہوئے۔

اس کی کلاس میں موجود بیشتر لوگوں کی کہانی اس کی کتھا سے مختلف نہیں تھی۔ ان کی سسرال کا رویہ ان کی جانب توہین آمیز تھا۔ انہیں یہاں بلا کر نوکروں جیسا سلوک شروع کر دیا تھا۔ چند ایک کے شوہر حضرات نے تو شادی کے شروع میں انہیں ان پڑھ، جاہل کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود بچے پیدا کرنے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سب کے سب بینیفٹس پر تھے اور مستقبل میں بھی نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ اس حکومت کا قابلِ فخر اور قابلِ ذکر دستور تھا مگر ناشکر گزار لوگ پھر بھی جس تھالی میں.... کھاتے اس تھالی میں چھید کرنے والا عمل اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان عورتوں کی زندگی ویران و بے مقصد تھی مگر اس کے باوجود ان کے لیے انگلینڈ جنت سے کم نہیں تھا دراصل جن علاقوں سے وہ لوگ

آئے تھے وہاں بے پناہ غربت تھی۔ انہوں نے بہت مشکل حالات دیکھے تھے۔ یہاں آ کر اپنے سگے رشتوں داروں کے برے سلوک کے باوجود اپنے بہن، بھائیوں کی شادیاں انہی رشتے داروں میں کروانے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ چاہتے تھے یا چاہتی تھیں کہ کسی بھی طرح ان کے بہن، بھائی اس ملک میں آ جائیں اور اس کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ یہاں تو ان بوڑھے افراد کو بھی ماہانہ لاؤنس ملتا تھا جنہوں نے یہاں پر کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔

اپریل میں ایسٹر کا تہوار تھا اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے کہ پاکستان جا سکے۔ بالآخر اس روز وہ ٹکٹ لے کر اپنی قومی ائر لائن کے طیارے پر سوار ہوئی تو عجب ہی منظر تھا۔ وہاں ٹائٹ جینز اور سلیولیس شرٹس پہنے، ماتھے پر بال ڈالے لڑکے، زیورات سے لدی لڑکیوں کے ساتھ سوار تھے۔ کچھ بوڑھی مائیں اپنی جوان پتلی دبلی کھلے پانچوں والے ٹراؤز پہنے لڑکیوں کے ساتھ سوار تھیں۔ سب کے ہاتھوں میں لال پاسپورٹ تھے۔ بھی ایک دوسرے کو دھکے مار مار کر سیٹیں قابو کر رہے تھے وہ اپنے نمبر پر پہنچی تو اس کی سیٹ پر ماں بیٹیاں سوار تھیں اس نے انہیں اٹھنے کو کہا تو انہوں نے میرپوری اور انگریزی میں اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اسٹیورڈ پاس ہی تھا۔ وہ اس کی مدد کو آیا تو وہ اس پر بھی ناراض ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے اسے کہیں اور جگہ ملی۔ اتنی نفسا نفسی تھی کہ لگتا تھا میدانِ حشر دراصل یہ جہاز ہی ہے۔ سوری، تھینک یو کا استعمال تو شاید یہ لوگ جانتے ہی نہیں تھے۔ اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔ لگتا ہی نہیں تھا اس جہاز کے مسافر تہذیب یافتہ ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے اردگرد کے مسافر ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سارے رستے خاندانی سیاست چلتی رہی اور رشتے بھی طے ہوتے رہے۔

اسلام آباد ائر پورٹ پر پھر دھکم پیل کا سماں شروع ہو گیا۔ ہر کوئی جلد از جلد نکلنا چاہتا تھا۔ اس کا سامان بہت پہلے آ گیا تھا لیکن انتارش تھا کہ وہ سب سے آخر میں نکلی۔ امی، ابو، پھپھو، خالہ سب لینے آئے تھے۔ امی پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ابو لاٹھی کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔ ان کے گلے لگ کر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ تپتے صحرا سے نخلستان میں آ گئی تھی۔ امی، ابو بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے۔

گھر آ کر وہ ایک ایک چیز کو چھو رہی تھی۔ اس کی زندگی کا بہترین دور یہاں منقش تھا۔ گھر میں بھی دکھ کے سائے لرزاں تھے۔ امی نے خود اس کے لیے کھانے بنائے تھے۔ ماں کے ہاتھ کے کھانے اسے جنت کے طعام لگے۔ وہ سب کے لیے کچھ نہ کچھ لائی تھی۔

کئی روز پرانی یادیں تازہ کرتے گزر گئے۔ اس نے امی، ابو کو اپنے حالات کے متعلق زیادہ نہیں بتایا۔ وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دادی ماں کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ زیادہ باہر نہیں نکلتی تھیں۔ وہ انہیں ملنے رضا کے گھر گئی تو دنگ رہ گئی۔ انتہائی خوب صورت وسیع و عریض بنگلا اور اس میں بہترین گاڑیاں کھڑی تھیں، وہ ابھی ابھی دفتر سے آیا تھا۔ سوٹ پہنے ہوا تھا۔ اس کا جسم بھر گیا تھا، پچکے گال بھر گئے تھے، میانہ قد نمایاں ہونے لگا تھا، وہ بہت پُروقار لگ رہا تھا۔ اس کی بیوی کافی خوب صورت تھی۔ تھوڑی موٹی ہو گئی تھی پر وہ خوش حالی و بے فکری کی نشانی تھی۔ نوکرانی نے بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ خانساماں نے لذیذ کھانے بنا رکھے تھے۔ وہ رشک بھری نگاہوں سے ان میاں بیوی کو دیکھ رہی تھی، کتنے مطمئن نظر آ رہے تھے وہ لوگ کتنے استحقاق سے اس کی بیوی نوکروں پر حکم چلاتی، گھر کے بارے میں احکامات

دیتی...... رضا سے مشورہ کرتی اسے عجیب سا لگا۔ رضا کی نگاہوں میں بیوی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ رضا نے شبینہ کو دیکھا تو اسے دھچکا لگا۔ اس کی نگاہوں میں وہی تھنی پہنے الہڑسی کیوٹ سی لڑکی آگئی۔ وہ بہت دبلی ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ ناخن ٹوٹے ہوئے تھے۔ کپڑے پرانے پرانے سے لگ رہے تھے۔ وہ کہیں سے بھی ویسی نہیں لگ رہی تھی جیسا وہ تصور کررہا تھا۔ دراصل تمام لوگوں کو کچھ کچھ اندازہ ہوچکا تھا اس کے حالات کے بارے میں۔ سب نے باری باری فرید کے نہ آنے کا پوچھا۔ وہ مصروفیت کا بہانہ کرتی رہی۔ کچھ نے تو منہ پر کہہ دیا۔

”پہلی بار بیوی کو خود لانا چاہیے تھا۔ یہ تو بیوی کا مان ہوتا ہے۔“

وہ آٹھ ہفتوں کے لیے آئی تھی۔ چار ہفتے یوں بیتے جیسے چار دن۔ فرید اسے ہفتے میں تین دن فون کرتا۔ اس نے آتے وقت اسے صرف سو پونڈ دیے تھے جو اس وقت دس ہزار بنتے تھے۔ اپنی کوئی رقم نہیں تھی اس کے پاس۔ امی نے اس کے لیے کافی جوڑے بنوا کر رکھے تھے پر اس کا دل ہی نہیں کرتا تھا پہننے کو۔ سہیل نے لاہور میں ہی ماموں کی بیٹی شہلا سے شادی کا ارادہ کرلیا تھا۔ وہ سب رشتہ لینے کے لیے گئے۔ سہیل میں مزید شوخی آگئی تھی۔ لاہوریوں کی طرح اسے مذاق کرنے کی لت لگ گئی تھی۔ شہلا بھی اس کا خوب ساتھ دیتی۔ باہر نکلتے تو سارا وقت دوسروں پر تبصرے کرتے رہتے کبھی وہ بھی ایسی تھی۔ اب اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان لوگوں نے زندگی کے تاریک پہلو نہیں دیکھے تھے تبھی ان میں ہنسی اڑانے کا حوصلہ تھا۔ اس کی شہلا سے کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ کافی خود پسند تھی۔ ماں کی طرح شبینہ بھی اب راضی برضا ہوگئی تھی وہ خوش اخلاقی سے سب سے پیش آئی۔ منگنی کرکے وہ لوگ واپس آگئے تھے۔

امی کے علاج کے بعد ابو کا ریٹائر ہونے کا فیصلہ ہنوز برقرار تھا۔ شاید امی کی مکمل صحت یابی کے بعد وہ ویسے ہی ریٹائرمنٹ کی ایج کو پہنچ جاتے۔ وہ لوگ سہیل کے پاس شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ امی بہت مذہبی ہوگئی تھیں۔ نہایت حلیم الطبع اور خاموش مزاج...... ان کی نندوں نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ ماضی کی غلطیوں پر نادم تھیں۔ انہیں رضا کا رشتہ قبول نہ کرنے کا بہت دکھ تھا۔ اس لڑکے کے گن انہیں اب نظر آرہے تھے۔ وہ شبینہ کو یاد کرکے بہت رویا کرتی تھیں شبینہ کو جانے کا خیال آتا تو دل درد سے بھر جاتا۔ وہ کبھی نہ جاتی اگر وہ یہاں کچھ کرنے کے قابل ہوتی۔ محمود نے اسے ای میل کی تھی اس کی ساس زور شور سے اس کے خلاف لگی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس کا ویزا کینسل کروا دیا جائے۔ اسے ڈر لگنے لگا اگر ایسا ہوجاتا تو اس کی بہت بے عزتی ہونی تھی۔ امی، ابو کو بھی بہت دکھ ہوتا۔ اسے کہیں سے بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ ویسے بھی دو سال بعد اس کا ویزا پکا اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب فرید کماتا ہو۔ فرید اگر حکومتی مراعات پر ہی رہتا تو اس کے پکا ہونے کے احکامات بہت کم تھے۔ شاید اسی لیے اس کی ساس نہیں چاہتی تھیں کہ فرید جاب کرے۔

آٹھ ہفتوں کے بجائے وہ بارہ ہفتے کا قیام مکمل کرکے واپس روانہ ہوئی تو سارا راستہ روتی رہی۔ اسے امی، ابو اور پاکستان سب شدت سے یاد آرہے تھے۔ فرید اسے لینے آیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ اسے ڈپریشن ہونے لگا۔ مریم نے اسے ایڈوائزری سروس کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ وہ کسی بھی طرح اس ماحول سے نجات پانا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا اگر وہ یہاں رہی تو مرجائے گی۔ یہ زندگی بند گلی کے مانند تھی۔ جہاں سے کوئی راستہ منزل کی طرف نہیں جاتا تھا مگر وہ اپنا گھر بھی بسانا چاہتی تھی اور اس کے لیے

تدبیریں سوچتی رہتی تھی۔ ایڈوائزری سروس نے اس کی بہت مدد کی۔ اسے معلوم ہوا کہ یہاں بے حد مدد دستیاب ہے۔ آپ کو اپنے حالات سدھارنے کے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ اس نے مزید پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ انگریزی جاری رکھتے ہوئے شام کے کالج میں داخلہ لے لیا اور ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ وہ پاکستان سے بی اے کرکے آئی تھی۔ اس دفعہ وہ اپنے کاغذات بھی لے آئی تھی۔ لہٰذا کالج نے امتحان لے کر اسے اے لیول میں داخلہ دے دیا۔ اس نے پارٹ ٹائم نوکری کرنے کا بھی فیصلہ کرلیا۔ اس صورت میں اسے پکا ویزا ملنے کے امکانات کافی بہتر ہوجاتے۔ اسپتال میں اسٹنٹ نرس کی جاب نکلی۔ وہ تربیت فراہم کررہے تھے جاب ہفتے میں دو دن کی تھی یوں اس کی پڑھائی کا خرچ نکلنے لگا۔ اس کی ترقی دیکھ کر اس کے سسرال کا حلقہ اس پر تنگ ہونے لگا۔ وہ اس کو گھر کے کاموں میں الجھانے لگے۔ وہ اکثر لیٹ ہوجاتی۔ اس نے اپنی ٹیچرز اور باس کو اپنے حالات بتائے تو انہوں نے اسے لیٹ آنے کی اجازت دے دی۔ اس کی منیجر نے اس کا جذبہ دیکھتے ہوئے اگلے سال اے لیولز کا باقی حصہ مکمل کرنے کے لیے گرانٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اے لیول میں بیالوجی پڑھنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنے کیریئر کو آگے بڑھا سکے۔ اس کے لیے یہ نیا مضمون تھا لیکن اس کے ٹیوٹر نے بہت مدد کی۔ کالج کے خرچے پر اسٹنٹ منگوا کر دیا جو اسے سمجھاتا۔ امتحان دینے کے طریقے بتاتا۔ کالج نے اس کی بہت مدد کی۔ شروع شروع میں اسٹنٹ کلاس میں بھی اس کے ساتھ جاتا اور ٹیوٹر کے لیکچرز آسان کردیتا۔ سال بھر میں وہ خود سمجھنے کے قابل ہوگئی۔ سسرال میں اس پر بچہ پیدا کرنے کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس کو بانجھ ہونے کے طعنے دیے جارہے تھے۔ وہ بہت تحمل کے ساتھ سب برداشت کررہی تھی۔ فرید کا موڈ بدلتا رہتا۔ وہ یہی بہانہ کرتی کہ وہ پکا ویزا حاصل کرنے کے لیے یہ سب کررہی ہے۔

دو سال بعد اس نے اے لیول پاس کرلیا۔ اس کے گریڈ بی اور سی تھے لیکن نوکری میں متعلقہ تجربہ حاصل کرنے کی بنا پر کمیونٹی کی زبانیں جاننے کی وجہ سے اور انگریزی پہلی زبان نہ ہونے کے باوجود بی اور سی حاصل کرنے کی وجہ سے اسے پری نرسنگ میں داخلہ مل گیا۔ یہ فل ٹائم کورس تھا۔ نرسوں کی کمی ہے

بے نام عید کارڈ

بے نام سا یہ عید کارڈ
دلاتا ہے ہم کو خوب یاد
عمر کے سلسلے تمام......
جواَب تو ہوگئے ہیں خواب
بے نام سا یہ عید کارڈ
مچا گیا ہے قیامتیں
جتا گیا ہے الفتیں
اس میں لکھے سب اشعار
چھیڑتے ہیں دل کے تار
بے نام سا یہ عید کارڈ
حسرتیں جگا گیا......
بزدل ہے وہ! بتا گیا
لیکن یہ سوچتے ہیں ہم
وہ یاد بھی نہ آئے اب
اور کارڈ بھی ملے نہ یوں
جیسے...... کہ وہ نہیں ملا!

شاعرہ، شگفتہ شفیق
مرسلہ: تبسم شمس، کراچی

انگلینڈ میں۔۔اس لیے اسے نوکری ملنے کی خاصی امید تھی۔ اس کے علاوہ نرسنگ کے پیشے کی وہاں بہت عزت واہمیت ہے۔ اسے پروفیشنل ڈگری سمجھا جاتا ہے اور بعض کلینک میں ڈاکٹر بھی نرس کے پاس بھیج دیتے ہیں مریضوں کو۔ ان کی تربیت کافی سخت ہوتی ہے۔ جب اسے داخلہ ملا تو اس کی نندیں جلن میں مبتلا ہوگئیں۔ وہ ان سب سے آگے نکل گئی تھی۔ اب تک وہ اسے واپس بھیجنے کی فکر میں تھے۔ آخر وہ لمحہ بھی آگیا جس سے سب نے اسے ڈرا رکھا تھا۔ امیگریشن آفیسر کو انٹرویو دینے کا۔ فرید اور وہ گئے تو ترجمان بھی موجود تھا۔ شبینہ نے آگے بڑھ کر بہت اعتماد سے انگریزی بولنی شروع کی تو ترجمان اٹھ کر چلا گیا۔ امیگریشن آفیسر شبینہ سے بہت متاثر ہوا۔ پاکستان سے آئی اکثر لڑکیاں اس جیسی تو نہیں ہوتیں۔ وہ نہ انگریزی بولتی ہیں اور نہ ہی ڈھنگ کے کپڑے پہنتی ہیں۔ جب اسے شبینہ کی تعلیم کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی اور خوشی خوشی پکا ویزا دے دیا۔

☆☆☆

زندگی نے کیسا پلٹا کھایا اور کیا، کیا رنگ دکھائے۔ خدا کا نظام کائنات بھی کتنا منظم ہے۔ وہ انسان کو باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی بدل دیتا ہے۔

"میں جب پہلی بار انگلینڈ جارہی تھی تو کتنی مختلف تھی اور آج کتنی مختلف ہوں۔ ان دس سالوں میں، میں نے دس صدیاں بتادیں۔" شبینہ نے جہاز میں آئینہ دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ پاکستان سے واپس انگلینڈ جارہی تھی۔ آٹھ گھنٹے کے لمبے سفر میں یادوں نے پٹاری سے نکل کراس پر حملہ کردیا تھا۔ یہ دس سال اتنے مصروف گزرے تھے کہ اسے کچھ سوچنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ دن رات اس نے زندگی بنانے کے لیے محنت کی۔ آج وہ خود پر فخر کررہی تھی۔ اپنی نظروں میں سرخرو تھی اور دوسروں کی نگاہوں میں کامیاب۔ اس نے پھر سے آئینہ اٹھایا اور خود کو دیکھنے لگی۔ دس سال پہلے والی الہڑ و بھولی بھالی شبینہ......اب دنیا شناس و پُروقار سسٹر شیب میں تبدیل ہوگئی تھی۔ شبینہ پکارنا سب کو مشکل لگتا تھا لہٰذا اسے سسٹر شیب پکارا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد لکیریں پڑ چکی تھیں۔ چہرے سے بھولپن غائب ہوگیا تھا۔ بالوں میں چاندنی اترنے لگی تھی۔ آواز میں کرختگی غالب تھی۔ ہر انداز سے خود اعتمادی نمایاں تھی۔ اس کا چہرہ گئے برسوں کی کہانی سناتا تھا۔ اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ عام عورتوں کی طرح اسے ڈھلتی جوانی کا خاص غم نہ تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھا۔ ان لکیروں میں اس نے اپنی تقدیر خود لکھی تھی۔ جس میں دکھ سکھ کا ملاپ تھا۔ کتنی جدوجہد کی تھی اس نے...... پکا ویزا ملتے ہی اس نے سوشل سروسز کے پھیرے لگا لگا کر مکان حاصل کیا۔ مختصر سا صرف ایک کمرے کا۔ انتہائی معمولی علاقے میں۔ اس مکان کا ملنا گویا نئی زندگی کی کنجی مل جانے کے برابر تھا۔ اس نے بہت جتن سے سوشل ورکر کو قائل کیا تھا کہ اس کی سسرال والے اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ اس کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر اسے مکان الاٹ ہوا۔ فرید کافی عرصے ماں کے گھر ہی کھانا کھاتا رہا۔ کبھی رات کو آتا، کبھی نہیں۔ اسے دکھ تھا کہ شبینہ نے اسے اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیا تھا لیکن شبینہ کو اس پر یقین تھا ہی نہیں۔ وہ کبھی اسے اس گھر سے نہ جانے دیتا۔ وہ خوش تھی۔ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ پڑھائی پر توجہ دے سکی۔ دو سال کی فل ٹائم پڑھائی کے بعد وہ احتیاط کے باوجود امید سے ہوگئی۔ سسٹم پھر اس کی مدد کو آگے بڑھا۔ اسے دو سال ہاف ٹائم کی پڑھائی کے لیے مل گئے۔ بچے کے لیے بڑا گھر بھی مل گیا۔ تنخواہ کے ساتھ چھٹی بھی مل گئی۔ بچہ اپنا

نصیب خود لے کر آیا تھا۔ سسرال والوں نے اس کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ یہ بات بھی اس کے حق میں جاتی تھی۔ اسے پڑھائی کے لیے ٹائم مل جاتا تھا۔ بچے کے بعد اس کی ساس اور نندوں سے بول چال کسی حد تک بحال ہوگئی تھی۔ وہ کبھی کبھی اس کے گھر آجاتے۔ اس کی پڑھائی ختم ہوئی تو دوسرا بچہ اپنے پروگرام کے تحت اس دنیا میں لے آئی تاکہ دو بچوں سے فیملی مکمل ہوجائے جب تک وہ پڑھ رہی تھی حکومت نرسری کے پیسے دیتی رہی۔ فرید کو ہمیشہ سے بچوں سے لگاؤ تھا۔ شادی کے فوراً بعد وہ بچے چاہتا تھا لیکن اللہ کی مصلحت کہ شروع میں بچے نہ ہوئے۔ جب شبینہ کو اپنے حالات کا اندازہ ہوا تو وہ محتاط ہوگئی۔ بچوں کے بعد فرید کا زیادہ وقت اپنے گھر میں گزرنے لگا۔ اس کی تمام بہنوں کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ اس کی ماں کی توجہ اس سے کم ہوگئی تھی۔ اس کے دوست بھی کام کاج یا گھریلو زندگی میں مدغم ہوچکے تھے۔ شبینہ کے امتحانات کے دنوں میں وہ بخوشی بچے سنبھال لیتا تھا۔ تعلیم مکمل ہوجانے کے بعد شبینہ کو Heart land hospital میں جاب مل گئی جو ایشینز کے علاقے میں تھا۔ وہ خوش تھی اسے اپنی زبان بولنے کو مل جاتی تھی۔ ڈاکٹرز بھی انڈین یا پاکستانی تھے۔ بچے نرسری جاتے جس کا خرچ حکومت برداشت کرتی۔ رات کی ڈیوٹی ہونے پر فرید بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ اس نے پارٹ ٹائم جاب کرلی تھی کمپیوٹر بیچنے والی دکان پر کام آسان تھا۔ وہ گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ گھر کے کام کرکے خوش رہتا۔ رات دن کی محنت کے بعد ان دونوں نے مکان خرید لیا۔

زندگی کافی حد تک اپنی ڈگر پر رواں تھی۔ وہ اتنی مصروف رہی کہ چاہنے کے باوجود پاکستان نہ جاسکی۔ دس سال بعد جب وہ پاکستان جارہی تھی اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے ماں باپ دو دفعہ اس کے پاس آچکے تھے۔ اب وہ ملنے جارہی تھی۔ اب وہ لوگ لاہور میں رہتے تھے۔ دادی کا انتقال ہوچکا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اپنی پسند کے رنگ میں ڈھلی پوتی کو نہ دیکھ سکیں۔ سب سے زیادہ خوشی اسے پھپو رفعت سے مل کر ہوئی۔ انہوں نے اس سے بے شمار سوالات اس کی پروفیشنل زندگی کے متعلق کیے کیونکہ پھپو واقعی قابل نرس تھیں۔ اسے ان کی قابلیت اور ہنر کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ کی مستحق تھیں جو انہیں ملا۔ کاش ہمارا معاشرہ معزز پیشوں کو ان کی جائز عزت دے سکے۔ ایک نرس اسپتال میں کتنا اہم کردار ادا کرتی ہے یہ شبینہ کو اب معلوم ہوا تھا۔ اس کے بغیر کوئی بھی ڈاکٹر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ اسے اب شدت سے اس کا احساس ہوا کہ خاندان میں کسی نے بھی پھپو کو ان کا جائز حق نہیں دیا اور نہ ہی معاشرے نے ان کی قدر کی۔

آج وہ واپس آتے ہوئے بہت خوش تھی۔ بچوں نے بہت اچھا وقت گزارا۔ فرید نے پاکستان میں اس سے بہت تعاون کیا۔ اس کی محنت رنگ لائی۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد ایک مطمئن زندگی اس کا مقدر بنی۔

جہاز لندن کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ صاف ستھری دھلی دھلی سڑکیں جن پر ترتیب سے کھلونے جیسی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گھر قطار اندر قطار بنے ہوئے تھے۔ لندن کا بگ بینگ بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کا دل اس ملک کے لوگوں کے لیے شکر گزاری کے جذبات سے بھر گیا۔ جنہوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ جہاز نے انگلینڈ کی سرزمین کو چھوا تو اسے لگا کہ اس کا اپنا گھر آگیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ستارے بن کر چمکنے لگے۔

عیدِ قرباں

تحسین اختر

رات کے دو بجے تک وہ سلائی کا کام کرتی رہی تھی پھر کوئی دو گھنٹے کمر سیدھی کرسکی تھی اور پانچ بجے دوبارہ اٹھ کر نماز قرآن پڑھ کر گھر کے کام میں مشغول ہوگئی۔ کل تو اس کے پاس آنے والے سلائی کے کپڑوں کا بہت زیادہ رش رہا تھا اتنا کہ اسے سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں مل سکی تھی۔ گھر کو کیا دیکھتی۔ مگر آج عید کا دن تھا اور اس کا سارا گھر چوپٹ پڑا تھا۔ اس نے پہلے سارے گھر کی جلدی جلدی



صفائی کی اور پھر تھوڑا سا دودھ ڈال کر سوّیاں بنائیں۔ جو اس کے بچوں کو بھی کھانی تھیں اور جو اسے آس پڑوس کے ایک دو گھروں میں بھی بھیجنی تھیں۔ عام دنوں میں تو وہ ایسی عیاشی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

جب سے احمد علی کا انتقال ہوا تھا اور چھوٹے چھوٹے چار بچوں کی ذمے داری تنہا اس کے کندھوں پر آن پڑی تھی تب سے لوگوں کے لیے دن رات سلائی کر کر کے وہ بس اتنا ہی کر سکتی تھی کہ اپنا اور اپنے معصوم بچوں کے پیٹ کا دوزخ بھر سکے مگر آج عید کا دن تھا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے گھر سے کچھ پکا کر آس پڑوس میں بھیجے۔ حالانکہ اس عید پر تو آس پڑوس میں گوشت بھیجا جاتا ہے مگر وہ بے چاری کیا کرتی......

''چلو بچو! جلدی سے اٹھ کر نہا لو پھر سوّیاں کھا کر نماز کے لیے مسجد میں جانا۔'' اس نے کئی دن پہلے ہی اپنے بچوں کے پرانے کپڑے دھو کر استری کر کے رکھ دیے تھے اس بار مہنگائی اتنی تھی کہ وہ نئے کپڑے بنانے کا سوچ بھی نہیں پائی تھی۔

''امی میں اپنی نئی فراک پہنوں گی آج۔'' چار سالہ مریم چھلانگ مار کر بستر سے اٹھی تھی۔ اس کی نیلی فراک دو سال پرانی تھی جو آسیہ نے اپنی بہن کی شادی پر اسے لے کر دی تھی اور اس نے اپنی عقلمندی سے دو سالہ بچی کے لیے اس سائز کی فراک لی تھی کہ وہ چار سال کی بھی ہو کر اسے پہن سکتی تھی۔ شاید غربت سب کچھ کرنا سکھا دیتی ہے۔

''ہاں کیوں نہیں، میں نے باہر نکال کر رکھ دی ہے اور ساتھ میں اپنی بیٹی کو نیلی چوڑیاں بھی پہناؤں گی۔'' اس نے فراک کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کا بھی لالچ دیا۔ مریم سب کچھ بھول بھال غسل خانے کی طرف لپکی تھی۔

''یہ لو ساتھ والی خالہ کے گھر دے آؤ۔'' مریم کو تیار کرنے کے بعد اس نے سوّیاں تھماتے ہوئے کہا۔

مریم ماں سے پلیٹ لے کر اچھلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''امی آج ہمارے گھر بھی گوشت پکے گا ناں!'' مریم اسے خالی پلیٹیں واپس پکڑاتے ہوئے اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''امی خالہ نے دو بکرے لیے ہیں۔'' وہ دوسرے گھر میں دینے کے لیے سوّیاں پلیٹوں میں ڈال رہی تھی اور پاس کھڑی مریم بتاتی جا رہی تھی۔

''بیٹا اللہ پاک ہر کسی کو توفیق دے۔ یہ لو اپنی سہیلی عائشہ کے گھر دے آؤ اب۔'' آسیہ نے سوّیوں والی پلیٹ دوبارہ اسے پکڑائی تھی۔

''امی جان میں نمکین گوشت کھاؤں گا...... شوربے والا نہیں۔'' چھ سالہ عدیل نہا کر ماں کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''میں اپنے بچے کو نمکین گوشت پکا کر دوں گی۔'' وہ جانتی تھی کہ عدیل کو گوشت کتنا پسند تھا۔ جب تک احمد علی زندہ تھا اس کے بچوں کو کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑتا تھا مگر جب سے اس نے دنیا سے منہ موڑا تھا وہ اپنی سر توڑ کوششوں کے باوجود بھی اپنے بچوں کی سب خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ بچے نہا دھو کر باہر نکل گئے تھے اس نے سب بچوں کو پچاس پچاس روپے دیے تھے کہ آج وہ اپنی مرضی سے جو خرید کر کھانا چاہیں کھا لیں۔ بچے تو اتنے خوش تھے اور ان کی یہی دعا تھی کہ ہر دن عید کا دن ہی ہونا چاہیے۔

''امی بھوک لگی ہے، آپ نے ابھی تک کچھ نہیں پکایا۔'' دو پہر کے تین بج رہے تھے اور وہ ہنڈیا بنانے کی پوری تیاری کر کے بیٹھی تھی۔ لہسن، پیاز وغیرہ چھیل کر اس نے چولھے کے قریب ہی رکھا ہوا تھا مگر انتظار تھا تو قربانی کے گوشت کا۔ اس نے سوچا تھا کہ جیسے ہی ایک دو گھروں سے قربانی کا گوشت آئے گا وہ ہنڈیا چڑھا دے گی اور اس کے بچے جو جانے کب

سے گوشت کے لیے ترس رہے ہیں آج جی بھر کر گوشت کھائیں گے مگر دو پہر ڈھل رہی تھی۔ بچے پیسے وغیرہ خرچ کر کے اور کھیل کود کے گھر آ گئے تھے اور اب بھوک، بھوک کا شور مچا رہے تھے مگر وہ کیا کرتی۔ کہیں سے گوشت آتا تو وہ ہنڈیا پکاتی۔

ان کے محلے کے بہت سے گھروں میں قربانی تھی اور سب کو اس کے حالات کا پتا تھا بلکہ سب سے پہلا حق تو قربانی میں اس جیسے لوگوں کا ہوتا ہے مگر وہ شاید بھول گئی تھی کہ آج کل لوگ قربانی مذہبی جذبے کے تحت نہیں بلکہ دکھاوے اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کرتے ہیں۔ قربانی کرنے کا مقصد کیا ہے اور اس کا اصل طریقہ کیا ہے یہ تو شاید اب کسی کو یاد بھی نہیں ہو......اب تو لوگ اپنے پیٹ اور فریزر گوشت سے بھر لیتے ہیں یا پھر نمود و نمائش کے لیے اپنے صاحب حیثیت دوستوں، عزیزوں کو کھلاتے ہیں۔ دو دن پہلے ہی اس کی گلی میں رہنے والے کئی لوگ نیا فریزر خرید کر لائے تھے ایک، دو کے ہاں تو قیمہ بنانے کی مشین بھی خریدی گئی تھی وہ جب سلائی کے کپڑے لینے یا دینے جاتی تو ایسی خبریں بھی سن لیتی یا ٹرک، سوزوکی آتے دیکھ کر پتا چل جاتا کہ کچھ بڑا سامان آیا ہے۔

''امی گوشت کب آئے گا اور آپ کب پکائیں گی۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔'' عدیل ایک بار پھر اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی آس بھری نظریں دروازے کی جانب بار بار اٹھ رہی تھیں۔

''آ جائے گا، ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ بکرا ذبح کرنے اور پھر تقسیم کرنے میں ٹائم تو لگتا ہے ناں۔ ابھی کسی نہ کسی کے گھر سے گوشت آ جائے گا، تم سے تو عدیل ذرا سی بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ یہ لو دس روپے اور باہر سے سموسے کھا آؤ۔'' اس نے عدیل کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ عدیل پیسے لے کر باہر چلا گیا مگر اگلے ہی

بہترین تحفہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''قبر میں میت کی مثال ڈوبنے والے اور فریاد کرنے والے کی طرح ہوتی ہے۔ جو اپنے ماں، باپ، عزیز، رشتے دار یا کسی دوست کی دعا کا منتظر رہتا ہے۔ بے شک اہلِ دنیا کی دعا سے اللہ تعالیٰ اہلِ قبور کو پہاڑوں کے برابر اجر عطا فرماتا ہے۔ مُردوں کے لیے بہترین تحفہ ان کے لیے استغفار کرنا ہے۔'' (بیہقی)

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

لمحے لوٹ آیا۔

''امی وہ کونے کے بڑے گھر والے نثار صاحب ہیں ناں ان کا نوکر گوشت بانٹ رہا ہے۔ شاید وہ ہمارے ہاں بھی آ جائے۔'' بچے کی کچھ آس بندھی۔

''ہاں بیٹا تم کچھ کھا کے تو آ جاؤ، گوشت بھی آ جائے گا۔'' اس نے دل میں سوچا کہ شاید نثار صاحب اپنے نام کی ہی لاج رکھ لیں گے مگر اسے یاد آیا کہ ان ہی کے ہاں تو اتنا بڑا فریزر آیا تھا کہ گلی والے بھی دیکھنے کو اکٹھا ہو گئے تھے۔

''امی اب تو شام ہونے لگی ہے۔ بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ کھانا دیں ناں!'' چار بج چکے تھے اور بچوں کی وہی تکرار جاری تھی۔

''میں ابھی مزے دار سے مسالے والے چاول بنا کے دیتی ہوں تم لوگوں کو۔'' اس نے آس بھری نظریں بیرونی دروازے سے ہٹائی تھیں اور عیدِ قرباں پر اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے سادے چاول پکانے لگی تھی کہ پیٹ کی آگ تو کسی طرح بجھانی ہی تھی۔

زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

قسط 11

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں ...وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ، بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں... جب محبت دستک دیتی ہے ...اور اس کی خوشبو میں روشنی کی تابناکی بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ... مکر وفریب ... سفاکی اور تنگ نظری کے سائے ...ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی ترپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے ...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی



WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری...... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آ گئے اور آٹھ نو سال ایک پلمبرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جا رہی تھی۔ تقدیم، تسنیم کے موبائل پر مدثر کے میسج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتا دیتی ہے، تسنیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جا کر کورٹ میرج کر لیتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تسنیم نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تسنیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تسنیم کو بھیجنے کی حامی بھر لیتا ہے اور پھر اپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زیتون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو اماں رضامند ہو گئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آ جائیں۔ حجاب بسمہ سے کہتی ہے کہ وہ الطاف سے اپنا رشتہ ختم کر دے گی، گھر والے حجاب کو سمجھاتے ہیں لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہتی ہے۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ تسنیم مدثر سے کہتی ہے کہ وہ اپنی امی کو بھیجے۔ حجاب کی امی الطاف کی بہن سے بات کرتی ہیں تو وہ سب لوگ ان کے گھر آ جاتے ہیں اور بسمہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مونس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فیملی کے ساتھ کاکول آ گئے۔ زیتون ان کو عباد کے لیے جو لڑکی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جہیز کی لسٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ الطاف، حجاب کو راستے میں روک کر اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے مگر حجاب رکشے میں اسکول چلی جاتی ہے۔ زیتون بیگم عباد کی امی کو آ کر بتاتی ہیں کہ عباد نے جہیز کی لسٹ بنا کر بھیجی تو ان لوگوں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ ابا پریشان ہوتے ہیں کہ مدثر نے ابھی تک کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔ مدثر پریشان تھا کہ ڈیڈی نے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا۔ تسنیم، مدثر سے بات کرتی ہے تو مدثر کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہوتا ہے۔ الطاف، حجاب کے اسکول پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈراتا ہے کہ اسٹاف کے لوگوں کو بلا کر وہ سب کو بتا دے گا۔ تقدیم اور ابا مونس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب میں جاتے ہیں تو صبور احمد اور ان کی فیملی کا بہت اچھی طرح خیال رکھتے ہیں اور واپسی پر ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مونس گھر آتا ہے تو اماں چاہتی ہیں کہ خوش بخت سے اس کا رشتہ طے کر دیں لیکن مونس انہیں ٹال دیتا ہے۔ تقدیم سمجھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی عائزہ ہے جس کی وجہ سے مونس انکار کر رہا ہے۔ وہ مونس سے بات کرتی ہے تو مونس کو یہ ڈھارس ہو جاتی ہے کہ اس معاملے کو اب تقدیم سنبھال لے گی۔ تقدیم اماں کو بتا دیتی ہے کہ مونس، عائزہ میں انٹرسٹڈ ہے اس لیے وہ خوش بخت کا خیال دل سے نکال دیں۔ عباد اچھی جگہ شادی کرنے کے لیے شادی دفتر میں اپنا اندراج کراتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ مدثر، تسنیم کو طلاق بھجواتا ہے بذریعہ رجسٹری تو مونس کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے، تسنیم، مدثر کو فون کرتی ہے تو وہ فون ریسیو نہیں کرتا اور میسج کے ذریعے بتاتا ہے کہ ڈیڈی راضی نہیں ہوئے اس لیے طلاق دینی پڑی۔ مونس، مدثر کا ایڈریس پوچھتا ہے تاکہ اس سے طلاق کی وجہ پوچھ سکے لیکن تسنیم اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کر دیتی ہے۔ الطاف امی کو دھمکی دیتا ہے اب وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کر دے گا۔ حجاب کو امی کی سپورٹ ملی تو اس نے خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ عائزہ اور اس کے گھر والے خوش تھے کہ انہیں کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تسنیم کے پریگنینٹ ہونے پر ابا نے مدثر کے والد سے بات کی کہ ایک دن کے لیے اسے رخصت کرا کے اپنے گھر لے جائیں۔ بہت مشکل سے وہ اس بات کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔ عباد کو ابھی تک وہ گوہر نایاب نہیں ملا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ الطاف نے وکیل کو فون کیا اور اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ یہ کیس نہ لڑے اور حجاب کو کیس واپس لینے پر آمادہ کر لے تو الطاف اسے منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ تقدیم اپنے این جی او کے وکیل اویس انصاری سے تسنیم کا معاملہ ڈسکس کرتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ قانون اور شرع کی رو سے وضع حمل تک تسنیم کا خرچ اٹھانے کی ذمے داری مدثر کی ہے۔ الطاف حجاب کو مختلف طریقوں سے ڈراتا ہے تاکہ وہ کیس واپس لے لے۔

اب آگے پڑھیں

"جی فرمائیں...... میں مدثر کا باپ ہوں اور یہ مدثر......" ڈیڈی نے انتہائی کروفر سے ٹانگ پر ٹانگ دھر کر بیٹھتے اور اویس انصاری کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا اور مدثر کا تعارف کرایا۔

اویس انصاری پیشہ ور قانون داں تھا۔ انسانوں کی خاصی سمجھ بوجھ تھی اسے، ڈیڈی کے اندازِ نشست و تعارف سے وہ ان کی جڑوں تک پہنچ گیا۔

"مدثر صاحب کے والدِ محترم کا کوئی نام تو ہوگا سرکار!" وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

"معین الدین احمد۔" اویس انصاری نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔

"میرا نام اویس انصاری ہے...... ایڈووکیٹ ہوں اور یہاں آپ کے صاحبزادے کی مطلقہ کے وکیل کی حیثیت سے موجود ہوں۔"

ڈیڈی نے اویس انصاری سے بڑی سرد مہری سے ہاتھ ملایا۔ ڈیڈی کے بعد اویس نے مدثر کی جانب ہاتھ بڑھایا جو سر جھکائے نظریں نیچی کیے انتہائی محتاط سے انداز میں بیٹھا تھا۔ وہ چونکا اور اس نے اپنا ہاتھ اویس انصاری کے ہاتھ میں دے دیا۔

تعارف کے بعد اویس انصاری نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک فائل نکالی، اسے کھولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک کرسی کھینچتے ہوئے مدثر کے روبرو بیٹھ گیا۔ فائل میں لگے کاغذات میں سے ایک دوسرے کے ساتھ نتھی دو کاغذات نکال کر مدثر کی جانب بڑھاتے ہوئے اس نے فائل مدثر کے سامنے کی اور فائل کلپ کے نیچے دبے باقی ماندہ کاغذات میں سب سے اوپر کاغذ کے زیریں حصے پر اپنی انگلی دھرتے ہوئے بولا۔ "کائنڈلی ریسیو کر لیجیے۔"

مدثر نے چونک کر اویس انصاری کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ریسیو کرا رہے ہیں آپ اسے؟" ڈیڈی نے ابرو چڑھا کر اویس انصاری سے پوچھا۔

"نوٹس!" اویس انصاری نے بہت مختصر سا جواب دیا۔

"کیسا نوٹس...... کس بات کا نوٹس؟"

اویس انصاری نے اپنا روئے سخن مدثر کی جانب کیا۔ "مدثر صاحب! میری مؤکلہ یعنی آپ کی مطلقہ اپنی عدت کے دوران قرآن و سنت کی روشنی میں آپ سے سکنہ اور نفقے کا استحقاق رکھتی ہیں...... بحیثیت ان کے وکیل میری جانب سے آپ کے نام نوٹس اسی سلسلے میں ہے۔"

"کیا...... کیا کہا آپ نے...... نفقے اور......؟" ڈیڈی نے اویس انصاری کو ناگواری سے دیکھا۔

"سکنہ یعنی سکونت کے لیے جگہ...... شریعت کی رو سے مدثر صاحب میری مؤکلہ کو ان کی عدت کے دوران جو وضع حمل تک ہوگی اسی جگہ رکھنے کے پابند ہیں۔ جہاں کہ وہ خود رہتے ہیں اور اس دوران انہیں نفقہ یعنی روٹی اور کپڑے کا خرچ بھی دیں گے۔"

ڈیڈی نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "کہاں سے دے گا...... یہ تو خود باپ کے گھر میں رہتا ہے...... اپنی روٹی، کپڑے کے لیے میرا محتاج ہے۔"

اویس انصاری نے ڈیڈی کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا اور مدثر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مدثر صاحب! آپ عاقل و بالغ ہیں...... اپنی رضا اور رغبت سے آپ نے میری مؤکلہ سے کورٹ میرج

کی...... ازدواجی تعلق قائم کیا...... اور چند دن بعد انہیں طلاق دے دی...... ایک عاقل و بالغ شخص ہونے کے ناتے اگر آپ کسی خاتون سے نکاح اور ازدواجی تعلق قائم کرنے کے سلسلے میں خودمختار تھے اور تعلق ...... ختم کرنے کے معاملے میں بھی بااختیار تو آپ سے بعدہ معاملات میں بھی اسی قدر خودمختار ہونے کی توقع کی جاتی ہے...... یہ نوٹس جو میں آپ کو دے رہا ہوں میری مؤکلہ کی جانب سے آپ پر ان کے دورانِ عدت واجب حقوق کا مطالبہ ہے۔ عدت کے بعد بچے کی رضاعت اور پرورش سے متعلق حقوق پر ہم وقت آنے پر بات کریں گے...... اگر آپ اپنے والد صاحب کے گھر میں رہتے ہیں تو دورانِ عدت میری مؤکلہ کو بھی اسی گھر میں رکھیں گے۔''

''کیا حماقت ہے!'' ڈیڈی نے غصے سے کہا اور سر کو جھٹکتے ہوئے استہزائیہ ہنسی ہنسے اور پھر اویس انصاری کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معترض ہوئے۔

''زندگی میں پہلی بار یہ لطیفہ سن رہا ہوں کہ طلاق دی جانے والی عورت اسی گھر میں رہے گی جہاں طلاق دینے والا مرد رہتا ہے...... وہ تو اس کے لیے نامحرم ہو چکا۔''

''معین الدین صاحب!'' اویس انصاری کا لہجہ تادیبی تھا۔ ''آپ توہینِ شریعت کے مرتکب ہو رہے ہیں...... نعوذ باللہ یہ حماقت نہیں حکمِ خداوندی ہے۔''

''کہاں...... کہاں لکھا ہے کہ یہ حکمِ خداوندی ہے...... کون کہتا ہے کہ یہ حکمِ خداوندی ہے؟'' ڈیڈی نے بھبک کر کہا۔

''دین کہتا ہے...... اور جو بھی کہے گا وہ اپنی طرف سے نہیں کہے گا۔ وہ دین کی ترجمانی کرے گا...... اور یہ خدا کی کتاب میں لکھا ہے......'' اویس انصاری فائل کو قریب پڑی ٹیبل پر رکھ کر مڑا اور اپنے کھلے ہوئے بریف کیس میں سے بڑے سائز کی ایک مجلد کتاب نکال کر ڈیڈی کی جانب دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں بولا۔ ''تفہیم القرآن...... جلد پنجم...... از سید ابوالاعلیٰ مودودی...... جید عالمِ دین، محقق اور مفسرِ قرآن......'' اویس انصاری دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور تفہیم القرآن کے اوراق پلٹنے لگا پھر ایک مخصوص صفحے پر رک کر اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ ''صفحہ پانچ سو تہتر۔'' اویس انصاری نے ذرا کی ذرا ڈیڈی کو دیکھا پھر دوبارہ اپنی نظریں تفسیر پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''سورۂ طلاق آیت نمبر چھ...... اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم (ترجمہ) ان کو زمانہ عدت میں اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو۔'' اویس انصاری نے نظر اٹھا کر ڈیڈی کو دیکھا پھر دوبارہ کتاب پر نظر کی اور مزید کچھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔

''یہ ان عورتوں کے لیے کہا گیا ہوگا جنہیں ایک یا دو طلاقیں دی گئی ہوں۔'' ممی نے صدائے احتجاج بلند کی۔

''دیکھیے یہ طویل بحث ہے اور مولانا مرحوم نے اپنی اس تفسیر میں اس مسئلے پر بڑی مفصل بحث کی ہے...... اس امر میں تمام فقہا کا اجماع ہے کہ مطلقہ کو اگر رجعی طلاق دی گئی ہو تو شوہر پر اس کی سکونت اور نفقہ دونوں کی ذمے داری عائد ہوتی ہے...... جس خاتون کو قطعی طور پر الگ کر دینے والی طلاق دی گئی ہو یعنی تین طلاقیں اس کے بارے میں مسلکی اختلاف ہے...... ایک گروہ کہتا ہے مطلقہ مبتوتہ یعنی جس عورت کو مرد نے تین طلاق دے دی ہوں سکونت اور نفقہ دونوں کی حقدار ہے جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ صرف سکونت کی حقدار ہے نفقے کی نہیں

جبکہ تیسرا گروہ کہتا ہے اس کے لیے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقے کا...... میں پوچھ سکتا ہوں آپ کس مسلک کے تابع ہیں؟''

''حنفی......'' ڈیڈی کی طرف سے جواب آیا۔

''اوکے...... حنفی مسلک کے مطابق مطلقہ مبتوتہ سکونت اور نفقے دونوں کی حقدار ہے......'' اویس انصاری نے دوبارہ تفسیر پر اپنی نگاہ مرکوز کی اور حوالہ دیا۔ ''صفحہ پانچ سو چوہتر...... حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ المطلقة ثلاثا لها السكنى والنفقة جس عورت کو تین طلاقیں دی جا چکی ہوں اس کے لیے زمانۂ عدت میں سکونت اور نفقہ کا حق ہے۔''

اویس انصاری نے تفسیر سے نظر ہٹائی اور ڈیڈی کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی۔ ڈیڈی، ممی کو دیکھ رہے تھے۔ مدثر چور بنا سر جھکائے، نظریں چرائے بیٹھا تھا۔

اویس انصاری نے صفحہ الٹا۔ ''ہم رجعی اور غیر رجعی کی بحث میں نہ بھی پڑیں تو فاضل مفسر سورۂ طلاق کی آیت نمبر چھ کی تفسیر میں صفحہ پانچ سو ستتر پر رقمطراز ہیں...... یہ امر متفق علیہ ہے کہ مطلقہ خواہ رجعیہ ہو یا مبتوتہ...... اگر حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کی سکونت اور اس کے نفقے کا ذمے دار شوہر ہے۔''

اویس انصاری نے ایک نظر ڈیڈی پر ڈالی۔ تفہیم القرآن کو مؤدبانہ اپنے بریف کیس میں واپس رکھا اور مدثر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مدثر صاحب! یہ نوٹس جو میں آپ کو ریسیو کرا رہا ہوں میری مؤکلہ کی جانب سے اپنے حقوق کے دعویٰ کے سلسلے میں ابتدائی قدم ہے...... اگر معاملات باہمی افہام و تفہیم سے کورٹ میں جائے بغیر طے ہو جاتے ہیں تو آپ بھی پریشانی سے بچ جائیں گے ورنہ میری مؤکلہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں...... مجھے امید ہے کیس کی حساسیت کے پیشِ نظر عدالت میری مؤکلہ کو ان کے حقوق دلوانے میں تاخیر نہیں کرے گی۔''

''آپ دھمکی دے رہے ہیں؟'' ڈیڈی بھڑک کر سوالیہ لہجے میں بولے۔

''جی نہیں......'' اویس انصاری نے تحمل سے کہا۔ ''میں اپنی مؤکلہ اور ان کے متعلقین کی ایما پر پہلے مرحلے میں گھر کے مسئلے کو شرفا کی طرح گھر ہی میں حل کروانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''عدالت کی دھمکی دے کر بلیک میل کر رہے ہیں آپ!'' ڈیڈی نے غصے سے کہا۔

''معین الدین صاحب! بلیک میل کرنا ہوتا تو میں یہاں آنے کے بجائے تھانے میں مدثر صاحب کے نام اپنی مؤکلہ کے اغوا، حبس بے جا، زبردستی کورٹ میرج، زدوکوب اور بے سبب طلاق دے کر عدم ادائیگی حقوق کا پرچہ کٹوا چکا ہوتا۔'' اویس انصاری کے لہجے میں اب سختی تھی، درشتی تھی۔

''جائیں اب کٹوا دیں۔'' ڈیڈی نے آنکھیں نکالیں۔

''ایزی...... ایزی معین صاحب...... زیادہ طیش میں آنے کی ضرورت نہیں......'' اویس انصاری نے کہا۔

''پولیس، تھانہ، عدالت...... آپ سمجھتے ہیں آپ کی دھمکی مجھے مرعوب کر لے گی۔'' ڈیڈی نے اسی غصے میں کہا۔

''آپ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔'' اویس انصاری نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔

"میں سب سمجھتا ہوں...... میں آپ وکیلوں کی ساری چالیں سمجھتا ہوں...... میں ان کی عیاری کو بھی سمجھ چکا ہوں......" ڈیڈی نے تحقیر سے ابا کو دیکھا پھر تسنیم کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولے۔ "میں اس لڑکی کی چالاکیوں کو بھی سمجھ گیا ہوں...... اس نے پہلے میرے سیدھے سادے بیٹے کو پھنسایا...... اسے بہکا کر کورٹ لے گئی...... اور جب اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ بن سکی تو اب یہ بلیک میلنگ کے ذریعے اس گھر میں گھسنا چاہتی ہے۔"

"سر! اپنی زبان کو لگام دیجیے آپ۔" تقدیم نے ڈیڈی کو گھورتے ہوئے کہا۔ تسنیم اپنا منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔

"لگام تم دو اپنی بہن کو...... جو جھونپڑے سے نکل کر محل میں رہنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔" ڈیڈی چلّائے...... ثریا نے تسنیم کو دلاسہ دینے کو اپنے گلے سے لگالیا۔

"آہستہ معین الدین صاحب...... اتنا چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔" اویس انصاری نے ٹوکا۔

"یہ میرا گھر ہے...... یہاں میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"معین الدین صاحب! اتنا جوش میں نہ آئیں کہ آپ کا جوش ٹھنڈا کرنے کو قہرِ خداوندی حرکت میں آجائے۔" اویس انصاری نے تلخی سے کہا۔

"اے مدثر تم مٹی کے مادھو بنے کیا بیٹھے ہو...... کیسے مرد ہو، ایک لڑکی کی زندگی برباد کردی اور اب.... خاموش تماشائی بنے اپنے ابا کو شریفوں کو بے عزت کرنے کا لائسنس دیے بیٹھے ہو...... ارے اتنا بوتا نہیں تھا تم میں تو اس بے چاری کی زندگی کیوں برباد کی......" ثریا نے تسنیم کا اپنے شانے پر دھرا ہوا سر دھیرے دھیرے تھپک کر اسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے مدثر کو لعن طعن کی۔ مدثر شرمسار دکھائی دینے لگا۔

"آپ سب لوگ نکل جائیں میرے گھر سے...... ورنہ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔" ڈیڈی نے غصے سے کہا اور ثریا کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔ "کرائے کے ٹٹو۔"

"مدثر سنبھالو اپنے ابا کو۔" ثریا نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"آپ کے پولیس بلانے سے ہمارا کام آسان ہوجائے گا۔" اویس نے ڈیڈی سے کہا۔ ڈیڈی نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا اور بٹن دبا کر کوئی نمبر تلاش کرنے لگے۔

"بس کریں ڈیڈی۔" مدثر نے اس نشست کے دوران پہلی بار زبان کھولی۔

"کیا بس کروں یار۔" ڈیڈی نے اسے خشونت سے دیکھا۔

"ممی آپ انہیں سمجھائیں...... ہمیشہ طیش میں آجاتے ہیں۔" مدثر زچ ہوکر بولا۔

"ہاں، میں تو طیش میں آجاتا ہوں...... تو نے تو جیسے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ تیری ہی وجہ سے یہ بے عزتی دیکھنے کو مل رہی ہے کہ لوگ کہتے ہیں گند اٹھا کر سر پر دھرلو۔" ڈیڈی نے تسنیم پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اپنی زبان کو قابو میں رکھیے معین صاحب۔" اویس انصاری نے لفظ گند ادا کرتے ہوئے ڈیڈی کو تسنیم کی طرف دیکھتے پا کر ٹوکا۔

"آپ اپنے کام سے کام رکھیں جناب۔" ڈیڈی نے اویس انصاری کو ناگواری سے دیکھا۔ ممی سرگوشی میں ڈیڈی کو سمجھانے بجھانے لگیں۔

اویس انصاری نے مدثر کو مخاطب کیا۔ "مدثر صاحب! مسئلہ آپ کا پیدا کردہ ہے......"

"میرا؟" مدثر بے اختیار چونکا۔

"جی ہاں...... اور حل بھی آپ ہی نکالیں گے۔" اویس انصاری نے کہا پھر انتہائی رسانیت سے بولا۔ "آپ جیسے نوجوان نکاح کی حرمت کو بھی نہیں سمجھتے، طلاق کو بھی کھیل جانتے ہیں...... نکاح ایک مقدس بندھن ہے اور خدا کی شریعت میں طلاق کی گنجائش صرف ایک ضرورت کے طور پر رکھی گئی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اس بات کو سخت ناپسند فرماتا ہے کہ ایک مرد اور عورت کے درمیان جو ازدواجی تعلق قائم ہو وہ پھر کبھی ٹوٹ جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ تمام حلال امور میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔ مرد کو طلاق کا جو اختیار دیا گیا ہے اس اختیار کو استعمال کرنے کے ایسے حکیمانہ طریقے بتائے ہیں اللہ نے کہ مرد اور عورت کے درمیان اول تو قطعی علیحدگی کی نوبت ہی نہ آئے اور اگر آئے بھی تو اس وقت جب دونوں میں باہمی موافقت کے سارے راستے بند ہوچکے ہوں۔ عورت کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ دونوں کو پسند نہیں...... عورت ہی برباد نہیں ہوتی مرد بھی اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کی خلاف ورزی کر کے گناہگار ہوتا ہے۔"

ممی، ڈیڈی کو ان کا بازو تھام کر لاؤنج سے باہر لے گئی تھیں۔ اویس انصاری نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور چونک کر تقدیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "خاصا وقت ہوگیا مس تقدیم۔"

"جی...... جی ہاں۔" تقدیم نے اپنی رِسٹ واچ میں دیکھتے ہوئے تائید کی۔

اویس انصاری اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مدثر کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ "جو نقصان ہونا تھا وہ ہوچکا مدثر صاحب...... اس نقصان کا ازالہ ہو نہیں سکتا، کفارہ آپ ادا کرسکتے ہیں...... حکم خدا کے مطابق مطلقہ کے حقوق ادا کر کے...... ان کے اور ان کے متعلقین سے حُسنِ سلوک کر کے...... اور جب بندہ کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرلے تو پھر یہ نہ سوچے کہ وسائل کہاں سے آئیں گے، کون دے گا؟ جو اللہ اوروں کو دے رہا ہے وہ آپ کو بھی دے سکتا ہے...... بس آپ کی نیت نیک ہونی چاہیے...... میں، پھر سورۂ طلاق ہی کا حوالہ دوں گا...... اس سورہ میں اللہ تعالیٰ طلاق دینے والے مرد کو حکم دیتا ہے کہ طلاق کے بعد مطلقہ کے حقوق کی ادائیگی مرد پر بلاشبہ مالی بار ڈالتی ہے۔ مطلقہ کو اپنے گھر رکھنا اور اس کے نفقے کی ذمّے داری...... جبکہ مرد اس سے اپنا تعلق منقطع کرچکا ہو یقیناً مرد کو ایک ناقابلِ برداشت بار محسوس ہوگا لیکن جو بار اللہ سے ڈرتے ہوئے، اللہ کے احکام کی پیروی میں اٹھایا جائے، اللہ کا وعدہ ہے کہ اپنے فضل سے وہ اس کو ہلکا کردے گا اور اس کی اتنی بھاری جزا دے گا جو دنیا میں اٹھائے ہوئے اس تھوڑے سے بار کی نسبت بہت زیادہ گراں قدر ہوگی۔"

مدثر نے نگاہیں اٹھا کر اویس انصاری کو دیکھا، اس شخص کے ہاتھ میں کیا ٹھنڈک تھی کہ وہ اپنے شانے پر دھرے اویس انصاری کے ہاتھ کو مسیحا صفت محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کے لہجے میں کیسی دلسوزی کہ وہ اس کا ایک، ایک لفظ اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتا محسوس کر رہا تھا۔

"مدثر صاحب...... لوگوں کو ان کے حقوق دینا سیکھیں...... اللہ ربّ العزت ایسی سہولتیں، اتنی آسانیاں اور برکت پیدا فرماتا ہے جو ہمارے گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔" اویس انصاری نے کہا۔

اویس انصاری کوئی اوتار نہیں تھا...... عام سا آدمی...... جو اپنی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں عام لوگوں کی

طرح کمزوریوں اور کوتاہیوں سے مبرا نہ تھا لیکن تقدیم سے اپنے مراسم کے حوالے سے وہ تسنیم کے معاملے کی پیروی کرنے کے لیے جس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ وہاں آیا تھا اس نے مدثر ہی نہیں اس وقت لاؤنج میں موجود باقی افراد کے نزدیک بھی اسے سر آنکھوں پر بٹھائے جانے کے لائق بنا دیا تھا۔

مدثر نے کن انکھیوں سے تسنیم کو دیکھا...... اس لڑکی نے اپنا آپ اسے سونپا تھا...... اس کی خاطر وہ اپنے ماں، باپ کی عزت داؤ پر لگا کر اس سے کورٹ میرج کرنے چلی آئی تھی۔ اسی کے لیے اس نے اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کی پروا نہیں کی تھی...... اپنے مستقبل کو آنکھیں بند کر کے بے یقینی کے حوالے کر دیا تھا...... اپنی زندگی پر کھیل گئی تھی۔ ہاں، یہ زندگی پر کھیل ہی جانا تو تھا...... کیا بچا تھا اس کے دامانِ چاک چاک میں...... آنسو...... سسکیاں...... آہیں...... ثریا کے شانے پر اپنا سر دھرے وہ یوں سسک رہی تھی جیسے زندگی میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہو۔

دکھ، شرمندگی اور پچھتاوا ایک ساتھ مدثر کا محاصرہ کرنے کو آئے۔

''کیوں دھوکا دیا میں نے تسنیم کو...... کیوں ڈیڈی کے کہے میں آگیا...... اسکاٹ لینڈ تو میں خود بھی جا سکتا تھا...... تسنیم ساتھ ہوتی تو ضمیر تو دل کو نہ کچوکتا...... زندگی تنہا تو نہیں گزار سکوں گا...... کسی نہ کسی کا ساتھ تو لینا ہی پڑے گا...... تسنیم ہی ہوتی تو کتنا اچھا تھا...... اور بچہ...... اسے کیسے منہ دکھا سکوں گا میں۔'' خیالوں اور پچھتاوؤں کا سلسلہ اک سیلِ رواں کے مانند اس کے من کو عرقِ ندامت میں ڈبوتا چلا گیا۔

ثریا نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گیا۔

''سر! تھوڑی دیر کے لیے اجازت چاہوں گا۔'' مدثر نے اویس انصاری سے کہا۔ اس کے لہجے میں تعجیل تھی۔

اویس انصاری نے اپنے سر کی خفیف سی عمودی جنبش سے گویا اسے جانے کی اجازت دی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاؤنج سے نکل گیا۔

''ایمان سے وکیل صاحب! آپ نے میرا دل خوش کر دیا...... بہت دعائیں لیں۔'' مدثر کے جاتے ہی ثریا نے کہا اور اپنے شانے پر دھرا تسنیم کا سر دھیرے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''اب رونے کی ضرورت نہیں پیاری...... اللہ خوش رکھے وکیل صاحب نے چھکے چھڑا دیے ان سب کے۔''

''تھینک یو اویس صاحب۔'' تقدیم بولی۔

''پلیز! ڈونٹ مینشن اٹ۔'' اویس انصاری نے کہا۔

''خدا خوش رکھے آپ کو۔'' ابا نے اویس انصاری کو دعا دی۔

''بس دعاؤں میں یاد رکھیں۔''

''ویسے وکیل صاحب...... یہ بڑے میاں کہہ تو سچ رہے تھے...... ایمان سے میں نے بھی پہلی مرتبہ یہ بات سنی کہ طلاق والی عورت کو اپنی عدت اسی مرد کے گھر میں گزارنی چاہیے جس نے طلاق دی ہو۔'' ثریا بولی۔

''دین کا حکم ہے خاتون...... میری یا کسی اور انسان کی کہی بات نہیں۔''

''لاجواب بھئی لاجواب...... اپنا دین تو لاجواب۔'' ثریا نے اپنے مخصوص لہجے میں بے ساختہ کہا۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' اویس انصاری نے تائید کی۔ ''دنیا کا کوئی دوسرا مذہب آج تک ایسا معقول،

فطری اور معاشرے کے لیے مفید ضابطہ اپنے ماننے والوں کو نہیں دے سکا جیسا قرآن حکیم اور اس کے لانے والے رسول ﷺ نے ہم مسلمانوں کو دیا۔''

''الحمدللہ!'' ابا نے بے ساختہ شکر ادا کیا۔

''ویسے وکیل صاحب...... ہم نے سنا ہے...... عورت اگر ایسی حالت میں جیسی کہ ہماری تسنیم ہے تو طلاق نہیں ہوتی۔'' ثریا کی مراد تسنیم کے حاملہ ہونے سے تھی۔ ''بلکہ ایک آدھ ٹی وی ڈرامے میں بھی ہم نے یہی دیکھا ہے۔''

''غلط!'' اویس انصاری نے کہا۔ ''طلاق ہو جاتی ہے...... بات یہ ہے خاتون کہ طلاق ایک نہایت نازک معاملہ ہے اسے کھیل سمجھنا اور سوچ سمجھے اور علم رکھے بغیر طلاق سے متعلق کسی مسئلے پر رائے زنی کر دینا درست نہیں۔''

☆☆☆

دوسرے کمرے میں ممی اور ڈیڈی کی گفتگو میں مدثر بھی آکر شریک ہو گیا تھا۔

''دیکھا کیسے گھاگ لوگوں میں جا کر پھنسا ہے تو۔'' ڈیڈی نے مدثر کو گھورتے ہوئے کہا۔ غصے میں وہ ہمیشہ تُو تڑاخ پر اتر آتے تھے۔

''کیا ہے ڈیڈی! شریف لوگ ہیں۔'' مدثر بولا۔

''شریف لوگ ایسے ہوتے ہیں...... جعلساز...... پہلے چالاکی سے بیٹی کو بھیجا اور اب...... وکیل کو اپنے ساتھ لے کر آگئے۔''

''رہنے دیں اسے یہاں...... آخر منعم کی بیوی بھی تو رہ ہی رہی ہے...... وہ بے چاری تو عدت کے بعد چلی جائے گی۔''

''ہونہہ! بے چاری! اور منعم کی بیوی کی تجھے اتنی تکلیف کیوں ہے۔'' ڈیڈی نے اسے گھورا۔

''تکلیف کی بات نہیں...... حق کی بات ہے۔ منعم کی بیوی اگر اس گھر میں رہ کر ٹھاٹھ کر سکتی ہے تو وہ یہاں چند مہینے کیوں نہیں گزار سکتی۔''

''منعم کی بیوی اس لیے یہاں رہ رہی ہے کہ وہ منعم کی بیوی ہے۔''

''وہ بھی میری بیوی تھی۔''

''ہمیں کیا پتا۔'' ڈیڈی نے شانے اچکائے۔

''نکاح نامہ دکھاؤں آپ کو؟'' ڈیڈی نے اسے خشونت سے دیکھا۔

''دیکھیں ڈیڈی...... صرف آپ کے کہنے پر میں نے اس بے چاری کو بغیر کسی وجہ کے طلاق دے دی...... اس کی زندگی برباد کر دی...... وہ کچھ اور نہیں مانگ رہی ہے ہم سے صرف اپنا شرعی حق...... عدت تک اس گھر میں رہنے کا استحقاق اور اس عرصے میں روٹی کپڑے کا خرچ......''

''اسی گھر میں اسے رکھ کر تو رنگ رلیاں منانا چاہتا ہے اس کے ساتھ۔'' ڈیڈی غرائے۔

''لاحول ولاقوۃ!''

''لاحول بھیج رہا ہے مجھ پر۔'' ڈیڈی نے آنکھیں نکالیں۔

"شیطان پر ڈیڈی...... جو آپ کے دل میں وسوسے پھیلا رہا ہے...... میری تو ویزا اپلیکیشن جمع ہو چکی ہے...... کنسلٹنٹ ویزا کے لیے پُرامید ہے...... ویزا ملتے ہی میں تو باجی کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"اس سے پہلے تو ٹائم ہوگا تیرے پاس اس کے ساتھ گل چھرّے اڑانے کو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ڈیڈی۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔"

"آپ فکر نہ کریں...... اسے اس گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں...... میں اپنا بندوبست کسی ہاسٹل میں کیے لیتا ہوں۔"

ممی نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ "کیوں! تم اپنا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں کیوں رہو گے؟"

"جو شک ڈیڈی کو ہو رہا ہے وہ اس گھر میں رہنے والے اور لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے۔"

"اوروں کی خاطر تم اپنا گھر چھوڑ جاؤ گے...... آخر وہ کیوں نہیں گزار لیتی اپنی عدت اپنے ماں، باپ کے گھر میں...... کیا ہماری زندگی ڈسٹرب کرنا ضروری ہے۔"

"آپ چند ماہ کی ڈسٹربنس سے گھبرا رہی ہیں...... اس کی تو پوری زندگی ہی برباد ہو گئی ہے...... نہ مجھے یہ ظلم کرنا چاہیے تھا نہ ڈیڈی کو مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرنا تھا...... خیر جو ہو چکا اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا...... کم از کم ہم اس کا حق تو دے سکتے ہیں اسے۔"

"ہونہہ!" ڈیڈی نے مدثر کو استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔ "اس کی محبت جاگ رہی ہے دل میں۔"

"محبت ہی تو نہیں تھی اس کی میرے دل میں...... محبت ہوتی تو میں انتظار کرتا، اسے کورٹ لے جا کر نکاح نہ کرتا اس سے...... عزت سے اس کے گھر سے رخصت کر کے لاتا اسے...... اور تمام عمر اسے عزت و احترام کے ساتھ رکھتا۔" مدثر جذباتی ہو گیا۔

"محبت نہیں تو اتنی ہمدردی کیوں اس سے؟"

"کیونکہ...... اس سے میرا رشتہ تو رہا ہے ناں ڈیڈی...... اور آئندہ بھی ایک تعلق تو رہے گا اس سے۔"

"دیکھا!" ڈیڈی نے ممی سے کہا۔ "دیکھا تم نے...... میڈیا یہ سکھا رہا ہے ان نوجوانوں کو...... مکالمے بازی! لگ رہا ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ سے بات کر رہا ہے۔ ہماری تو ہمت نہیں ہوتی تھی اپنے باپ کے سامنے زبان کھولنے کی۔"

"زمانہ بدل گیا ہے ڈیڈی۔" مدثر دھیرے سے مسکرایا۔

"آج کل کی اولاد بے شرم ہو گئی ہے۔" ڈیڈی بولے۔

"یہ آگہی کا دور ہے ڈیڈی...... اور آگہی، بے شرمی نہیں ہوتی...... ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ خود ہی کہہ رہے تھے وکیل صاحب سے کہ آج سے پہلے آپ نے کبھی یہ نہیں سنا کہ مطلقہ کو اپنی عدت کے دوران اسی جگہ رہنا چاہیے جہاں اسے طلاق دینے والا مرد رہتا ہے۔"

"ہاں، تو کیا میں نے غلط کہا۔"

"وکیل صاحب نے بھی غلط نہیں کہا...... انسان کے کلام میں غلطی ہو سکتی ہے...... کلام اللہ اس سے مبرا ہے۔ وکیل صاحب اللہ کی کتاب سے حوالے دے رہے تھے...... یہاں آپ کے پاس آنے سے پہلے میں قرآن مجید

میں سورۂ طلاق کا ترجمہ دیکھ کر آیا ہوں...... واقعی یہی حکم ہے کہ عدت کے دوران عورت کو گھر سے نہ نکالا جائے بلکہ مرد کو حکم ہے کہ اسے اسی جگہ رکھے جہاں وہ خود رہتا ہو۔"

"ایسا کر، تو بھی اس کے ساتھ اس کے ماں، باپ کے گھر چلا جا...... خود بھی وہیں رہنا اور اسے بھی وہیں رکھنا۔" ڈیڈی نے تلخ لہجے میں تجویز دی۔

"سات جوتے صبح سات شام پڑا کریں گے اس کے گھر کے ایک، ایک فرد سے۔" مدثر مسکرایا۔

"اچھا ہے ناں...... تیرے دماغ کی خرابی تو دور ہو جائے گی۔" ڈیڈی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ممی آپ سمجھائیں انہیں۔" مدثر نے ماں سے کہا۔

"تمہارے آنے سے پہلے سمجھا ہی تو رہی تھی...... خود کو زیادہ تماشا بنانے سے فائدہ...... ارے بھئی کتنے دن رہ لے گی وہ اس گھر میں...... حد سے حد آٹھ نو ماہ۔" ممی نے کہا

"اس کے اپنے ماں، باپ کے گھر میں جگہ نہیں ہے کیا اس کے لیے؟" ڈیڈی بھنا کر بولے۔

"یہ آپ نے اچھا سوال کیا ہے...... میرے خیال میں سارے مسئلے کی جڑ یہی سوال ہے...... ظاہر ہے اس کے لیے اس کے ماں، باپ کے گھر میں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہوگی لیکن ان لوگوں کی کچھ معاشرتی مجبوریاں ہیں...... دنیا کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ باقی بیٹیاں بھی رخصت کرنی ہیں...... انہیں میری وجہ سے تکلیف پہنچی ہے...... اگر کچھ عرصہ تسنیم کے یہاں رہنے سے اُن کی تکلیف میں کچھ کمی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"

"ایک بات بتا۔" ڈیڈی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو وکیل کیوں نہیں بن جاتا، بہت لوگوں کی تکلیف میں کمی کرنے کا موقع ملے گا تجھے۔" ڈیڈی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"آئیڈیا برا نہیں۔" مدثر مسکرایا۔ "پر اب جو بھی کرنا ہے باجی کے پاس جا کر۔" کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی پھر مدثر نے اس خاموشی کو توڑا۔ "جی ڈیڈی...... تو پھر اجازت ہے؟"

ڈیڈی اسے دیکھنے لگے۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے ڈیڈی کے عین روبرو جا کر کہا۔ "اسے میری نادانی کہا جائے یا اسکاٹ لینڈ جا کر سیٹل ہونے کی لالچ...... بہر حال میں نے آپ کی بات مان لی...... ایک ایسا کام کر ڈالا جس پر مجھے آج ہی نہیں آئندہ ساری زندگی بھی افسوس رہے گا...... اگر میں اسکاٹ لینڈ چلا بھی گیا تو یہ پچھتاوا میرے ساتھ جائے گا۔ ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا...... میں نے آپ کی بات مانی...... آپ کی خواہش کا احترام کیا...... اب آپ کو بھی میری خواہش کا احترام کرنا چاہیے ڈیڈی...... بیٹا ہوں آپ کا...... زندگی میں پھر کبھی کچھ نہیں مانگوں گا آپ سے......" اچانک وہ انتہائی دل گرفتہ دکھائی دینے لگا۔ "خواہش تھی کہ منعم کی بیوی اور بچے کی طرح میری بیوی اور بچے بھی اس گھر میں ہنسی خوشی رہتے مگر انسان کی ساری خواہشیں پوری کب ہوتی ہیں...... بہت پہلے اسکول میں بیت بازی کے مقابلے کے لیے ایک شعر یاد کیا تھا جو اس وقت یاد آ رہا ہے...... شاید کچھ یوں تھا......

ہر گل کے مقدر میں کہاں نازِ عروساں
کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لیے بھی"

مدثر نے دونوں ہاتھ باہم جوڑے اور انہیں عموداً کھڑا کرتا مجسم التجا بن گیا۔

ممی، ماں تھیں...... کھلنڈرے، لاابالی اور زندگی کو مذاق سمجھنے والے مدثر کو مجسم عاجز دیکھ کر ان کا دل پسیج

گیا...... احساسِ رنج و کرب انہیں مارنے لگا...... منعم کی بیوی کو بھی تو اس گھر نے اپنی امان میں لے ہی لیا تھا...... جبکہ وہ اور منعم تو گناہ کے مرتکب ہوئے تھے ان کا نکاح تو اس گھر میں آنے کے بعد پڑھایا گیا تھا اس سے پہلے تو وہ دونوں بغیر نکاح کے کبھی یہاں کبھی وہاں چھپتے اکٹھے رہتے رہے تھے۔ مدثر نے تو تسنیم سے نکاح کیا تھا...... بے شک ایک فاش غلطی کے ساتھ کہ دونوں میں سے کسی نے بھی اپنے بڑوں سے مشورہ کرنا یا ان کی اجازت لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اپنے، اپنے گھروں کی عزت داؤ پر لگادی تھی دونوں نے...... مگر غلطی تو اللہ بھی معاف کردیتا ہے...... کیا بندے اتنے گھمنڈی ہوگئے تھے کہ اپنے ہی جیسے بندوں کی غلطی کو معاف کرنے پر تیار نہ ہوئے...... بلکہ اپنی انا کی خاطر ایک نہیں کتنے ہی لوگوں کی زندگی میں زہر گھول دیا...... وقت گزر چکا تھا...... پچھتاوے باقی رہ گئے تھے...... اب صرف اتنا ہوسکتا تھا کہ کسک میں افاقے کے لیے زخم پر مرہم رکھ دیا جائے۔

”مان لیں اس کی بات، یہ تو اب مہمان ہے چلا جائے گا۔“ ممی نے ڈیڈی سے گڑگڑا کر کہا۔

”کیسے مان لوں، منعم کی بیوی کیا کہے گی؟“

”اسے مجھ پر چھوڑیں...... سمجھا لوں گی۔“

”اور دنیا...... دنیا کیا کہے گی۔“

”ابھی کسی کو کچھ پتا ہی نہیں...... لوگوں کی نظروں میں تو ہم لڑکی کو بیاہ کر اپنے گھر لائے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ یہاں رہے گی تو اس کے اپنے گھر کی عزت بھی بنی رہے گی۔ ہماری بھی...... آگے کا اللہ مالک ہے۔“

مرد کتنا ہی اَڑیل ٹٹو کیوں نہ ہو عورت کی اِک نگاہِ خاص اسے رام کرلیتی ہے، ممی کو ملال تھا کہ انہوں نے تسنیم کے لیے اس گھر میں جگہ نکالنے کی ویسی کوشش کیوں نہیں کی تھی جیسا کہ اس معاملے کا حق بنتا تھا۔

”جتنا عرصہ وہ اس گھر میں رہے، میرے سامنے نہ آئے۔“ ڈیڈی نے شرط رکھی۔

”ٹھیک ہے...... میں اس بات کا پورا خیال رکھوں گی۔“ ممی نے یقین دہانی کرائی۔ ”بلکہ آپ کو میری طرف سے یہ بھی اجازت ہے کہ جب تک وہ یہاں رہے آپ بے شک اپنا زیادہ وقت اپنی لاڈلی کے پاس گزاریں۔“

ڈیڈی نے چونک کر انہیں دیکھا...... ممی نے ان کے اور ان کی داشتہ کے تعلقات کو خواہ جبراً قہراً یا کسی بھی مصلحت کے تحت قبول تو کر رکھا تھا مگر اتنی فراخدلی سے انہوں نے کبھی انہیں اس عورت کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آخر وہ کیا بات تھی جس نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کردیا تھا...... یقیناً بیٹے سے ان کی محبت......

☆☆☆

سول جج کی عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، جج صاحب کرسیِ انصاف پر متمکن کیے بعد دیگرے مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ عدالت کے دروازے پر متعین ہرکارہ ہر تھوڑی دیر بعد دروازے پر چسپاں فہرست کے مطابق مدعی اور مدعا علیہ کے ناموں کی پکار دیتا۔ حجاب، امی کے ساتھ کمرے کی ایک چوبی بینچ پر کمٹی سمٹائی سی اپنے اور الطاف کے نام کی پکار پڑنے کی منتظر بیٹھی تھی۔ عدالت میں گزشتہ پیشیوں کی طرح اس روز بھی اس نے اپنا چہرہ ماسوا آنکھوں کے چادر سے ڈھانپ رکھا تھا...... زندگی میں یہ تجربہ بھی ہونا تھا...... پیشی والے دن

عدالت میں صبح سویرے حاضری، فہرست میں اپنا اور الطاف کا نام تلاش کرنا، اپنی وکیل سے ملنا اور مقدمے کی سماعت کے انتظار میں بیٹھے رہنا...... کبھی عدالت ہی میں کسی بینچ یا کرسی پر سمٹ کر بیٹھنے اور اپنی باری کا انتظار کرنے کی سہولت مل جاتی کبھی دروازے پر متعین، مدعی اور مدعا علیہ کے نام کی پکار لگانے والا ہرکارہ، پیشکار یا جج صاحب بنفسِ نفیس کمرے میں موجود اپنی باری کا انتظار کرتے مردوں ہی نہیں عورتوں کو بھی کمرے سے باہر جانے کو کہتے...... کبھی کبھی تو انتہائی توہین آمیز لہجے میں...... چنانچہ ہر پیشی پر عدالت میں امی کے ساتھ اپنی باری کے انتظار میں کسی بینچ، کسی کرسی پر دبکی وہ گاہے گاہے خائف نظروں سے کبھی عدالتی ہرکارے، کبھی پیش کار اور کبھی جج صاحب کو دیکھے جاتی...... جب ان میں سے کوئی نظر بگاڑ کر کمرے...... میں موجود ”فالتو“ لوگوں کو باہر نکل جانے کا حکم دیتا تو وہ بھی امی کے ساتھ شرمندہ شرمندہ سی وہاں سے باہر نکلنے پر مجبور ہوجاتی لیکن باہر احاطہ عدالت میں بے شمار مردوں کی گھورتی ہوئی نگاہیں اسے جلد ہی دوبارہ کمرے میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کردیتیں...... کس قدر تکلیف دہ تھا یہ امر کہ عدالتوں میں مقدمات کی سماعت کے سلسلے میں آنے والی خواتین کو بیٹھنے تک کے لیے مناسب جگہ میسر نہ تھی...... بہر حال اس کے اس تجربہ زندگی کا فائدہ اس کے اسکول میں آنے والے ملاقاتیوں کو ضرور پہنچا تھا۔ اپنے دفتر کے باہر لابی میں اس نے ملاقاتیوں کے لیے اسٹوڈنٹس فنڈ سے درجن بھر فوم کے گدّوں والی کرسیاں منگوا کر رکھوادی تھیں...... اور ساتھ ہی دو میزیں بھی جن پر تازہ اخبار اور چند میگزین رکھے رہتے تاکہ اپنی باری کا انتظار کرتے ملاقاتی بور نہ ہوں...... عدالت میں ایک روز سخت پیاس محسوس ہونے پر جب پانی نہ مل سکا اور جگہ چھن جانے کے خیال سے وہ اٹھ کر باہر نہ جاسکی تو اس نے اسکول کی لابی میں ایک واٹر کولر مع گلاس بھی رکھوادیا تھا۔ سچ ہے دوسروں کی تکلیف کا احساس کسی انسان کو خود ویسی ہی اذیت سے گزرنے پر ہوتا ہے...... صد شکر کہ اس پیشی پر اسے اور امی کو کسی نے باہر ہنکانے کی کوشش نہیں کی۔ اس روز عدالت میں سماعت پر لگے مقدمات کی دو ورقی فہرست میں اس کا نام تراسی نمبر پر تھا۔ گزشتہ پیشیوں کی طرح اس روز بھی الطاف بار بار عدالت میں آکر پیش کار سے سرگوشیوں میں بات کرکر کے باہر جاتا آتا رہا۔ پیش کار سے الطاف کے خصوصی مراسم کا عقدہ وہ اچھی طرح جانتی تھی...... پیسہ پھینک تماشا دیکھ! اور ان خصوصی مراسم ہی کا شاخسانہ تھا کہ پیش کار عموماً حجاب سے انتہائی اہانت کا روّیہ رکھتا...... عدالت میں بیٹھے ”فالتو“ لوگوں کو باہر نکل جانے کا اعلامیہ جاری کرتے وقت پیش کار کی نظریں حجاب پر ہوتیں۔

حجاب آفریدی بنام الطاف احمد خان کی پکار پڑنے پر وہ امی کے ساتھ اپنی وکیل کی اوٹ میں جا کھڑی ہوئی۔ کارروائی شروع ہوئی...... ایک بات اس کی وکیل نے کہی...... دوسری الطاف کے وکیل نے...... الطاف اپنے وکیل کے ساتھ بنفسِ نفیس موجود تھا۔

”بی بی! خلع کیوں لینا چاہتی ہو؟“ جج نے یکایک روئے سخن اس کی طرف کیا۔

”سر! وجوہات میری وکیل صاحبہ پٹیشن میں بیان کرچکی ہیں۔“ اس نے انتہائی اعتماد سے جواب دیا۔

”دیکھو بی بی...... جس معاشرے میں تم رہ رہی ہو وہاں متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے مناسب بر ملنا بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے...... اپنے شوہر پر تمہارا امین الیگیشن یہ ہے کہ تم سے نکاح کرتے وقت وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس نے تم سے اور تمہارے گھر والوں سے اپنا شادی شدہ ہونا چھپایا...... جب تمہیں یہ بات معلوم

ہوئی تو تم نے اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر جانے سے انکار کر دیا...... یہی بات ہے ناں؟''

''جی سر!''

''تمہارا خاوند ایک ذی حیثیت شخص ہے، اس کا بیرون ملک بڑا کاروبار ہے۔ اس کے پاس قیمتی اثاثے ہیں...... تم سے نکاح کرتے وقت اس نے تمہیں پچاس تولہ طلائی زیورات چڑھائے...... خطیر مہر رکھا...... اور ایک مربع اراضی تمہارے نام لکھ کر دی...... کیوں ایسا ہی ہے ناں؟''

''ہم عدالت کے توسط سے وہ سب کچھ لوٹانے کو تیار ہیں۔'' حجاب نے کہا۔

''لیکن تمہارا خاوند تم سے کچھ واپس نہیں لینا چاہتا بلکہ تمہاری مزید ہر شرط ماننے کو تیار ہے۔''

''لیکن سر میں ان کے ساتھ اپنا رشتہ ہی نہیں رکھنا چاہتی۔''

''آخر کیوں؟''

''میں پھر وہی جواب دوں گی کہ میری وکیل صاحبہ یہ سب کچھ میری طرف سے دائر کی جانے والی پٹیشن میں درج کر چکی ہیں۔''

''بی بی! عورت کو مرد سے کیا چاہیے ہوتا ہے...... محبت، تحفظ اور کفالت۔ تمہارا شوہر تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنے کو تیار ہے...... عدالت کو فراہم کردہ دستاویزی حقائق کے مطابق وہ معاشی طور پر اتنا مستحکم ہے کہ ایک نہیں چار عورتوں کی کفالت کر سکتا ہے۔ وہ تم سے اتنی دلی وابستگی رکھتا ہے کہ تمہاری خاطر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کو تیار ہے...... پھر آخر کیوں خلع لینا چاہتی ہو تم اس سے؟''

''سر! اس بے چاری کا کیا قصور...... میں اس کا گھر نہیں اجاڑنا چاہتی۔''

''یہ تمہارا حسنِ ظن ہے...... بہت اچھی بات ہے...... مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تم ایک دوسری عورت کا گھر تو نہیں اجاڑنا چاہتیں مگر اپنے ہاتھوں اپنا گھر برباد کرنا چاہتی ہو۔''

''جج صاحب! جس رشتے کی بنیاد جھوٹ پر ہو وہ زیادہ دیر چل نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن ٹوٹ جاتا ہے۔''

''بی بی! تمہارے شوہر نے تم سے نکاح کے وقت اپنی پہلی بیوی کی موجودگی کو مصلحتاً تم سے اور تمہارے گھر والوں سے چھپایا۔ اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔''

''لیکن میں ہرٹ ہوئی ہوں...... ہرٹ ان کی دوسری شادی سے ان کی پہلی بیوی بھی یقیناً ہوئی ہوگی...... دو عورتیں کیوں ماری جائیں...... عورت کو عورت کا حق نہیں مارنا چاہیے جج صاحب...... میں چاہتی ہوں ان کی پہلی بیوی عورت کو عورت کا دشمن نہ سمجھے۔''

''تمہارا شوہر اس عورت سے دلی رغبت نہیں رکھتا۔''

''یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''تم سے انہوں نے پسند کی شادی کی ہے...... ان کے ساتھ اپنا گھر بساؤ...... ہنسی خوشی زندگی بسر کرو...... پہلی بیوی سے تمہیں اتنی ہی ہمدردی ہے تو ان سے کہو اسے بھی رکھیں...... اسلام مرد کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ مرد عدل کر سکے۔''

''یہ عدل نہیں کر سکیں گے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' جج چونکا۔

''جو شخص دوسری کی خاطر پہلی کو چھوڑنے کی بات کرتا ہے، وہ تیسری کی خاطر دوسری کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔''

''ایسا موقع ہی کیوں آنے دیا جائے بی بی۔'' جج نے حجاب کی آنکھوں میں براہِ راست اپنی آنکھیں ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ حجاب اس کی بے حجابی پر جھینپ گئی۔

''سر! اس قسم کے معاملات میں موقع آتا نہیں...... جان بوجھ کر لایا جاتا ہے۔'' جج بے اختیار ہنس پڑا۔

''سر! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' الطاف کے وکیل نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

''اگلی پیشی پر بحث ہوگی۔'' جج نے الطاف کے وکیل کی درخواست کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اگلی پیشی کے لیے عدالت نے بیس دن بعد کی تاریخ دی۔

''سر! میرا موکل دو ماہ کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہے۔ فاضل عدالت سے میری درخواست ہے کہ اگلی پیشی کے لیے دو ماہ بعد کی تاریخ دی جائے۔'' الطاف کے وکیل نے عدالت سے درخواست کی۔

درخواست منظور کر لی گئی۔ حجاب اور اس کی وکیل نے لمبی تاریخ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوشش کی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ الطاف اور اس کے وکیل کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ جج صاحب چائے کے وقفے کے لیے اٹھ گئے۔

''بی بی! لمبی تاریخ تمہیں اچھی طرح سوچنے کا موقع دے گی۔'' پیشکار نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر امی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اماں جی، آپ اس خاتون کی کیا لگتی ہو؟''

''والدہ......'' امی نے جواب دیا۔

''سمجھاؤ اپنی بیٹی کو...... کیوں اپنا گھر برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے......'' پھر حجاب کی وکیل سے بولا۔ ''وکیل صاحبہ آپ بھی اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالیں جی...... گھر بگڑنے پر شیطان بہت خوش ہوتا ہے۔''

حجاب دل ہی دل میں پیش کار کو برا بھلا کہتی امی اور اپنی وکیل کے ساتھ...... عدالت سے باہر نکل آئی۔ آج اسے اپنی وکیل کے ''ٹھس'' رویّے پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ لمبی تاریخ لینے کے لیے الطاف کے وکیل نے کتنا واویلا مچایا تھا۔

''نہیں جی، نہیں میرا موکل دو ماہ سے پہلے بیرونِ ملک سے واپس آ ہی نہیں سکتا اور بحث کے موقع پر اس کی موجودگی ضروری ہے۔'' اور اس کے وکیل نے بس اتنا کہا۔ ''اتنی لمبی تاریخ نہ دیں۔''

''مجبوری ہے وکیل صاحبہ...... اب تو جج صاحب بھی چائے کے لیے اٹھ چکے ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' پیش کار نے فائل بند کر کے نیچے رکھ دی تھی۔

اپنی آبائی جائداد کا مقدمہ ہاری ہوئی اس کی ایک دل جلی کولیگ اکثر کہا کرتی تھیں۔

''ہمارے ہاں عدالتوں میں انصاف بکتا ہے۔'' انصاف بکتا ہو یا نہ بکتا ہو زرداروں کا زور چلتا ہے اور بے زروں کی تحقیر بہت کی جاتی ہے عدالت میں پیشیاں اسے اس تلخ حقیقت کی فرسٹ ہینڈ گواہ بننے میں بہت مدد دے رہی تھیں۔

☆☆☆

اس گھر میں تسنیم کے آنے سے تسنیم ہی نہیں اس گھر کے مکین بھی جیسے صلیب چڑھ گئے تھے۔ مدثر، والدین کے ہزار منع کرنے کے باوجود ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا تھا۔ آخری سمسٹر کے بس آخری آخری دن تھے۔ وہ اپنی ویزا درخواست پر برطانوی قونصلیٹ کے مثبت ردِعمل کے لیے دعا گو تھا۔ یہاں تو پڑھے لکھے نوجوانوں کی بے روزگاری کا یہ عالم تھا کہ دیکھ کر عبرت ہوتی۔ ایم اے، ایم ایس سی، ایم بی اے، ایم فل، انجینئرنگ، میڈیکل کی ڈگریاں ہاتھ میں لیے کچھ بہتر روزگار کے لیے دھکے کھا رہے تھے۔ اسی لیے جسے موقع ملتا باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ وطن سے باہر فراہمی معاش کے لیے کچھ اخلاقی قدریں، کچھ قاعدے ضابطے تو تھے جن کی پاسداری کی جاتی تھی یہاں تو ڈفلی پر میرا بیٹا، تیرا بھائی، تیرا بھانجا، میرا بھتیجا کا راگ چھڑا ہوا تھا۔ باہر مزدور بھی پیٹ بھر کھانا اور تن پر کپڑا ضرور پاتا۔ یہاں تو مہنگائی نے متوسط طبقے کا بھی بُھرکس نکال رکھا تھا۔ مدثر اوسط درجے کا طالب علم رہا تھا۔ خوش قسمتی کہ باپ کا ہوٹل تھا۔ چاہتا تو باپ کے کاروبار کے سہارے عزت سے گزر بسر کر سکتا تھا۔ مگر اول تو اسے خود اسکاٹ لینڈ میں بسی بہن کے پاس جا کر رہنے کی خواہش تھی...... دوسرے حالات اب ایسے ہو گئے تھے کہ اسے نجات اور بقا کے لیے دیارِ غیر جا بسنے ہی میں عافیت نظر آتی تھی۔ تسنیم اس کی زندگی کا ایک ایسا سلگتا ہوا باب بن گئی تھی جس کے بارے میں وہ جتنا سوچتا تپش اتنی ہی بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی۔

تسنیم کو یوں لگتا جیسے وہ اپنی سزا کاٹنے کے لیے کسی جیل خانے میں مقید کر دی گئی تھی۔ وہی کمرا جس میں اس گھر آنے کے بعد اس کا اول رات قیام رہا تھا اس کی کال کوٹھڑی قرار پائی تھی۔ اسی کمرے میں اس کے روز و شب گزر رہے تھے۔ وہیں اسے صبح ناشتا اور دونوں وقت کھانا پہنچا دیا جاتا۔ صفائی والی آتی اور خاموشی سے صفائی کر کے چلی جاتی۔ بستر کی چادر تبدیل کرنا ہوتی تو دھلی چادر بچھا کر میلی چادر اپنے ساتھ لے جاتی۔ شروع میں اس نے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر تسنیم کی سرد مہری نے اسے چپ لگا دی تھی۔ کمرے میں بند، بیکار اور چپ بیٹھے بیٹھے اسے وحشت سی ہونے لگتی...... دیوار پر آویزاں کیلنڈر کو تکتے تکتے اس کی آنکھیں بھر آنے لگتیں۔ ابھی تو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا...... اسے اپنی کوکھ میں نمو پاتی زندگی کے دنیا میں آنے تک اسی قید خانے میں رہنا تھا...... کبھی کبھی اسے تقدیم پر غصہ آنے لگتا...... کیا ضرورت تھی یہ سارا کھڑاگ کھڑا کرنے کی...... گو اماں، ابا کے گھر میں بھی اس کے لیے کوئی باغ و بہار انہ حالات تو نہ تھے۔ وہاں بھی دل کے اندر ایسا ہی حُزن اور دل سے باہر ایسا ہی سناٹا پھیلا رہتا تھا مگر تنہائی اور درماندگی نہ تھی...... وہاں اپنوں کے درمیان ہونے کا احساس اندھے کی لاٹھی کے مصداق تھا۔ یہاں تو باہر سے آنے والی آوازیں بھی اس کمرے تک پہنچتیں تو غیریت اور اجنبیت کا احساس دیتیں...... کبھی مدثر کی ممی کی کسی ملازم کو ہدایت، تنبیہ یا ڈانٹ ڈپٹ کی آواز، کبھی منعم کی بیٹے کے ساتھ لاڈ پیار کی آواز، کبھی ڈیڈی کی کھانسی یا کسی فردِ خانہ سے بات چیت، کبھی منعم اور مبشر کی آوازیں، کبھی نورین کی ہنسی کی آواز، کبھی اس کے ہائی ہیل جوتوں کی فرش پر کھٹ کھٹ، کبھی اس کے زینہ اترتے یا چڑھتے قدموں کی نغمگی، کبھی اس کی اپنے بچے کے ساتھ کھیلنے کی آوازیں...... اسے نورین پر کبھی رشک آتا کبھی حسد محسوس ہوتا...... وہی اچھی تھی کہ سارے کارن کر کے بھی اس گھر میں رچ بس تو گئی تھی۔ آوازوں کے اس ہجوم میں اسے وہ آواز دور دور تک نہ سنائی دیتی جو اسے کھلی آنکھوں سپنے دکھاتے دکھاتے اس

برزخ تک کھینچ لائی تھی۔ جہاں وہ ان دنوں اپنی زندگی کے روز و شب گزار رہی تھی۔ اس برزخ میں اس کے لیے بس وہ گنی چنی ساعتیں حیات افزا ہوتیں جب گھر سے اماں یا تقدیم کا فون آجاتا...... ابا بالکل بات نہ کرتے...... تقدیم کے علاوہ باقی بہنوں کی آوازیں سننے کو ترس گئی تھی وہ۔ تقدیم صبح سے رات تک کئی مرتبہ فون کرتی خواہ چند سیکنڈز ہی کو سہی...... دو مرتبہ ملنے بھی آچکی تھی۔ ایک مرتبہ اویس انصاری کے ساتھ اور ایک مرتبہ تعظیم کے ہمراہ......!

اویس انصاری نے اس کا نفقہ بھی مقرر کروا دیا تھا۔ وہ ضرورت تو محسوس نہیں کرتی تھی مگر بقول تقدیم، مدثر اور اس کے گھر والوں پر کچھ تو دباؤ پڑنا ضروری تھا۔ تسنیم کے نزدیک یہ سب کچھ بڑا بے معنی سا تھا...... جب وہ شخص ہی زندگی سے نکل گیا جس کے ہونے سے زندگی، زندگی تھی تو اس کے بعد چند ماہ ہی کو سہی اس کے گھر میں رہنا یا اس سے نفقہ لینا غیر اہم تھا...... شاید تسنیم کے لیے یہ سب کچھ اہم ہو جاتا اگر اسے تحفظ دینے کو ماں باپ کے گھر کی چھت کا آسرا نہ ہوتا...... اخلاقی اور جذباتی سہارا دینے کو اس کے ماں باپ، بہن بھائی نہ ہوتے...... صبح شام گزارنے کے لیے دو وقت روٹی کی فکر دامن گیر ہوتی...... معاشرے میں کتنی ہی تھیں ایسی عورتیں جن کے شوہروں نے انہیں طلاق دے کر دھکے کھانے کو اپنے گھروں سے نکال دیا تھا اور وہ سر چھپانے اور نان و شبینہ کے لیے دوسروں کی محتاجگی پر مجبور تھیں۔

اویس انصاری کے کہنے پر ایک پرائیویٹ اسپتال میں اس کا نام بھی لکھوا دیا گیا تھا۔ پہلی بار منعم کی بیوی نورین کو اس کے ہمراہ بھیجا گیا تھا اور اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے زیادہ منہ نہ لگائے۔ گاڑی منعم ڈرائیو کر رہا تھا۔ نورین اس کے ساتھ آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ تسنیم پچھلی سیٹ پر تھی۔ ممی کی اترن بلوچی کڑھائی والی سوئز لان کی بڑی سی چادر اوڑھے اور نظریں نیچی کیے وہ بصورت مجرم شرمساری بیٹھی تھی۔ منعم گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بار بار اپنے سامنے لگے آئینے میں اس کے چہرے کا عکس دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ ''لڑکی اچھی تھی بھائی نے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔'' بھائی اور باپ کے درمیان کیا کھچڑی پکی تھی وہ اس سے لاعلم تھا۔

گائناکالوجسٹ نے متوقع تاریخ وضع حمل دے دی تھی۔ تسنیم کو لگتا تھا جیسے وہ تاریخ قرنوں دور تھی۔ اس قید سے رہائی کے لیے اس تاریخ کا انتظار گویا برزخ کے مکینوں کے لیے قیامت کے انتظار کے مترادف تھا۔ دن بہت مشکل سے گزرتے لگ رہے تھے۔

☆☆☆

عباد کو بالآخر اپنی منشا کا رشتہ مل گیا تھا لڑکی اور اس کے والدین برطانوی قومیت کے حامل تھے۔ والدین عرصہ دراز سے برطانیہ میں قیام پذیر تھے۔ برمنگھم میں ان کا خاصا وسیع کاروبار تھا۔ کروڑوں نہیں اربوں میں کھیلتے تھے۔ لڑکی اپنے والدین کی واحد اولاد تھی اور اس ناتے ان کے تمام اثاثوں کی اکلوتی وارث۔ والدین کو اپنی اکلوتی وارث کے لیے ایک فرمانبردار شوہر کی تلاش تھی جو خاندانی، وجیہہ، تعلیم یافتہ، گھر دامادی پر راضی، بیرون ملک سیٹل ہونے کا خواہاں اور نہایت مختصر فیملی کا حامل ہو۔ عباد ان تمام خوبیوں سے متصف تھا۔

لڑکی خوفناک حد تک موٹی، بدصورت اور مردانہ چال ڈھال کی حامل تھی۔ برطانیہ میں قیام پذیر کسی بھی نوجوان سے وہ اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ بقول والدِ بزرگوار برطانیہ میں ایشیائی نوجوانوں کی اکثریت ''ان پری ڈکٹیبل''، یعنی ناقابلِ پیشگوئی تھے۔ گوری کی خاطر بیاہتا ایشیائی بیوی کو چھوڑنے میں دیر نہ

لگاتے۔ ان کی لاڈوں پلی اکلوتی بیٹی ایسا کوئی خطرہ مول نہ لینا چاہتی تھی۔ اسے سدھا ہوا شوہر درکار تھا جو اس کے کھونٹے سے آکر بندھے تو دائیں بائیں دیکھنے کی جرأت نہ کرے۔ اسی لیے وہ پاکستان میں کوئی شریف لڑکا تلاش کرنے برطانیہ سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے عمومی اشتہارات سے ہٹ کر علیحدہ باکس میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار دیا تھا اور شارٹ لسٹڈ امیدواروں کو بنفسِ نفیس بات چیت کے لیے بلایا تھا۔ عباد انہی خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔

لڑکی کے باپ نے عباد سے ابتدائی تعارف کے بعد کہا۔ ''مسٹر عباد! میری بیٹی سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کی جاتی۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ہالیڈیز پر اسپین جاتے ہوئے دورانِ پرواز اس نے اسپین کے بجائے سوئڈن جانے کی ضد باندھ لی۔ میں فلائٹ کا رخ سوئڈن کی طرف نہیں موڑ سکا اور وہ مجھ سے ناراض ہوگئی۔ دو دن اسپین میں ٹھہر کر میں اور اس کی ماں اسے سوئڈن لے گئے تب کہیں جاکر اس کا موڈ ٹھیک ہوا۔ مجھے اپنی بیٹی کے لیے ایسا شوہر چاہیے جو اس کی ہر بات بے چون وچرا مان لے۔ وہ اگر دن کو رات کہے تو وہ کہے رات۔ وہ کہے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ تو وہ کوئی بحث مباحثہ نہ کرے ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جائے۔ لڑکے کو شادی کے بعد برطانیہ جانا ہوگا...... گھر داماد رہے گا۔ بیٹی کو جہیز میں فلی فرنشڈ گھر ملے گا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لڑکے کو سلامی میں اس کی پسند کی نئی گاڑی ملے گی اور بلینک چیک جس پر وہ میری بیٹی کی مرضی سے رقم لکھنے کے بعد اکاؤنٹ ہولڈر یعنی مجھ سے سائن کرائے گا۔ مجھے اپنی بیٹی کے لیے ایک فرمانبردار شوہر چاہیے۔''

عباد نے انتہائی فرمانبردارانہ اندازِ نشست اختیار کرتے ہوئے مؤدبانہ کہا۔ ''سر اگر مجھے خدمت کا موقع دیا گیا تو آپ مجھے اپنی توقعات سے بڑھ کر پائیں گے۔''

''بات ہماری توقعات کی نہیں صاحبزادے ہماری بیٹی کے معیار پر پورا اترنے کی ہے۔ وہ اپنی کسی بات پر انکار سننے کی عادی نہیں، میں نے تمہیں بتایا ناں اسپین کے بجائے سوئڈن نہ جانے پر وہ کتنی ناراض ہوگئی تھی کہ ہمیں اسپین میں اپنا قیام مختصر کرکے سوئڈن جانا پڑا۔''

''آپ فکر نہ کریں سر وہ جیسا جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا۔ اگر ایسی کوئی صورتِ حال پیش آگئی تو میں جہاز کا رخ ان کی مرضی کے مطابق مڑوانے کے لیے جہاز کے عملے کو جہاز سے چھلانگ لگانے کی دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔'' لڑکی کا باپ مسکرایا۔ عباد کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ جذباتی ہوگیا تھا۔ اس احساس نے اسے خفت سے دوچار کر دیا۔

''برخوردار، جوشِ جذبات میں یہ مت بھولنا کہ جہاز سے چھلانگ لگانا تمہارے اختیار میں ہوسکتا ہے مگر چھلانگ لگانے کے لیے جہاز کا دروازہ کھولنا تمہارے اختیار سے بہت دور کی بات ہے۔'' لڑکی کے والد کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

''سر دھمکی دینے میں کیا حرج ہے۔''

''کوئی حرج نہیں...... جیسے میں تم سے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ ہمارے پاس شارٹ لسٹڈ امیدواروں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے لیکن شاید ہم تمہارے بارے میں سوچیں گے۔''

''تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ سر۔'' عباد سراپا شکر گزار ہو کر بولا پھر اس نے ملازمت کی رٹی رٹائی

درخواستوں کے اختتامی پیرا میں درج کیا جانے والا مخصوص جملہ انتہائی خشوع سے رواں انگریزی میں ادا کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر مجھے خدمت کا موقع دیا گیا تو میں آپ کو مطمئن کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا۔

''سر ایک گزارش ہے۔'' اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو۔''

''میری ایک والدہ بھی ہیں۔''

''ہر انسان کی ایک ہی والدہ ہوتی ہے۔''

''سر اُن کا بھی کچھ بندوبست ہو سکے گا؟''

''کیا بندوبست کروانا چاہتے ہو؟''

''سر وہ...... وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔''

''اور تم...... تم رہ سکتے ہو ان کے بغیر؟''

''سر مجبوری میں تو رہ لوں گا لیکن مشکل ہو گا میرے لیے۔''

''او کے...... اگر ہمارا فیصلہ تمہارے حق میں ہوا تو ہم تمہاری والدہ کو بھی وہاں بلوا لیں گے۔''

''بنڈل آف تھینکس سر...... بنڈل آف تھینکس۔''

عباد کی قسمت نے زور دکھایا اور تقریباً ہفتہ بھر بے تابانہ انتظار کے بعد اسے اپنے موبائل فون پر لڑکی کے باپ کی جانب سے یہ مژدہ سننے کو ملا کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ دینے سے قبل ایک مرتبہ اس کے ساتھ امی سے بھی ملنا چاہتے تھے۔

عباد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا مگر امی کا دل بجھا بجھا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے عباد اپنا سودا کر رہا ہو۔ افسوس انہیں یہ تھا کہ انہوں نے تو کبھی عباد کو زر پرستی کا سبق نہیں دیا تھا۔ انہوں نے تو اسے خودداری کے ساتھ سر اٹھا کر جینا سکھایا تھا، نہ جانے اس کے دل کو زر پرستی کی وبا کہاں سے لگ گئی تھی اور کیوں لگ گئی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سادہ لوح کسان اپنی فصل کی آبیاری میں دن رات ایک کر کے اسے بار آور ہونے کے لائق بناتا ہے لیکن جب فصل ثمر بار ہوتی ہے تو اسے یکا یک پالا مار جاتا ہے۔ عباد کے دل کو بھی زر پرستی کا پالا مار گیا تھا۔

☆☆☆

دروازے کے پٹ پر ہلکی سی کھٹکھٹاہٹ نے تقدیم کو چونکنے اور اپنے دفتری کام سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''حاضر ہو سکتا ہوں؟''

''جی...... جی۔'' وہ اسے دیکھتے ہی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تشریف لائیں۔'' وہ کمرے میں آ گیا۔

''پلیز۔'' تقدیم نے میز کے دوسری طرف اپنے روبرو پڑی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا۔

''کافی دن ہو گئے تھے آپ سے بات ہوئے سوچا آج کورٹ جاتے ہوئے ملتا جاؤں۔'' اویس انصاری نے اپنی آمد کا سیاق وسباق بیان کیا۔

''شکریہ۔'' تقدیم کو اس کے سوا اور کوئی جواب نہ سوجھا۔

''اور سنائیں۔''

''جی بس اللہ کا کرم ہے۔'' تقدیم مطمئن انداز میں بولی۔

''اس کا کرم ہو تو پھر کہیں اور دیکھنے کی حاجت نہیں رہتی۔''

''درست۔''

''اور اِدھر اُدھر دیکھنے سے ملتا بھی کیا ہے۔''

''بندوں کے لیے بندے وسیلے بھی اسی کے کرم سے بنتے ہیں اویس صاحب۔ آپ نے میری چھوٹی بہن کے معاملے میں جس طرح مدد فرمائی، میں اور میرے گھر والے ہمیشہ آپ کے شکر گزار رہیں گے۔ ابا تو آپ کے اتنے معتقد ہو گئے ہیں کہ ہر دوسرے دن مجھ سے کہتے ہیں اویس صاحب سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام دینا۔ میری والدہ سے اگرچہ آپ کی ملاقات نہیں ہوئی مگر غائبانہ وہ بھی آپ کو بہت دعائیں دیتی ہیں۔''

''میرا سلام کہیے گا۔''

''ضرور۔''

''ویسے بہن کے حالات کیسے جا رہے ہیں؟''

''ٹھیک ہے، روزانہ دو تین مرتبہ فون پر بات ہو جاتی ہے اس سے۔ چھوٹی بہن کے ساتھ پچھلے ہفتے ملنے بھی گئی تھی اس سے...... تنہائی سے بور ہوتی ہے مگر مجبوری ہے۔ آئندہ ہفتے ڈاکٹر سے بھی اپائنٹمنٹ ہے اس کی۔ اسپتال میں نام لکھوانے کے لیے تو مدثر کے چھوٹے بھائی کی مسز کو ساتھ بھیجا گیا تھا اس کے ساتھ۔ اب وہ خود ہی چلی جاتی ہے، گاڑی دے دی جاتی ہے اسے آنے جانے کے لیے، ڈرائیور اسے لے جاتا ہے۔''

''گھر والوں کا رویہ؟''

''سرد۔''

''مگر جو آپ کا مقصد تھا، وہ تو پورا ہو رہا ہے۔''

''جی بالکل سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ رخصتی کے اگلے ہی دن تسنیم کے گھر آ بیٹھنے سے ایک، ایک کو جو وضاحت دینی پڑتی اس سے بچ گئے ہم لوگ۔ دوسرے مدثر اور اس کے گھر والوں کو بھی پتا چلا کہ طلاق دے کر لڑکی کو گھر سے باہر نکال پھینکنا کوئی ایسی آسان بات نہیں۔ عورت کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے اویس صاحب طلاق پانے والی اکثر بدقسمت خواتین اور ان کے متعلقین کو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ طلاق کے بعد وہ اپنی عدت کے دوران نفقے کی حق دار ہیں۔ سکونت کے حق سے آگہی تو بہت دور کی بات ہے۔''

''ایسا ہی ہے مس تقدیم۔'' اویس انصاری نے تائید کی۔

''حدود آرڈیننس جیسے مادر پدر آزاد قانون کی حمایت میں ریلیاں نکالنے والوں کو کبھی خیال نہیں آتا کہ احکام اللہ کی خلاف ورزی کر کے بیک وقت تین طلاقیں دے دینے والے مردوں اور طلاق کے بعد عدت کے دوران مرد کی طرف سے مطلقہ کے شرعی حقوق کی ادائیگی کے لیے ریلیاں نکالیں تاکہ آگہی عام ہو۔''

''بالکل ہونا چاہیے ایسا...... مغرب میں عورت کی اپنے حقوق سے آگہی مرد کو اتنا خوفزدہ رکھتی ہے کہ وہ صرف انتہائی صورتوں میں ہی طلاق کی سوچتا ہے۔ وہ جانتا ہے عورت کو طلاق دے گا تو اس کے جملہ اثاثوں کا

بٹوارا ہوگا...... جان آسانی سے نہیں چھوٹے گی۔"

"ہمارے ہاں بھی ایسی کوئی قانون سازی ہونی چاہیے اویس صاحب جو طلاق کو مرد کے لیے اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل بننے سے بچائے۔ میری بہن تسنیم کا معاملہ ہی دیکھ لیجیے، مدثر نے بلا کسی وجہ بغیر کسی عذر کے اسے طلاق بھجوادی۔ اس کے نزدیک تو کھیل ہی ہوا ناں۔ اس کی تو پوری زندگی برباد کردی اس بدتمیز آدمی نے۔" شدتِ رنج سے تقدیم کی آواز بھرّا گئی۔ "میں نے جو عدت کے دوران تسنیم کو اسی گھر میں رکھنے کے لیے آپ کی مدد لی ہے اس کا بنیادی سبب تو یہی تھا کہ اس گھر سے تسنیم کا تعلق ظاہر کرنا ہماری معاشرتی ضرورت تھی یا مجبوری کہہ لیں۔ دوسرے طلاق کو کھیل سمجھنے والوں کو بھی تو پتا چلے کہ عورت کو طلاق دینا اور گھر سے نکال دینا اتنا آسان نہیں۔ تسنیم کا اس گھر میں رہنا آسانی سے ہضم نہیں ہورہا ہوگا ان لوگوں کو۔ بہن بتارہی تھی گھر میں سب کی آوازیں سنائی دیتی ہیں مگر مدثر کی نہیں۔"

"وہ گھر میں رہ ہی کب رہا ہے جو اس کی آواز سنائی دے گی۔"

"اچھا۔" تقدیم نے چونک کر اویس انصاری کو دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم؟"

"میرے پاس آیا تھا وہ......"

"کب؟" تقدیم کو پہلے سے بڑھ کر اچنبھا ہوا۔

"دو دن پہلے...... وہ ہاسٹل میں رہ رہا ہے۔ جس دن آپ کی ہمشیرہ کا اس گھر میں عدت گزارنے کا فیصلہ ہوا وہ اس سے اگلے دن ہی گھر سے ہاسٹل شفٹ ہوگیا تھا۔ اگلے ہفتے وہ یو کے جارہا ہے۔" تقدیم چونکی۔

"ذمے داری سے فرار حاصل کرنے کی خاطر۔"

"نہیں...... ایسی بات نہیں۔"

"تو پھر؟"

"اگر اسے ذمے داری سے فرار اختیار کرنا ہوتا تو اسے میرے پاس آنے کیا ضرورت تھی۔ وہ بطورِ خاص ملنے اور یہ بتانے کے لیے آیا کہ وہ یو کے جارہا ہے اور یہ بھی کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی فیملی کا کوئی فرد آپ کی ہمشیرہ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ وہ ڈلیوری کے بعد بھی جتنے دن چاہیں اس گھر میں رہ سکتی ہیں۔ نفقے کے لیے اس نے یقین دہانی کرائی ہے کہ بغیر کسی تعطل کے ماہ بہ ماہ ملتا رہے گا۔ ہر وزٹ پر ڈاکٹر کی فیس، دواؤں اور ڈلیوری کے تمام اخراجات کے لیے وہ اپنی والدہ کو ذمے دار بنا کر جارہا ہے۔"

"اور اگر اس کے جانے کے بعد اس کے گھر والوں نے کوئی مسئلہ کھڑا کردیا تو؟" تقدیم کے لہجے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہوگا...... اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا ہے اور وہاں کا فون نمبر بھی۔ وہاں اس کی سگی بہن اور بہنوئی رہتے ہیں اسکاٹ لینڈ میں وہ انہی کے ساتھ رہے گا...... کوئی مسئلہ کھڑا ہونے کی صورت میں اس نے مجھے اسی ایڈریس اور فون نمبر پر رابطہ کرنے کو کہا ہے۔"

"کون جانے اس کی پلاننگ کیا ہے۔"

"اس کی پلاننگ یہ ہے کہ وہ وہاں جا کر کام کرے گا اور وہیں سے اپنے ہونے والے بچے کی کفالت اور اس کی ماں کا حقِ رضاعت ادا کرے گا۔" تقدیم متفکر سی دکھائی دینے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں۔" اویس انصاری نے اسے تسلی دی۔

"ایسے بے ایمانوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا جو نکاح جیسے بندھن کو توڑنے میں دیر نہیں کرتے، ان کے وعدوں کا کیا اعتبار۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر اعتبار کیے بِنا ہمارے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں۔" اویس انصاری نے کہا۔

"اسے کورٹ کے ذریعے باہر جانے سے روکا نہیں جاسکتا؟" اویس انصاری دھیرے سے مسکرایا۔

"جن کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ہوتے ہیں جب وہ باہر جانے کا تہیہ کرلیں تو کبھی اتھارٹیز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور کبھی اربابِ اختیار سے ساز باز کرکے وہ بھی نکل جاتے ہیں مس تقدیم۔"

"پھر اس ساری تگ و دو کا فائدہ کیا ہوا؟ مدثر تو باہر جا کر کسی دباؤ میں نہیں رہے گا ناں!"

"اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔ آپ کی ہمشیرہ کو طلاق دینے پر پچھتاوا ہے اسے۔ رو رہا تھا میرے سامنے بیٹھ کر۔"

"مگر مچھ کے آنسو بہا رہا ہوگا۔" تقدیم نے تلخی سے کہا۔

"آپ کو تکلیف پہنچی ہے اس کی طرف سے...... آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔"

"تکلیف!" تقدیم کے لہجے میں کرب تھا۔ "تکلیف بہت چھوٹا لفظ ہے اویس صاحب۔ تسنیم کی طلاق، اس کی کورٹ میرج سے بڑا سانحہ ثابت ہوئی ہے ہم سب کے لیے...... خود تسنیم کے لیے بھی۔ شاید...... شاید کبھی ہم تسنیم کی اس غلطی کو بھلانے میں کامیاب ہوجائیں گے اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی لیکن یہ بھلانا ممکن نہیں ہوگا کہ مدثر نے اسے طلاق دی ہے۔"

"حلال امور میں طلاق اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ اسی لیے تو ہے کہ اس کے اثرات بہت دور تک جاتے ہیں، بہت دیر تک رہتے ہیں۔"

”مجھے تو لگتا ہے ہم ساری زندگی اس کرب سے نہیں نکل پائیں گے۔ ہر اگلے دن اذیت پچھلے دن سے زیادہ بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔“ تقدیم کی آواز بھرا گئی۔ ”تسنیم کے چکر میں ہم باقی بھائی بہنوں کو بھی بھول گئے بڑی بہن تمہید کی شادی کی فکر جیسے اب کسی کو بھی نہیں رہی۔ بھائی کا ایک دن بھی فون نہیں آتا تو سب پریشان ہوجایا کرتے تھے اب دو دو دن بھی نہ آئے تو سب کو بس ایک ہی فکر رہتی ہے تسنیم نہ جانے کس حال میں ہوگی۔“ دفعتاً اسے جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”اوہ، آئی ایم سوری۔“ تقدیم کے چہرے پر کرب انگیز مسکراہٹ ہویدا ہوئی۔ ”میں آپ سے یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہوں۔“

”کہتی جائیں، میں سن رہا ہوں۔ دکھ کہے نہ جائیں تو دل جوالہ مکھی بن جاتا ہے۔“

”سو سوری اویس صاحب۔“ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

”آپ نے مجھے شریکِ غم کیا ہے تو اب بیگانہ نہ گردانیں۔“ تقدیم نے بے ساختہ اپنے چہرے پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور اسے اپنی نم دیدگی سے دیکھنے لگی۔

”میں اگر آپ کی کوئی تکلیف بٹا سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔“ اویس انصاری کو اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئی۔

”اتنی بڑی تکلیف تو بٹائی ہے آپ نے۔“ تقدیم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”آپ جیسی جوان لڑکی کو اپنی فیملی کے لیے بے جگری سے لڑتے دیکھنا مجھے واقعی اچھا لگا۔ اگر میں آئندہ بھی آپ کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”ابھی تو آپ کی مدد کی ضرورت رہے گی اویس صاحب۔“

”مائی پلیور۔“ اس نے اٹھنے کا قصد کیا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

”اوہ آئی ایم سوری، میں نے آپ کو چائے بھی آفر نہیں کی۔“

”گھر سے ناشتا کر کے ہی نکلا تھا۔“

”اب تو دیر ہوگئی ہوگی ناشتا کیے۔“

”ادھار رکھیے پھر سہی۔ باس انگلینڈ سے کب واپس آرہی ہیں؟“

”نیکسٹ ویک۔“

”جسے دیکھیں انگلینڈ دوڑا چلا جاتا ہے کوئی آپ کی باس کی طرح فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے، کوئی پڑھنے، کوئی پیسہ کمانے، کوئی علاج کے بہانے، کوئی فیملی سیٹلمنٹ کے لیے تو کوئی سیاسی پناہ حاصل کرنے کو۔“

”کوئی مدثر کی طرح ذمے داریوں سے فرار حاصل کرنے کو۔“

”فکر نہ کریں۔“ وہ اس کے روبرو کھڑا اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ”اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

”کاش۔“

”یقیناً۔“ اویس انصاری نے مصافحے کی غرض سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

☆☆☆

تسنیم کے لیے مدثر کے جانے کی خبر ایک تازیانہ تھی۔ عجیب بات تھی مدثر سے رشتہ ٹوٹ جانے کے باوجود مدثر کی اس گھر سے وابستگی، اس کا خیال جیسے ایک ڈھارس بنا رہتا تھا اس کے لیے...... اس گھر میں وہ اسی کے حوالے سے تو دن گزار رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کیا جواز رہ جاتا تھا اس کے پاس اس گھر میں رہنے کو۔ شریعت یہی تو کہتی تھی طلاق دینے والا مرد مطلقہ کو اس کی عدت کے دوران اسی جگہ رکھے جہاں وہ خود رہتا ہو۔ جب مدثر نے اس گھر سے کیا بلکہ اس سرزمین سے ہی ہزاروں میل دور چلے جانے تھا تو اس کا اس گھر میں بیٹھے رہنے کا کیا علاقہ بنتا تھا۔ بے شمار فکریں اور بھی تھیں جو دل کو آ لگی تھیں۔ اب تک تو یہ ڈھارس تھی کہ مدثر کا اس سے رشتہ ختم ہوجانے کے باوجود اس کے بطن سے جنم لینے والے بچے سے اس کا تعلق اٹوٹ ثابت ہونا تھا مگر اس کے سمندر پار جانے کے بعد؟ کہاں ڈھونڈتی پھرے گی وہ اپنے بچے کے باپ کو۔ عقل آنے پر کبھی جو اس نے پوچھ لیا میرا باپ کون تھا؟ کہاں ہے؟ اس سے ملواؤ تو کیا کرے گی وہ۔ کیا جواب ہوگا اس کے پاس...... کیونکر اس پر اپنی بے گناہی ثابت کر سکے گی وہ اور پھر تن تنہا اس کی پرورش وہ بھی تو ایک کٹھن مرحلہ ہوگا۔ ایک لمبی آزمائش...... بچے کوئی پلک جھپکتے تو نہیں بڑے ہوجاتے برسوں میں جا کر اپنے ہاتھ پیروں کے ہوتے ہیں۔ اس کی پرورش، تعلیم و تربیت، اخراجات یہ سب معمولی مسائل نہ تھے۔ ان کا گمبھیر پن اسے ابھی سے سہار رہا تھا۔ اسے اپنا بوجھ اٹھانا مشکل تھا، ایک نئی زندگی کا بوجھ اپنے ناتواں شانوں پر کیونکر لاد پاتی۔ تقدیم نے اطمینان تو دلایا تھا کہ اس کے جانے کے بعد اس کی فیملی میں کوئی تسنیم کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ وہ جب تک چاہے اس گھر میں رہ سکتی تھی اور یہ کہ وہ باہر رہتے ہوئے بھی اپنے بچے کی کفالت اور اس کی ماں کو بچے کا حقِ رضاعت و پرورش ادا کرتا رہے گا مگر جب وہی منظر سے نکل گیا تو باقی منظر چہ معنی دارد! آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ تسنیم کا دل انتہائی بے چین اور مضطرب تھا۔ اپنی کوکھ میں نمو پاتی زندگی اسے نعمت کے بجائے زحمت اور اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ سارا فتنہ اسی کا تھا۔ ورنہ مدثر کے طلاق نامہ بھجوانے کے بعد تو قصہ ہی ختم ہوگیا تھا۔ وہ جس خاموشی سے اپنے گھر سے گئی تھی اسی خاموشی سے واپس بھی آگئی تھی۔ مونس نے گھر والوں کا اس سے مقاطعہ بھی ختم کروا دیا تھا۔ منقطع تعلیمی سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح دیر سویر بحال ہو ہی جاتا، زندگی پھر چل پڑتی مگر اس کے بطن میں ایک نئی زندگی کے انکشاف نے دھیرے دھیرے معمول پر آتی زندگی کو پھر تلپٹ کر ڈالا تھا۔ اسے دنیا دکھاوے کو مدثر کے گھر بھیجنا ضروری ٹھہرا۔ رہی سہی کسر تقدیم کی موشگافیوں نے پوری کر ڈالی۔ کیا ضرورت تھی عدت کے دوران اسے مدثر کے گھر ہی میں رکنے کی نکتہ دری کی۔ چند ماہ کے نفقے نے کون سا کوئی اس کا مقدر پلٹ دینا تھا۔ مقدر میں تو جو تھا وہ ہو چکا تھا۔ تقدیم کی نکتہ دانی نے اسے ایک کمرے میں قید کر کے رکھ دیا تھا۔ اپنا شملہ اونچا رکھنے کی خاطر اماں ابا بھی تقدیم کے ہمنوا بن گئے تھے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ایک غیر گھر میں اس پر کیا گزرے گی۔ ہاں، مدثر کے غیر محرم ٹھہرنے کے بعد یہ گھر غیر ہی تھا اس کے لیے۔ پہلے بھی اپنا کب تھا اپنا تو تب ہوتا جب وہ کسی رشتے ناتے کے حوالے سے یہاں آئی ہوتی۔ اس قیدِ قفس کو ابھی تو فقط دو ماہ ہی گزرے تھے۔ مدثر کے ملک سے باہر چلے جانے کے بعد تو اس احساس کو بھی دل سے گم ہوجانا تھا کہ جس گھر میں وہ اپنی قیدِ تنہائی کاٹ رہی تھی وہ اس کے ہونے والے بچے کے باپ کا گھر تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ تنہا اس بچے کی ذمے داری کیونکر اٹھا پائے گی۔ دل کا بوجھ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دو دن بعد اسے پھر چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ بڑے بیٹے کی پہلی اولاد تھی اور مدثر سمیت اس کے گھر والوں کی بے تعلقی

کا یہ عالم تھا کہ پچھلے وزٹ پر منعم کی بیوی نے اس کے کمرے میں آکر بڑے سرد سے لہجے میں کہا تھا۔

''ممی کہہ رہی ہیں ڈاکٹر کے ہاں جانا ہو تو ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ اور یہ پیسے دیے ہیں انہوں نے ڈاکٹر کی فیس اور اگر کوئی ٹیسٹ یا دوائیں وغیرہ وہ لکھ کر دیں تو اس کے لیے۔'' سفید لفافہ جس میں بعد میں اس نے دیکھا ہزار ہزار کے تین نوٹ رکھے تھے۔

اسے یقین تھا کہ پچھلے وزٹ کی طرح اس مرتبہ بھی اسے ڈاکٹر کے ہاں اکیلے ہی جانا ہوگا اس مرتبہ وہ خود بھی اکیلے ہی جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''دیکھو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے تم اگر کیس واپس لے لو تو میں سب کچھ بھول جانے کو تیار ہوں۔'' وہ اسکول میں تھی اور الطاف اس سے اسکول کے سرکاری فون پر بات کر رہا تھا۔ پہلے اس نے کئی مرتبہ اس کے سیل فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کال مسلسل ڈراپ کیے جانے پر وہ اسکول کے نمبر پر آگیا تھا۔ اسے مجبوراً کال ریسیو کرنا پڑی۔ نہ کرتی تو خدا جانے وہ اگلا کیا ہتھکنڈا آزماتا۔ اسکول کے نمبر پر آنے والی ہر کال وہ خود ہی تو ریسیو نہیں کرتی تھی۔ ہزار کاموں سے سیٹ سے اٹھ کر دفتر سے بلکہ کبھی کبھی اسکول سے بھی باہر آنا جانا پڑ جاتا تھا ایسے میں عموماً اس کے دفتر کے باہر تعینات چپڑاسی یا دفتری عملے میں سے کوئی شخص ورنہ اپنے دفتر میں موجودگی کی صورت میں وائس پرنسپل مسز حمید یا کبھی کبھار دفتر کے قرب و جوار میں موجود کوئی ٹیچر بھی کال ریسیو کر لیتی۔ خدا جانے وہ کس سے کیا کہہ سن دیتا خواہ مخواہ کی جگ ہنسائی سو اس نے اسکول کے نمبر پر آنے والی کال ریسیو کر لینے ہی میں عافیت جانی۔ خلافِ توقع اس نے انتہائی شرافت سے بات چیت شروع کی۔ سلام کیا، حال چال پوچھا امی اور بھائی بہن کی خیر و عافیت دریافت کی پھر مطلب پر آگیا۔

''بھول تو میں جانا چاہتی ہوں اس حادثے کو جو میرے ساتھ ہوا ہے۔''

''کیا...... کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

''یہ آپ خود اپنے آپ سے پوچھیں۔''

''یار چھوٹی سی بات کو تم نے کیوں اپنے دل پر لے لیا...... مسئلہ میری پہلی بیوی ہی کا ہے ناں، طلاق دے دوں گا اسے۔ دے دوں گا یار...... قسم سے دے دوں گا۔''

''کتنا آسان ہوتا ہے آپ مردوں کے لیے کسی عورت کو چھوڑنے کی بات کرنا۔ عورت سے پوچھیں کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے اس کے لیے ایک مرد سے وابستہ ہو جانے کے بعد اس تعلق کا ٹوٹ جانا حالانکہ اپنی مرضی سے خلع لے رہی ہوں میں لیکن سوہانِ روح بنا ہوا ہے یہ خیال کہ میرا نام کسی تعلق سے بندھ کر ٹوٹنے کے بعد بے وقر ہو جائے گا۔''

''تو کیوں تو ڑتی ہو یار...... بندھا رہنے دو۔ بندھا رہنے دو اپنے نام کو اس تعلق کے ساتھ۔''

''اور بسمہ؟'' مصلحت کوشی اسے نرم لہجے میں بات کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''اچھا۔'' وہ چونکا۔ ''تو تم اس کا نام بھی جانتی ہو۔ کس نے بتایا تمہیں اس کا نام؟''

''معلومات کے سو ذرائع ہوتے ہیں۔''

''بڑی ویل انفارمڈ ہو بھئی۔''

''آپ کے بچے کی ماں ہے اس کی قدر کریں۔ اس کا جائز مقام دیں اسے۔''

''اتنی ہمدردی کیوں ہے تمہیں اس سے؟''

''اس کی جگہ پر میں بھی تو ہو سکتی تھی۔''

''لیکن وہ اگر تمہاری جگہ ہوتی تو یہ بے وقوفی نہ کرتی جو تم کر رہی ہو، ٹھاٹ سے اپنا گھر بساتی اور عیش کرتی۔''

''وہ اس کا اپنا طرزِ فکر ہوتا، میں وہی کر رہی ہوں جو میں صحیح سمجھتی ہوں۔ عورت کو دوسری عورت کے حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے۔''

''یعنی تم اس نظریے کی نفی کرنا چاہتی ہو کہ عورت، عورت کی دشمن ہوتی ہے۔''

''یہی سمجھ لیں۔''

فون پر تالی بجنے کی آواز سنائی دی پھر وہ استہزائیہ ہنسی ہنس کر بولا۔ ''میں تمہارے جذبے کی داد دیتا ہوں۔ اچھا سنو اتنی ہی ہمدردی ہے اس سے تو ایک آپشن اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ وہ بھی رہے تم بھی آجاؤ۔ میں بھی تو دیکھوں کہ عورت، عورت کی کتنی دوست ہوتی ہے۔''

''میرا ٹوٹا ہوا بھرم کہاں سے...... کیونکر واپس آئے گا۔''

''یار وہ بھی واپس آجائے گا، تم ایک دفعہ میری زندگی میں تو آؤ بلکہ زندگی میں تو آہی چکی ہو...... یہ کہنا چاہیے کہ میرے گھر کو اپنے حسن کے جلوؤں سے روشن تو کرو بھرم کو تو ہم بھڑم بھڑم واپس لے آئیں گے۔''

''یہ بھڑم بھڑم کیا ہوتا ہے؟''

''میری اپنی ڈکشنری ہے، مطلب ہے فوراً شان سے۔'' وہ ہنس دیا تو حجاب نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

''نہیں الطاف صاحب، ٹوٹا بھرم کبھی بحال نہ ہو سکے گا۔ میرے سامنے دوسرا آپشن نہیں سوائے اس کے کہ...... آپ خوش رہیں اور میں دوبارہ اپنے پرانے راستے پر پلٹ جاؤں۔''

''تمہاری سمجھ میں محبت کی زبان نہیں آتی۔'' اس کا لہجہ یک لخت بدل گیا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

''میں منتیں کر رہا ہوں اور تم اکڑے چلی جا رہی ہو...... کیا سمجھتی ہو خود کو...... ہاں، بولو کیا سمجھتی ہو؟''

''کچھ بھی نہیں الطاف صاحب میں تو ایک سوختہ ساماں ہوں۔ آپ لڑے جھگڑے بغیر فارغ کر دیں گے تو ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔''

''اب میں آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں کیس واپس لیتی ہو یا......'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''نہیں۔'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''اوکے۔'' حجاب اس کے لہجے سے اس کے چہرے کے خطوط کا اندازہ کر سکتی تھی۔ ''لاش بھی نہیں پہچانی جائے گی تمہاری سمجھیں...... اور ایک دم نہیں ماروں گا۔ تڑپا تڑپا کر سسکا سسکا کر جسم کے ایک ایک حصے کو داغوں گا۔ تم معافی کے لیے ہاتھ جوڑو گی اور میں فرش پر پڑے تمہارے غلیظ وجود کو ٹھوکر ماروں گا۔ تم کہو گی میں تمہاری بیوی بنتی ہوں اور میں تمہارے منہ پر تھوکوں گا...... ایک دم نہیں ماروں گا۔ پارچہ پارچہ کر کے ماروں گا پھر کوڑے کے ڈھیر پر تمہاری برہنہ لاش پھنکوا دوں گا۔ تمہارے خاندان کی سات نسلیں بھی کسی کو منہ دکھانے

لائق نہیں رہیں گی۔"

وہ چپ ہوا تو حجاب نے تلخی سے کہا۔ "جب آپ کی نیت یہ ہو تو میں اپنا بھرم بحال ہو جانے کی امید کیسے کر سکتی ہوں۔"

"یہ اس وقت ہوگا جب تم نہیں مانو گی۔"

"آپ کی نیت میں فتور ہے الطاف صاحب، میں کسی قیمت پر نہیں مانوں گی۔" الطاف نے ایسی شرمناک بات کی کہ وہ پانی پانی ہو گئی اور اس کے فوراً بعد ٹیلی فونک رابطہ الطاف کی طرف سے منقطع ہو گیا۔

ریسیور کریڈل پر واپس رکھ کر وہ کچھ دیر بڑی محزون سی بیٹھی رہی۔ اسکول میں میقاتِ دوم کے امتحانات چل رہے تھے۔ ایک دو کے سوا تقریباً تمام ٹیچرز ہی نگرانی کے فریضے پر مامور تھے۔ اسکول میں معمول کی چہل پہل کے بجائے گہرا سناٹا تھا۔ اردگرد پھیلے اس سناٹے سے کہیں زیادہ گمبھیر سناٹا وہ اپنی روح میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔ خدا جانے ایسی کون سی غلطی ہوئی تھی زندگی میں جس کی پاداش میں اس کا نصیب اس شخص سے لڑ گیا تھا۔ مگر شاید کوئی نیکی بھی کام آ گئی تھی جو اس قدر بہیمانہ ذہنیت رکھنے والے اس شخص سے اسے دوری اختیار کرنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔

☆☆☆

طبیعت تو اس کی شام ہی سے بوجھل تھی مگر نصف شب کو زیادہ بگڑنا شروع ہوئی۔ اس نے برداشت کرنے کی کوشش کی مگر ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ تو اسے یوں لگا جیسے اجل سر پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اپنا پیٹ پکڑے وہ گرتی پڑتی کمرے سے باہر نکلی اور ایک دیوار کا سہارا لے کر نیچے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ ناقابلِ بیان اذیت تھی، اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ گھر کے مکین گھبرا کر اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے طرح تڑپ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" مدثر کی ممی پہلی بار اس سے ہم کلام ہوئیں۔

اسے جواب دینے کا یارا نہیں تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ مدثر کے باہر جانے کی خبر نے اسے ایسی یاسیت سے دوچار کیا تھا کہ اس نے ڈاکٹر کے ہاں اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے ایک لیڈی ہیلتھ ورکر سے باتوں ہی باتوں میں اسقاط کے لیے ڈاکٹری طریقِ کار کے ساتھ ایک دیسی نسخہ بھی دریافت کر لیا تھا۔ واپسی پر اس نے ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں خریدنے کے بہانے گاڑی ایک مارکیٹ میں رکوائی اور پنسار سے وہ دیسی نسخہ بھی خرید لائی جو لیڈی ہیلتھ ورکر کے بقول اسقاط کے لیے تیر بہ ہدف نسخہ تھا۔

اس نے دوا استعمال کی تھی اور یہ اسی کا اثر تھا جو اس وقت اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ غیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ناقابلِ بیان تکلیف تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ مرنے جا رہی تھی۔

ممی نے چار بچے پیدا کیے تھے اس کی کیفیت دیکھ کر اس کے بتائے بنا ہی سمجھ گئیں کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی مگر یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ گڑبڑ اس کی اپنی پیدا کردہ ہوگی۔ بیٹھے بٹھائے کی پریشانی اسے فوری طور پر اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ رات کے اس پہر اس کی اپنی ڈاکٹر تو کہاں دستیاب ہوگی ایمرجنسی میں کوئی اور سہی ...... اور کسی اونچ نیچ سے بچنے کے لیے اس کے گھر والوں کو بھی مطلع کرنا ضروری تھا۔

جاری ہے

قیامت سی قیامت

نادیہ جہانگیر

بجلی صبح سے بند تھی...... گرمی کا یہ عالم تھا کہ باہر نکلتے ہی سورج کی برستی آگ لپٹنے کو بے قرار ہوتی اور اندر رہ کر حبس، بھڑاس کا مقابلہ کرنا زندگی و موت ہی کا سوال لگ رہا تھا۔

نہ اندر بیٹھا جا سکتا تھا اور نہ ہی باہر نکلا جا سکتا تھا...... اور اس ساری صورتِ حال میں جو ذرا سا آرام دینے والی چیز تھی یعنی بجلی وہ بالکل ہی ناپید تھی اور خوش قسمتی سے آ بھی جاتی تو پھر آئی اور یہ گئی والی



مثال بن جاتی۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا کہ بجلی صرف آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے ہی آتی ہے ورنہ اس کا یہاں کوئی اور کام نہیں۔ آئے روز ٹی وی و اخبار میں لوڈشیڈنگ کے خلاف احتجاجی مظاہرے دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے رہتے۔ توڑ پھوڑ، بدامنی اور نہ جانے کیا کچھ...... مگر مجال ہے لوڈشیڈنگ کا خاتمہ ہوا ہو۔

اب بھی پچھلے چار گھنٹوں سے بجلی غائب تھی۔ آج کل یوں بھی اس کی طبیعت صحیح نہیں تھی وہ پورے دنوں سے تھی سو گرمی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ مریم کچھ دیر ہاتھ کا پنکھا جھلتی رہی پھر باتھ روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد تازہ دم ہو کر باہر آئی تو موسم ذرا ذرا سا ٹھنڈا محسوس ہوا کہ نہا کر جو نکلی تھی۔ بال جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر وہ تیزی سے کچن میں گھس گئی اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ معین کل گوشت لے آیا تھا۔ اس نے پیاز، مرچ، ٹماٹر نکالے اور کاٹنے بیٹھ گئی۔

''دھڑ دھڑ دھڑ......'' وہ آخری سبز مرچ کاٹ رہی تھی جب باہر سے خوفناک سی دھڑ دھڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ چھری اس کے ہاتھ سے وہیں چھوٹ گئی وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن کی کھلی کھڑکی کی طرف بڑھی مگر پھر دروازے کا خیال آیا۔

''یہاں یہ رکھو، یہاں یہ۔'' یقیناً یہ آواز معین کی تھی۔

''یہ کیا لے آئے؟'' وہ حیران حیران سی دروازے پر آئی۔

''ہنچو تو نہیں یار...... کل تک ٹوٹ جائیں گے۔'' معین نے کسی کو ڈانٹا تھا۔

''سوری اُستاد۔'' کسی کی نحیف سی آواز ابھری...... وہ آواز کے تعاقب میں دیکھنے لگی۔ سامنے صحن میں تین چار محلے کے لڑکے کھڑے نظر آئے۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ یہ لڑکے یہاں کیوں آئے ہیں۔

تبھی ایک بار پھر کوئی بھاری گٹھا شاید لکڑیوں کا گٹھا گرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ حیرت سے دائیں بائیں دیکھنے لگی کہ یہ آواز آئی کہاں سے مگر لڑکوں کے جمگھٹے میں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔

''یا اللہ خیر...... یہ سب کیا ہو رہا ہے......'' بے حد پریشانی سے اس نے سوچا اور تیزی سے دائیں بائیں نظریں ڈالنے لگی کہ معین کو دیکھے، وہ کہاں ہے اور یہ معاملہ کیا ہے مگر سامنے لڑکوں کا ہجوم تھا اسے معین کہیں دکھائی نہ دیا۔ اسے پھر سے کھڑکی کا خیال آیا تو وہ دوڑ کر کھڑکی میں جا پہنچی مگر وہاں تو چار پانچ لڑکے اور کھڑے تھے۔ جن کی پشت کھڑکی کی طرف تھی...... وہ گھبرا سی گئی۔

''یہ ہو کیا رہا ہے؟'' اس کا جی چاہا معین کو آواز دے کر بلا لے مگر پھر خوف ہوا کہ اتنے مردوں کی موجودگی میں اس کا آواز دینا معین کو ناگوار نہ گزرے جبھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کھڑکی چھوڑ دی۔ کھڑے کھڑے اس کی کمر تختہ ہونے لگی تھی۔ اب اس سے نہ بیٹھا جاتا نہ کھڑا ہوا جاتا...... پل ہی پل میں خواہ مخواہ سانس پھول جاتی۔ اب بھی کھڑے کھڑے کمر میں درد ہونے لگا تو وہ وہیں کچن میں پڑی کرسی پر آہستہ سے ٹک گئی۔ باہر تھوڑی دیر مردوں کی آوازیں ابھرتی رہیں پھر آہستہ آہستہ کر کے کم سے کم ہوتی چلی گئیں اور پھر سب ہی آوازیں بالکل ختم ہو گئیں...... یقیناً سب لوگ چلے گئے تھے۔

''مریم! مریم، کہاں ہو بھئی، تھوڑا سا پانی تو دو۔'' اچانک باہر سے معین کی آواز آئی تھی۔ وہ تیزی سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس لے کر باہر صحن میں آ گئی...... معین ابھی تک اپنے مخصوص مکینک یونیفارم میں ہی تھا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام...... کیسی ہو؟'' اسے دیکھ کر وہ دل سے مسکرایا تھا۔

''آپ کو کیسی لگ رہی ہوں؟'' پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے اس نے ملائمت بھری شرارت سے پوچھا تو وہ بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کافی موٹی ہو گئی ہو...... پھولا ہوا جسم، چہرے پر اتنی تازگی نہیں...... اور......اور......'' مریم کا منہ بن گیا...... تو وہ قریب آ گیا۔

''اور یہ کہ تم ہر حال میں بہت پیاری، بہت خوب صورت اور اپنے معین کو دل کے قریب لگتی ہو۔'' اس نے کہنے کے ساتھ اسے ذرا سا کھینچ کر اپنے ساتھ لگایا تو وہ مسکرا دی۔

''دن کیسا گزرا؟'' معین کے بالوں کو ذرا سا چھیڑ کر اس نے پوچھا تھا۔

''تمہاری یادوں، تمہارے خیالوں میں......''

''ذرا چھوڑا کم کریں۔'' اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''یار اتنی گرمی اور حبس میں ایک تمہارا ہی تو خیال روح کو تازگی بخشتا ہے۔''

''اوہو......'' اس نے سر ہلایا تبھی اس کی نظر معین کے پیچھے جا پڑی، جہاں پہ سفید سفید مضبوط ڈنڈوں کے تین گٹھے پڑے تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کیا......؟''

''یہ...... یہ ڈنڈے اتنے سارے... کس لیے آخر؟'' ڈنڈے تھے ہی اتنی تعداد میں کہ وہ دیکھ کے حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

''یہ ڈنڈے......؟'' معین نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ''بجلی ہے؟''

''نہیں تو...... کیوں؟'' مریم اس کے سوال پر حیران ہوئی کیونکہ ابھی تو اس نے اپنے سوال کا جواب لینا چاہا تھا۔

''یہ ڈنڈے بجلی ہی کے حق میں چلنے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' وہ واقعی سمجھ نہیں پائی تھی۔

''صبح ہم لوڈشیڈنگ کے خلاف احتجاج کرنے والے ہیں۔''

''مگر یہ ڈنڈے؟''

''یہی تو احتجاج کے سر کا تاج ہو گا۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ اب بھی الجھی ہوئی تھی۔

''ارے سمپل یار...... اس ملک کے حکمران چاہے کسی دور کے ہوں ہم کمزور لوگوں کی آواز سنتے نہیں جب تک ہم بھڑکیں نہ، آواز نہ اٹھائیں، ڈنڈے نہ چلائیں، یہ بڑے لوگ سننے والے نہیں...... جبھی تو ہم نے اب ڈنڈے اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''یہ کون سا طریقہ ہے معین احتجاج کا؟'' اس نے ناراضی سے معین کو دیکھا تو وہ ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''ہم ناتواں، کمزور لوگوں کے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا احتجاج کا...... ڈنڈا چلے تو کام بنے۔''

''نہیں معین، توڑ پھوڑ کرنا، ملک میں بدامنی پھیلانا قطعی احتجاج کے زمرے میں نہیں آتا۔''

''توڑ پھوڑ ہو گی...... ملک میں بدامنی، بے چینی اور بے سکونی ہو گی تو بڑے ایوانوں میں بیٹھے لوگوں کو ہمارا احساس ہو گا ناں۔ جبھی وہ کچھ کریں گے ناں۔''

''جو بھی ہو معین یہ بہت غیر اخلاقی طریقہ ہے ایک مہذب ملک کے مہذب شہریوں کو ایسے احتجاج سے بچنا چاہیے...... انہیں کسی طور پر بھی اپنے ملک کا امن برباد نہیں کرنا چاہیے۔''

''چھوڑو یار اس مہذب ملک کی ڈور جن مہذب لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کے لیے یہی طریقہ سب سے بہتر اور موثر ہے۔'' معین کی اپنی منطق تھی۔ مریم دیر تک بحث کر سکتی تھی مگر وہ جانتی تھی معین کے دماغ میں اب جو آ گیا ہے وہ کر کے رہے گا۔ ناچار اسے خاموشی کا دامن پکڑنا پڑا اور ویسے بھی

اس کے ایسے دن چل رہے تھے، وہ لمبی بحث کر ہی نہیں سکتی تھی۔

"اچھا چھوڑیں، آپ کپڑے بدل لیں، میں آپ کے لیے کچھ ٹھنڈا بناتی ہوں۔" بحث سمیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"برف ہے؟"

"نہیں، برف تو نہیں...... مگر ٹھنڈا پانی ہے، شربت بن جائے گا۔"

"پھر جلدی سے بناؤ۔" وہ بھی اٹھ گیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے کچن کی طرف جانے لگی تو ایک بار پھر اس کی نظر ڈنڈوں کے بندھے گٹھے پر جا پڑی۔ ایک ناگواری کی لہر اس کے اندر تک اتر گئی۔

"پُرامن احتجاج بھی تو کیا جاسکتا ہے۔ ضروری ہے قانون کو ہاتھ میں لینا۔" شربت بناتے ہوئے وہ تاسف سے سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن معین اپنی ورکشاپ پہ نہیں گیا۔ صبح صبح نہا کر عام کپڑوں میں باہر چلا گیا، واپسی پر چند جوان لڑکے اس کے ساتھ تھے۔

"یہ ڈنڈے اٹھا کر باہر سڑک پر لے چلو، وہیں سے سب پکڑ لیں گے۔" معین نے ہدایات جاری کیں تو لڑکوں نے پل ہی پل میں گٹھے اٹھا کر کندھوں پر رکھ لیے۔

"اور حامد، بینرز وغیرہ سب تیار ہیں ناں؟" معین نے ہاتھ میں پکڑے کپڑے کے ٹکڑے سے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔

"جی استاد...... سب تیار ہیں۔" حامد تو اپنے دامن ہی سے چہرہ رگڑ رہا تھا۔

"استاد ٹائر کتنے جلانے ہیں؟"

"صرف ٹائر نہیں جو ملا وہ جلا ڈالیں گے، تم آؤ باہر...... شہر کی صورت حال دیکھتے ہیں۔" سب پُرجوش ہوتے تن فن کرتے باہر نکل گئے، وہ جو دروازے میں کھڑی ان سب کو جاتا دیکھ رہی تھی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"یا اللہ خیر، اس پاک وطن کے لوگوں کو شعور عطا فرما...... یا اللہ انہیں آگہی دے...... انہیں عقل استعمال کرنے کے طریقے سکھا۔" سارا دن وہ گھر میں اکیلی بیٹھی کلستی رہی، دعائیں کرتی رہی...... اور بند پنکھے کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی رہی کہ لائٹ پچھلے دو ہفتوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ دس منٹ آتی دو گھنٹے غائب ہو جاتی۔ پھر آتی اور صرف جھلک ہی دکھاتی۔ عالم یہ تھا کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں بہ مشکل ایک سو بیس منٹ کے لیے بجلی جیسی نعمت دیکھنے کو ملتی۔

عصر کے بعد اس کی پریشانی قدرے بڑھ گئی کہ ابھی تک معین واپس نہیں لوٹا تھا۔ وہ کمرے سے صحن اور صحن سے دروازے تک جلے پیر کی بلی کے مانند چکراتی ہوئی پھرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے پیر دُکھنے لگے۔

"یا اللہ خیر...... پولیس نے نہ پکڑ لیا ہو......"

حبس زدہ کمرے میں بھی کہاں بیٹھا جاتا تھا۔ پولیس کا خیال آتے ہی وہ اندر تک کانپ گئی۔ اکثر ایسا ہی تو ہوتا تھا۔ جلوس نکالتے ہوئے کئی لوگ پکڑے جاتے، انہیں مار الگ پڑتی اور ضمانت کی رقم الگ سے دینی پڑتی...... اوپر سے گرمی اتنی تھی کہ کوئی بھی ذی روح حوالات میں ایک دن تو کیا ایک منٹ بھی نہ گزار پائے۔ بجلی نہ پنکھے گرم تپتی سلگتی سلاخیں......

"نہیں، اللہ خیر رکھے، معین ابھی آجائیں گے۔" تھانے کا سوچ کر اس کی روح تک کانپ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر آگئی۔ باہر ہوا بالکل بند تھی۔ وہ پل ہی پل میں پسینے سے شرابور ہوگئی۔ مٹکے سے تازہ پانی نکال کر پیا تو روح کو ذرا سا آرام آیا...... تبھی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ تقریباً دوڑ کر دروازے تک پہنچی۔ سامنے پسینے میں شرابور معین ہاتھ میں ٹوٹا ہوا ڈنڈا پکڑے کھڑا تھا۔

"آپ...... آپ آگئے؟" اسے یقین نہیں آیا تو آگے بڑھ کر اس نے معین کا چہرہ چھو لیا تو وہ مسکرا دیا۔

"کیوں، تمہیں میرے آنے میں شک ہے کوئی؟" جواباً وہ شرارت سے پوچھنے لگا تو وہ فکرمندی سے اسے دیکھنے لگی۔

"سب خیریت تو ہے ناں...... سب ٹھیک ہوا ناں؟"

"یار تم اندر تو آنے دو پھر سب پوچھ لینا۔" معین کے نرمی سے کہنے پر وہ نادم ہوگئی۔

"اوہ...... سوری، میں اپنی پریشانی میں سب بھول گئی۔" اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ معین اندر آگیا۔

"کیوں! تم پریشان کیوں ہو رہی تھیں؟"

"آپ احتجاج کرنے گئے تھے اور وہ بھی ڈنڈوں کے ساتھ پھر میں کیسے نہ پریشان ہوتی۔" اس کے اتنی فکر کرنے پر معین مسکرا دیا۔ اس نے ذرا سا مڑ کر مریم کا ہاتھ پکڑ لیا، مریم رکی تو اس نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر دونوں ہاتھ دعا کی صورت میں اوپر اٹھا دیے۔

"جب تک یہ ہاتھ سلامت ہیں، تب تک تمہارے معین کو گرم ہوا تک نہیں چھو سکتی۔" اس کے اتنی محبت اور مان سے کہنے پر مریم کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔

"پھر بھی معین، آپ جو کام کرنے گئے تھے رسک سے خالی تو نہ تھا۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر کیا کریں یار، اب اتنی گرمی میں باہر سے کوئی آئے تو گھر میں پنکھا تک نہ چل رہا ہو، ٹھنڈا پانی نہ مل سکے تو بندے کا پارا تو ہائی ہوتا ہی ہے ناں۔"

"مگر اس پارے کو کنٹرول بھی تو کیا جاسکتا ہے۔" اس نے سمجھداری سے کہا تو وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔

"اف...... اگر تم عورتیں باہر جلوس لے کر جاؤ تو میرا نہیں خیال کہ ایک گاڑی کو ڈنڈا تک مار سکو۔"

"کیوں، آپ نے گاڑیوں کو بھی ڈنڈے مارے؟"

"تو اور کیا...... مارنے پڑتے ہیں، جتنا غصہ، جتنی بھڑاس اندر ہوتی ہے سب نکالنی پڑتی ہے...... بلکہ ایسا خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایک بار جب ڈنڈا اٹھاؤ تو کچھ ہوش نہیں رہتا......" وہ اب بھی جذباتی سا ہو گیا تھا۔ وہ تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کو پتا ہے معین کہ اس میں نقصان کس کا ہوتا ہے؟"

"اگر یہ پتا کرتے پھریں تو پھر احتجاج کا فائدہ کیا......"

"بہت بری بات ہے معین، آپ کو احساس بھی ہے کہ اس میں حکومت کا کچھ نہیں جاتا، جاتا ہے تو صرف بے چاری غریب عوام کا...... جو خود روٹی روزی کے لیے نکلی ہوتی ہے...... جنہیں خود مزدوری کی تلاش ہوتی ہے...... وہ بچے جو تعلیم حاصل کرنے گھر سے نکلتے ہیں، ان سب کا نقصان ہے۔"

"ارے چھوڑو یار، تم بھی ناں...... خواہ مخواہ دوسروں کا درد سینے میں لیے پھرتی ہو......"

"یہ درد ہونا چاہیے معین۔" اس کا لہجہ ذرا ترشی لیے ہوئے تھا۔

"دوسروں کا نقصان کر کے آپ لوگوں کو جو تسکین ملتی ہے اگر آپ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہو تو......؟" اس نے سختی سے پوچھا تو معین اسے ناراضی سے دیکھنے لگا۔

"پلیز مریم! میں باہر سے پہلے ہی تپا ہوا آیا ہوں، میرا دماغ اور نہ خراب کرو۔" اس نے ذرا ناگواری سے کہا تو مریم نے سر جھٹک دیا۔

"اس وقت سے ڈریں معین! جب خدانخواستہ آپ بھی ایسے کسی غیر مہذب احتجاج کے ہتھے چڑھ جائیں اور تب آپ کے پاس سوائے دکھ، تکلیف اور پچھتاوے کے کچھ نہ ہو، اچھا آپ بیٹھیں میں پانی لاتی

ہوں۔'' وہ یہ سب کہہ کر چلی گئی تو ایک پل کے لیے معین کا دل کانپ سا گیا مگر تبھی اس کی جیب میں پڑا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر اس کے جگری دوست روحیل کا نمبر چمک رہا تھا، اس نے فوراً کال اٹھالی۔

''ارے کیا بتاؤں روحیل، اتنا بڑا احتجاج تو اس شہر میں آج تک نہیں ہوسکا۔ میں لیڈر تھا، سب سے آگے تھا، میں نے اپنی توجہ زیادہ نعروں اور بھڑکوں پہ نہیں بلکہ توڑ پھوڑ پر رکھی، جو بھی گاڑی آئی بچ نہیں پائی۔ اگلے پچھلے سارے شیشے توڑ ڈالے ہم نے...... بڑے لوگ گاڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلے...... جو بھی دکان کھلی دیکھی بخیے تک ادھیڑ دیے ہم نے۔ اپنا دیکھا نہ غیر، کھلی دکانوں کی مٹی پلید کردی۔'' وہ ہنس ہنس کر اپنے دوست کو بتا رہا تھا اور کچن سے پانی لاتی مریم کا افسوس سے ہلتا سر ہلتا ہی جا رہا تھا۔

☆☆☆

بجلی اس رات بھی سارا وقت غائب رہی...... اندر باہر حبس ہی حبس تھا۔ ایک پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ چاروں طرف گھٹن ہی گھٹن...... ہوئی جا رہی تھی۔ اسے گرمی دگنی محسوس ہو رہی تھی، ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو اٹھ بیٹھی...... ساتھ لیٹے معین نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو پریشان ہوگیا۔

''مریم سب خیریت تو ہے؟''

''معین مجھے بہت گرمی لگ رہی ہے...... لائٹ کیوں نہیں آرہی......؟'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تو معین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''کچھ نہیں ہوتا مریم، میں ابھی تمہیں پنکھا جھل دیتا ہوں۔'' وہ تیزی سے اٹھ کر ٹیبل پر سے ہاتھ والا پنکھا اٹھا لایا۔ وہ اپنا پسینہ صاف کرنے لگی۔

''معین لائٹ کب آئے گی؟'' وہ لیٹے لیٹے ہی بولی۔

''یہ بجلی والے......'' معین نے ایک موٹی سی گالی بجلی والوں کو دی۔

''اسی حال سے تو تپ کر عوام سڑکوں پر آئی ہے، احتجاج کرتی ہے اور تم کہتی ہو احتجاج نہیں کرنا چاہیے......'' تیزی سے پنکھا جھلتے ہوئے اس نے ترشی سے کہا تو وہ بے چارگی سے معین کو دیکھنے لگی۔

''مجھے گرمی لگ رہی ہے معین۔''

''اگر بجلی ہوتی تو اس گرمی میں ذرا سا تو فرق آجاتا ناں۔ پنکھا چلتا، ہوا لگتی...... کچھ تو ٹھنڈک محسوس ہوتی۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔''

''تو پھر ہمارے احتجاج کو تم بُرا کیوں کہتی ہو؟'' وہ تیزی سے بولا۔

''میں احتجاج کو نہیں، آپ کے احتجاج کے طریقۂ کار کو غلط کہتی ہوں معین۔ آپ لوگ جس طریقے سے احتجاج کرتے ہیں وہ بُرا ہے بلکہ بہت ہی برا...... بجائے آپ حکومت کا نقصان کرنے کے اپنے ہی جیسے غریبوں کی روٹی/روزی چھین لیتے ہیں۔ ان کی دکانیں، ان کے رکشے اور ان کی ٹیکسیاں توڑ پھوڑ کر آپ حکومت کا نہیں ان بے چارے غریبوں کا نقصان کرتے ہیں...... یہ جانے بغیر کہ ان بے چاروں نے نہ جانے کیسے کیسے پیسے جوڑ جوڑ کر یہ چھوٹی موٹی دکان کھولی ہوگی، رکشا لیا ہوگا...... اور یہ ٹیکسی اس غریب ڈرائیور کی ہے بھی یا نہیں...... ہوسکتا ہے وہ بے چارہ کرائے پر ہی چلا رہا ہو۔''

''تمہارا کہا بجا مریم...... مگر ہم لوگ جب تک ایسا نہ کریں، توڑ پھوڑ کر کے بدامنی نہ پھیلائیں تب تک ہمارے بڑے ہمیں ہمارا حق نہیں دیتے...... ہم پر توجہ نہیں دیتے، ہمیں انسان نہیں سمجھتے......'' وہ ایک بار پھر بھڑک گیا تھا اور مریم کے لیے اب یہی بہتر تھا کہ وہیں چپ ہو جاتی...... جبھی اس نے دوبارہ کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ اور بات معین کی باتیں اس کے لیے

بہت تکلیف دہ تھیں۔ معین جذباتی تھا، ایک ہی رخ سے دیکھتا تھا، گہرائی میں جانے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا اور ایسے میں مریم کے پاس چپ ہونے کے سوا اور کوئی چارا نہ تھا۔

☆☆☆

وہ جانتی تھی کہ اس کے آخری دن چل رہے ہیں جبھی وہ بہت محتاط ہو کر کام کرتی تھی، ہر روز معین دکان پر جانے سے پہلے اس سے اچھی خاصی تسلی کرتا کہ کہیں کوئی اسے درد تو نہیں کوئی مسئلہ تو نہیں اور جواباً وہ اسے خاصی تسلی دیتی تو وہ مطمئن ہو کر دکان پر جاتا مگر اس دن اس کے گھر سے نکلتے ہی مریم کی حالت خراب ہونے لگی، کمر سے پیٹ اور پیٹ سے کمر تک عجیب عجیب سا درد اٹھتا، کچھ لمحوں کے بعد معدوم ہو جاتا اور پھر سے ویسا ہی حال ہو جاتا...... صبح کا سارا کام کرنے کو پڑا تھا مگر درد پیچھا چھوڑتا تو وہ کچھ کرتی۔ وہ اس درد کو اس لیے زیادہ اہم نہیں سمجھ رہی تھی کہ اس کی ڈاکٹر نے اس کی ڈلیوری کی ڈیٹ چار دن بعد کی بتائی تھی۔ جبھی تو وہ سر پہ اتنی ٹینشن نہیں لے رہی تھی، جیسے تیسے گھر کا کام ختم کیا اور درد سے نڈھال ہوئی تو بستر پر آگئی مگر بستر پر پڑتے ہی درد نے زور پکڑ لیا تو وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے بہ مشکل باہر صحن تک آئی۔ اتفاق سے پڑوس والی خالہ بھی دو دن کے لیے کہیں گئی ہوئی تھیں۔ اپنے اس کے کوئی رشتے دار اس شہر میں رہتے نہیں تھے، لے دے کے ایک شوہر تھا جو اس وقت کام پر گیا ہوا تھا۔ بہر حال وہ دروازے پر کھڑی دیکھتی رہی کہ کوئی جاننے والا گزرتا ہوا دکھائی دے تو معین کی شاپ تک بھیج دے۔ اللہ اللہ کر کے ایک بچہ ملا تو اسے معین کی دکان پر دوڑا دیا۔ معین پندرہ منٹ بعد بھاگتا ہوا آیا تو اس کی حالت دیکھ کر واپس ٹیکسی لینے بھاگا۔ اور جلد ہی ایک محلے دار سلیمان کی ٹیکسی مل گئی۔ معین کے آنے پر اس نے پہلے سے تیار کیا ہوا بیگ اٹھایا اور باہر آگئی۔ معین نے اسے پکڑ کر گاڑی میں بٹھاتے ہی

بارش کی جھنکار

ہے اشارہ یہ ہم سے موسم کا
آج برسے گا ٹوٹ کر بادل
رقص ہوگا زمیں پہ پانی کا
آج بوندیں نچائیں گی پائل

مرسلہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

ڈرائیور کو گاڑی بھگانے کا اشارہ کیا، گاڑی چند ہی لمحوں میں ہوا سے باتیں کرنے لگی مگر مریم کی حالت لمحہ بہ لمحہ غیر ہونے لگی، پسینہ سارے وجود سے چھوٹ پڑا، ایسا درد ابھرتا کہ دباتے دباتے بھی اس کی چیخیں نکل پڑتیں۔

''معین جلدی کریں۔'' درد سہہ سہہ کر وہ رو پڑی تو معین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے ڈرائیور کو اور اسپیڈ بڑھانے کا کہا اور مریم کو ساتھ لگا لیا مگر مریم کو کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

''میں مر جاؤں گی معین...... پلیز مجھے بچالیں۔'' مریم کی سانس پھول رہی تھی۔

''حوصلہ، حوصلہ رکھو مریم، ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں، تم آیت الکرسی پڑھتی رہو۔''

''مجھ سے نہیں حوصلہ ہو رہا، دعائیں پڑھتے پڑھتے میرا حلق خشک ہوگیا ہے۔'' روتے روتے وہ بلکنے لگی تھی۔

''مریم دیکھو، میں تمہارے پاس ہوں، تمہارا معین...... تمہارے پاس ہے...... ذرا سا حوصلہ کرو، اسپتال صرف چار منٹ کے فاصلے پر ہے۔'' مریم روتے روتے مسلسل نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔ معین نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے تبھی گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

''استاد سامنے تو بہت رش ہے۔''

''تم اس رش سے گاڑی نکالو۔''

''کیسے نکالوں استاد؟ ساری سڑک بلاک کی ہوئی ہے...... دیکھیں کتنے ٹائر جل رہے ہیں سامنے۔'' ڈرائیور بے بس نظر آرہا تھا۔

دستک درِ دل پہ

انجم انصار

''معین ......'' درد کے مارے مریم کی چیخوں پر چیخیں نکلنے لگیں۔

''حوصلہ، حوصلہ......''

''استاد لگتا ہے لوڈ شیڈنگ کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔'' ڈرائیور نے یقیناً لڑکوں کے ہاتھوں میں بینرز دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔

''ارے چھوڑو تم احتجاج کو...... تم یہاں گلیوں سے گاڑی نکالنے کی کوشش کرو۔''

''معین میں مر جاؤں گی۔'' مریم کی دبی دبی چیخیں اس کو ہلکان کیے دے رہی تھیں۔

''استاد مشکل ہے بہت۔''

''تم کوشش تو کرو۔'' معین چلایا تو ڈرائیور نے گاڑی ذرا سی آگے بڑھائی۔ مریم نے درد سہنے کی کوشش میں معین کے ہاتھوں کو مروڑ ڈالا۔

''کچھ نہیں ہوتا، بس بس...... حوصلہ میری جان...... حوصلہ......'' معین اس کے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اسے مسلسل سمجھا رہا تھا مگر مریم سے درد سہنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل نفی میں سر ہلائے جا رہی تھی۔

''استاد یہ لوگ گاڑی توڑ دیں گے......'' غریب ڈرائیور اپنی جگہ ڈر رہا تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں تم گاڑی آگے نکالو، جو نقصان ہوا میں بھروں گا۔'' جواباً وہ غصے سے بھڑکا تھا۔

''پھر آپ کی ذمے داری پہ آگے لے کر جاؤں گا۔'' ڈائیور غریب تھا جبھی اس قدر پریشان ہو رہا تھا۔

''میں کہہ رہا ہوں تم گاڑی آگے کرو۔''

''معین...... معین میں...... میں نہیں بچوں گی۔ ان لوگوں سے منت کرو ہمیں یہاں سے نکلنے دیں۔'' مریم کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ معین سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈارئیور آہستہ آہستہ کر کے گاڑی آگے لے گیا۔ مگر اسے کوئی راستہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ معین نے فوراً کھڑکی کا شیشہ اتار کر اپنا سر باہر نکالا۔

''ڈلیوری کیس ہے بھائی، راستہ دے دو۔ پلیز آگے سے ہٹ جائیں......'' مظاہرین کچھ نہیں سن رہے تھے۔ ''ایک طرف ہو جاؤ ڈلیوری کیس ہے۔ خدا کا واسطہ آگے سے ہٹو، میری بیوی مر رہی ہے۔'' وہ سر باہر نکالے مسلسل چیخے جا رہا تھا مگر نعرے اور واویلوں میں اس کی آواز کہاں سنائی دیتی تھی۔ کوئی بھی آگے سے نہیں ہٹ رہا تھا۔

''معین......'' مریم کی ایک بلند چیخ نکلی تھی۔

''تمہیں اللہ کا واسطہ ہے آگے سے ہٹ جاؤ...... میری بیوی مر جائے گی......'' چلاتے چلاتے وہ رو دینے کو تھا تبھی اس کے ہاتھ سے مریم کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا، مریم کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''مریم...... مریم!'' اس نے سرگوشی کی، مریم کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ ''مریم......!'' وہ بے یقین ہوا۔

''مریم......!'' وہ چلا رہا تھا۔ تبھی مشتعل افراد کا ایک گروپ ان کی گاڑی پر ٹوٹ پڑا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کو کباڑ خانے کے لیے ایک چیز بنا دیا...... ڈرائیور بہ مشکل اپنا بچاؤ کرتا رہا جبکہ وہ اپنے ہاتھوں میں مریم کے سرد ہاتھ لیے بیٹھا بے یقینی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گروپ کسی اور گاڑی پر ٹوٹ پڑا تو ڈرائیور اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کی طرف آیا۔

''سلیمان بھائی...... سلیمان بھائی...... میری مریم...... میری مریم مجھ کو چھوڑ گئی...... ہائے میرا بچہ بھی......'' وہ رو پڑا تھا۔ ڈرائیور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''استاد میری گاڑی آٹھ لاکھ کی تھی...... آپ کہاں سے لائیں گے اتنی رقم؟'' ڈرائیور کو اپنا غم سب سے بڑا لگ رہا تھا۔ معین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

بارش ایسے برس رہی تھی جیسے آج نہ برسی تو شاید کبھی نہ ہوگی اور مونا پورے گھر میں بولائی بولائی سی پھر رہی تھی۔ کبھی وہ عقبی لان میں بندھے چھ تنومند بکروں کو دیکھنے بھاگتی۔ جنہیں مالی نے ایک چھپر تلے باندھ دیا تھا تو کبھی بیرونی ٹیرس کی جانب کہ عامر اسے آتا دکھائی دے جائے۔ ان کا گھر چونکہ مین روڈ کی پہلی گلی میں ہی تھا اس لیے اسے چلتا ہوا ٹریفک بھی نظر آ جاتا تھا۔ بادل زور سے گرجے.... تو وہ یکبارگی



کانپ سی گئی۔

"پتا نہیں...... اتنی تیز بارش میں یہ عامر کہاں چلے گئے۔" سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا عامر کا موبائل نظر آیا تو وہ مزید جھنجلا سی گئی۔

"اُف...... کیا کروں میں، حد ہوتی ہے بے پروائی کی بھی۔ اپنا موبائل بھی گھر پر چھوڑ گئے ہیں اب میں رابطہ کروں تو کیسے کروں؟" بادل مزید زور سے گرجے اور بجلی کی چمک آسمان پر یوں پھیل گئی جیسے کوئی ہیڈ لائٹس سے کسی کو بے نقاب کر رہا ہو اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"اللہ خیر کرے۔"

عین اسی لمحے گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور اس کے بعد گاڑی رکنے کی مخصوص آواز...... تو اس نے طمانیت کی سانس لی۔ "وہ آگئے۔" اس کے دل نے گواہی دی اور چند لمحوں بعد ہی عامر بالوں سے پانی جھاڑتا ہوا اندر اسے آوازیں دیتا ہوا داخل ہو رہا تھا اور وہ کمرے سے نکل کر خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

"اتنی تیز بارش میں کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"تمہارے لیے پھول لینے۔" وہ مسکرایا۔

"مت جھوٹ بولیں، اس خراب موسم میں کس پھول والے کی دکان کھلی ہوگی۔"

"سنو، سگنل پر...... پھول بیچنے والے آدھی رات تک موجود رہتے ہیں، وہ شاپرز میں سے کنگن اور گجرے نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔

"اللہ کتنے خوب صورت ہیں یہ کنگن اور گجرے بھی......" وہ سرشار لہجے میں بولی۔

"بس جلدی سے پہن کر مجھے دکھاؤ۔" عامر کا لہجہ مخمور تھا۔ مونا نے سرعت سے کنگن کلائیوں میں ڈالے اور اپنے لمبے بالوں کی چوٹی پر گجرا لپیٹ کر اس کے عین مقابل آ کر بولی۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں؟"

"بہت خوب صورت۔" وہ اسے پُر محبت نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا پھر کچھ سوچ کر مسکرایا...... اور زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"جانو...... بس ایک منٹ رکو۔"

"کیا......؟" وہ حیرت سے عامر کو تیزی سے اندر کی طرف جاتا دیکھ کر بولی۔

وہ جس تیزی سے اندر گیا تھا اسی تیزی سے واپس آیا مگر جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کیک تھا اور اس پر ایک کینڈل روشن تھی۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے، آج نہ تمہاری سالگرہ ہے اور نہ ہی میری اور ہماری شادی کی سالگرہ تو پورے دو ماہ بعد ہوگی۔" مونا نے حیرت سے کہا۔

"اب اگر تمہیں بھولنے کی عادت ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" عامر نے اپنے اور مونا کے درمیان کیک رکھ کر مسکرا کر کہا۔

"سچ عامر، مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں آرہا۔"

"رئیلی......؟" عامر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"آف کورس!" مونا نے نظریں جھکا کر جیسے ہتھیار ڈال دیے۔

"جانو یاد کرو، ٹھیک ایک سال پہلے چاند کی چودھویں شب میں ہمارا ملن ہوا تھا۔"

"ہاں یاد آیا...... عدنان بھائی کی مہندی کی تقریب میں...... میں پھولوں کا تھال لے کر جو بھاگی تھی تو آپ سے ٹکرا گئی تھی۔" مونا کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

"ٹکرانے کا تو بہانہ تھا، میرے قدموں میں پھول بچھا دیے تھے سارے کے سارے۔" عامر نے شرارت سے کہا تو وہ ہنس دی اور بولی۔

"اس کے بعد آپ نے میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

"کوئی آکر درِ دل پر دستک دے تو کیا کواڑ نہیں کھولنا چاہیے۔"

"ضرور کھولنا چاہیے۔" وہ شرما کر بولی۔

"میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"لوگ کہتے ہیں، شادی کے بعد رومانس میں کمی آجاتی ہے مگر آپ تو ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ جیسے پہلی ملاقات میں تھے۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہوا ناں...... کہ لوگ غلط کہتے ہیں۔" عامر نے اس کے کانوں میں جیسے رس گھولا۔

"ہاں......" وہ پھر شرما گئی۔

"جانو...... اب میں اپنے ملن کی پہلی سالگرہ منانے کا تو حق رکھتا ہوں ناں۔" عامر اب اسے جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سچ کہتی ہوں، آپ کی یہ باتیں مجھے کسی فلمی ہیرو جیسی لگتی ہیں۔" مونا نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔

"میں کیوں کسی کی نقالی کرنے لگا۔" وہ جیسے برا مان گیا۔

"چلیں فلمی ہیرو تو میرے عامر کی نقل کر سکتے ہیں ناں۔" مونا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

عامر نے تائید میں سر ہلا کر مونا کو اپنے قریب کر کے چھری اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

"مجھے آپ پر فخر ہے عامر۔" مونا نے بڑے مان سے کہا۔

"یہ فخر وخر بعد میں کرنا، پہلے اپنے ملن کی پہلی سالگرہ کا کیک تو کاٹ لیں۔" دونوں نے مل کر کینڈل بجھائی اور کیک کاٹا...... ایک دوسرے کو کیک کھلاتے ہوئے وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

بکروں کی آواز آئی...... تو مونا تفکر بھرے لہجے میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے...... بکرے بارش کی وجہ سے ڈر رہے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے، وہ مل کر ہمیں سالگرہ کی مبارک باد دے رہے ہیں۔" عامر کا لہجہ ایسا شوخی بھرا تھا کہ مونا کھلکھلا کر ہنس دی۔

"آپ بھی ناں...... ہر معاملے کو اپنی مرضی کے حساب سے سیٹ کر لیتے ہیں۔"

"جی نہیں، ایسا تو تم کرتی ہو۔"

"جی نہیں، آپ کرتے ہیں، میں نہیں۔"

"اچھا...... جب ہی اس شب تم گرین سوٹ میں میرے سامنے آئی تھیں کہ تمہیں یہ بات اچھی طرح پتا تھی کہ یہ رنگ ہمیشہ سے میرے دل کو چھوتا ہے اور صرف تم پر ہی کھلتا ہے۔"

"مگر وہ میرا بھی تو فیورٹ کلر ہے...... اور پھر میرے بھائی کی مہندی کا فنکشن تھا، گرین کلر نہ پہنتی تو کیا کتھئی پہنتی۔"

"ہاں...... ہاں، کہہ دو تمہاری تو کوئی غلطی تھی ہی نہیں۔" وہ کیک رغبت سے کھاتے ہوئے ہنسا۔

"کیوں...... نہیں تھی آپ کی غلطی...... جب آپ مجھ سے ٹکرائے تھے تو آپ کی شرٹ کا بٹن میرے کان کے بالے میں بھی تو الجھ گیا تھا۔"

"وہ تو تم نے جان کر الجھایا ہوگا، مجھ جیسا گبرو تو پوری محفل میں کوئی نہیں تھا۔" اس کا لہجہ شرارت سے مزین تھا۔

"ہاں...... یہ تو ہے کہ مجھے بھی آپ کے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔"

"واقعی......!" وہ اترایا۔

"مگر اس شب میں بھی تو ہمہ وقت آپ کی نظروں کی رینج میں تھی۔"

"تم جیسی بھی نہ کوئی تھی، نہ کوئی ہے...... اور نہ ہی کوئی ہوسکتی ہے۔" اب وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"پتا ہے میری بہنیں کیا کہتی ہیں؟" لہجہ تو فکّی بھرا تھا۔

"کیا کہتی ہیں؟"

"یہی کہ ہمارے جیسا پرفیکٹ کپل ہماری پوری فیملی میں کوئی نہیں ہوگا۔" مونا نے مسحور لہجے میں کہا۔

"ہونا بھی نہیں چاہیے۔" عامر کی آنکھیں ہنوز بند تھیں اور اس کا چہرہ اس کے بالوں پر تھا۔

"میرے بھیا ظفر اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتے ہیں مگر آپ جیسا نہیں...... آپ کو تو میرے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

"وہ اس لیے جانو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں صرف میرے لیے بنایا ہے۔"

"اور آپ کو میرے لیے۔" بادل ایک بار پھر زور سے گرجے اور بکروں کے ممیانے کی آوازیں بھی تیز ہوئیں تو وہ پریشان ہو کر بولی۔

"مجھے یوں لگتا ہے کہ بادلوں کے گرجنے کی آوازوں سے ہمارے بکرے ڈر رہے ہیں۔"

"تو یہ کرتے ہیں کہ ہم سب بکروں کو اپنے کمرے میں لے آتے ہیں، ایک رات کی تو بات ہے۔" وہ ہنسی دبا کر بولا۔

"تو کیا پھر وہ خاموش ہو جائیں گے؟" اس کا لہجہ سادہ لوحی لیے ہوئے تھا۔

"پاگل ہو تم بالکل۔" وہ ہنسا۔ "بکروں کو بارش، سردی، گرمی کی عادت ہوتی ہے اور پھر وہ شیڈ میں کھڑے ہیں۔ کوئی بارش میں بھیگ تھوڑی ناں رہے ہیں۔" اس نے سمجھایا۔

"تو پھر وہ اتنا چیخ کیوں رہے ہیں؟"

"چیخ نہیں رہے، آوازیں نکال رہے ہیں کہ وہ ہماری طرح باتیں تو نہیں کر سکتے ناں۔"

"اچھا...... تو وہ بھی بارش انجوائے کر رہے ہیں۔"

"ہاں، اب سمجھی ہو تم میری بات۔" عامر کی بات سن کر وہ بے اختیار ہنسنے لگی اور عامر کو یوں لگا جیسے بارش کی بوندیں اس کی ہنسی کے ساتھ مل کر ناچ رہی ہوں چھم چھم چھم۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسے یوں دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ وہ کس قدر خوب صورت تھی اور کتنی محبت کرنے والی۔ اس کی نگاہ ہی اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کی ہنسی پر وہ چونکا اور شکایتی لہجے میں بولا۔

"میں آج تمہارے لیے جو گرین ڈریس لایا تھا وہ کیوں نہیں پہنا تم نے؟"

"اتنا بھاری جوڑا اس برسات کی رات میں پہن لیتی؟"

"ہاں...... بالکل۔"

"میں نے سوچا کسی تقریب میں پہن لوں گی۔"

"آج بھی تو ہماری ملن کی تقریب ہے۔ جاؤ پہن کر آؤ۔" تب مونا مسکراتی ہوئی چلی گئی اور عامر آنکھیں بند کیے گنگنانے لگا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی اور جب وہ بہت خوش ہوتا تھا تو گنگنایا کرتا تھا۔ اکثر لوگوں کو تو معلوم تک نہیں تھا کہ وہ اچھا گلوکار بھی ہے، اس کا یہ شوق صرف اس تک ہی محدود تھا۔

جب مونا نگینوں سے مزین وہ ڈارک اور لائٹ گرین سوٹ پہن کر اس کے سامنے آئی تو وہ جیسے گنگنانا بھول گیا اور ششدر سا مونا کو دیکھنے لگا۔ وہ واقعی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اسے یونہی دیکھتا رہا۔ عامر نے اس کے دونوں شانوں کو تھاما اور کوئی بات اس کے کانوں میں کہنا چاہتا تھا کہ کال بیل چیخ اٹھی دونوں کا رومنٹک موڈ ہوا ہو گیا اور مونا برا سا منہ بنا کر بولی۔

"یہ اس وقت اتنی تیز بارش میں ہمارے ہاں کون آیا ہے؟"

"غلطی سے کسی نے بیل بجا دی ہوگی۔" عامر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

دوبارہ پھر بیل ہوئی اور اس کے بعد اتنی زور سے بجی جیسے کوئی بیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گیا ہو۔

"کیا کریمن کے کانوں میں آواز نہیں جا رہی ہے جو وہ اپنے کوارٹر سے ابھی تک گیٹ پر نہیں پہنچی۔" عامر کا لہجہ ناراض سا تھا۔ "مونا نوکروں کو اتنی ڈھیل مت دیا کرو کہ وہ اپنے فرائض ہی بھول جائیں۔"

"اوہ، میں تو بھول ہی گئی آج شام ہی تو ڈرائیور اور کریمن چھٹی لے کر گئے ہیں۔" مونا سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

"بقرعید میں صرف دو دن ہیں اور آپ نے نوکروں کو چھٹی دے دی...... واہ بیگم واہ۔"

"کل دوپہر تک دونوں آجائیں گے، اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے چھٹی لی تھی انہوں نے۔" اب بیل بجانے کے ساتھ ساتھ گیٹ بھی دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اگر گیٹ نہیں کھولا گیا تو آنے والا اسے توڑ کر اندر آجائے گا۔

"کون پاگل آگیا اس برستی بارش میں۔ دیکھتا ہوں جا کر میں۔" عامر غصے میں باہر کی جانب جاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

بارش پھر تیز ہوگئی تھی۔ عامر نے گیٹ کھولا کوئی لڑکی اپنے ہاتھوں کا چھجا بنائے کھڑی تھی۔ مونا درشت سے لہجے میں بولی۔

"کون ہے؟"

"کوئی لڑکی ہے۔" عامر نے دھیرے سے کہا۔ مونا مزید آگے آئی اور غصے سے بولی۔

"جی فرمایئے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟ یقیناً بارش میں آپ غلط گھر کے دروازے پر بیل دے بیٹھی ہیں۔"

"پلیز...... کیا آپ پانچ منٹ کے لیے مجھے اندر آنے کی اجازت دیں گی۔" لڑکی کا لہجہ لجاجت بھرا تھا۔

"جی نہیں، میں اجنبی لوگوں کو اپنے گھر میں نہیں گھسایا کرتی۔" مونا کا لہجہ اہانت آمیز تھا۔

"آپ میری بات تو سن لیں۔" لڑکی کا لہجہ ملتجی سا تھا۔

"معاف کرو اور آگے جاؤ۔" مونا نے پیٹھ موڑ لی۔

"میں بھکارن نہیں ہوں۔ اس بارش میں میرے ساتھ حادثہ ہو گیا ہے۔ پلیز میری بات تو سن لیں۔" لڑکی کا لہجہ بہت گلوگیر تھا۔

"کہاناں...... اپنے یہ پروفیشنل داؤ کہیں اور جا کر آزماؤ۔ یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔" وہ لڑکی سے کہہ کر عامر سے مخاطب ہوئی۔ "عامر گیٹ بند کرو۔" اس نے دوٹوک لہجے میں عامر سے کہا جو لاتعلق سا کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ بادل کی زوردار آواز میں گڑگڑاہٹ کے ساتھ بجلی چمکی اور لڑکی ہراساں سے لہجے میں بولی۔

"پلیز...... مجھ پر بھروسا کریں۔ میری بات تو سن لیں۔"

"کیا بات ہے، ہمارے گھر کیوں آئی ہو تم؟" اب عامر، مونا کو ایک طرف کر کے سامنے آکر بولا۔ اس کا لہجہ کافی درشت تھا۔

"سر ابھی گن پوائنٹ پر میری گاڑی، میرا پرس اور میرا موبائل چھین لیا گیا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اندر آنے دیں تاکہ میں اپنے گھر رابطہ کر سکوں۔"

"ٹھیک ہے، آجائیں۔" لڑکی کو یوں ہراساں

دیکھ کر اس نے کہا۔ لڑکی اندر داخل ہوئی تو کار پورچ میں اس نے اپنے گیلے بالوں کو جھٹکا۔ چادر نچوڑ کر دوبارہ اوڑھی اور اندر داخل ہونے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ مونا نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''اے لڑکی وہیں رکو۔''

''جی!'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے گھر کے اندر آنے کو نہیں کہا ہے۔ تم وہیں پورچ میں ٹھہرو گی۔''

''بہت بہت شکریہ میڈم۔'' لڑکی نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔ موسم سرما کی اس پہلی بارش نے موسم کو خاصا ٹھنڈا کر دیا تھا۔

''یہ لو موبائل اور اپنے گھر بات کرو اور پھر نکلو یہاں سے۔'' مونا اسے اپنا موبائل دیتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔ لڑکی نے سرعت سے نمبر ملایا اور بڑے مایوس لہجے میں کہا۔

''یہ بھی میری بدقسمتی کہ خراب موسم کے باعث اس وقت سگنلز ہی نہیں آ رہے ہیں۔''

''اس برستی بارش میں تم اپنے گھر سے نکلی ہی کیوں تھیں؟'' مونا کا لہجہ خاصا تلخ سا تھا۔

''آج میری سہیلی کی انگیجمنٹ تھی۔ اس میں شرکت کر کے واپس گھر جا رہی تھی۔ آپ کے گھر کے قریب دو لڑکوں نے میری گاڑی رکوائی اور گن پوائنٹ پر ہر چیز لے کر فرار ہو گئے۔'' لڑکی نے اپنے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اسے بتایا۔

''پھر تو تمہیں تھانے جانا چاہیے تھا۔ ہمارے گھر کی بیل کیوں بجا دی تم نے؟'' مونا کا لہجہ ہنوز غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بارش رکے تو میں پہلے اپنے گھر جاؤں گی۔ بارش مزید تیز ہوئی تو......'' لڑکی کے ہونٹ لرزنے سے لگے۔ عامر جو کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ لڑکی کو یوں لرزتا دیکھ کر بولا۔

''آپ اندر آ جائیں باہر تو بہت سردی ہے۔''

''نہیں عامر، ہم اس غیر لڑکی پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ کیا پتا تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھی بھی یہاں آ جائیں۔ یہ لڑکی ڈاکو بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''ڈاکو کیا ایسے نہتے ہوا کرتے ہیں؟'' اس نے اپنے اوپر لی ہوئی چادر بھی اتار دی۔ ''ایسا واقعہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''اسے اندر آنے دو۔'' عامر نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''چلو آ جاؤ اندر۔'' مونا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ اس اجنبی لڑکی نے بڑی شکر گزاری سے پہلے عامر کو دیکھا اور پھر مونا کو۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ رونے لگی۔

''اب ٹسوے مت بہاؤ، اندر آ جاؤ۔'' وہ اپنے ہونٹ کاٹتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ مونا نے اپنے بیڈ روم میں جانے سے پہلے ایک نظر پھر اس لڑکی کو بغور دیکھا اور تنک کر بولی۔

''تم یہاں ٹی وی لاؤنج میں رہو اور لینڈ لائن نمبر سے اپنے گھر رابطہ کرو اور جتنی جلدی جا سکتی ہو یہاں سے جاؤ۔ مجھے مہمان نوازی کا کوئی شوق نہیں ہے...... آیا سمجھ میں۔'' وہ لڑکی تائید میں اپنا سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

مونا اپنے بیڈ روم میں بستر پر لیٹی تھی اور عامر بھی چپ چاپ لیٹا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے عامر بھی پریشان سا ہو۔

''آپ کی وجہ سے خواہ مخواہ یہ بلا ہمارے گھر میں داخل ہوئی ہے، پتا نہیں کب دفع ہو گی۔ مجھے تو شکل سے ہی مکار لگ رہی ہے۔'' مونا نے برا سا منہ بنا کر شکایتی لہجے میں کہا۔

''اس برستی بارش میں ایک پریشان حال لڑکی کو پناہ نہ دینا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔'' عامر نے حلیمی سے کہا۔

''اگر یہ بارش ساری رات نہیں رکے گی تو کیا یہ صبح تک ہمارے گھر میں ہی رہے گی؟ اس لڑکی کے آنے سے تو مجھے عجیب سی وحشت ہو رہی ہے۔'' مونا کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔

''وہ لڑکی تو خود پریشان ہو رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ تم اسے حوصلہ دو تم خود ٹینس ہو رہی ہو۔'' عامر نے مونا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رسان سے سمجھایا۔

''میری اتنی خوب صورت رات اس چڑیل کی وجہ سے غارت ہوئی ہے۔ کچھ احساس ہے آپ کو اس کا۔''

''کسی کی بھی مدد کر کے جو طمانیت ہوا کرتی ہے تم اس بارے میں سوچو گی تو کوئی افسوس نہیں رہے گا۔''

''مجھے نہیں ہوتی ایسی طمانیت جو آپ کو ہوتی ہے۔ ہر ایک کے کام آنے کا آپ نے تو ٹھیکا لے رکھا ہے جیسے۔''

''جانو کول ڈاؤن، دیکھو کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے۔'' عامر جیسے اب اسے بہلا رہا تھا۔

''ہاں، موسم تو واقعی بہت پیارا ہو گیا ہے۔''

''اور صرف دو دن بعد بقر عید ہے۔''

''ہاں۔''

''پہلے دن قربانی کے بعد تمہاری فیملی میں، شام کو آپا کے گھر اور دوسرا دن پورا فارم ہاؤس میں گزاریں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں اپنی تمام کزنز کو بھی فون کر دوں گی اور......'' ابھی وہ لوگ اپنے پروگرامز کو حتمی شکل دینے بھی نہ پائے تھے کہ لاؤنج سے اچانک لڑکی کے رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ لاؤنج میں پہنچے تو لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''کیا ہوا، رو کیوں رہی ہو؟'' عامر کا لہجہ متوحش تھا۔

''میرے سارے کپڑے بارش میں بھیگ گئے ہیں اور مجھے سخت سردی لگ رہی ہے۔'' وہ لرزتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں تمہیں گرم شال لا کر دیتی ہوں۔'' مونا نے احسان جتاتے ہوئے لہجے میں کہا اور اندر چلی گئی۔

''اُف خدایا...... یہ سب بھی ہونا تھا۔'' لڑکی گلوگیر لہجے میں بڑبڑا رہی تھی۔

''پریشان مت ہوں اور حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' عامر نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''لو یہ شال۔'' مونا نے اس پر شال پھینکنے کے انداز میں دیتے ہوئے کہا۔

''ذرا بارش تھمے تو آپ کے گھر...... فون بھی ہو جائے گا۔'' عامر کا لہجہ حلیمی لیے ہوئے تھا۔ لڑکی نے وہ شال اپنے چاروں اطراف لپیٹ لی، مونا اور عامر واپس اپنے بیڈ روم میں آ گئے۔

''رات بہت زیادہ ہو گئی ہے مونا تم سو جاؤ۔'' عامر نے محبت بھرے لہجے میں بیوی سے کہا، وہ جانتا تھا مونا سے رات دیر تک نہیں جاگا جاتا تھا۔

''کیسے سو جاؤں میں...... ! اس مصیبت کے آ جانے سے تو میرے سر میں سخت درد ہو گیا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارا سر دبا دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں ذرا سی بات بھی تمہیں پریشان کر دیتی ہے۔'' عامر اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی پیشانی دباتے ہوئے بولا۔

''مجھے تو یہ لڑکی شکل ہی سے جھوٹی اور مکار لگ رہی ہے اور کچھ کچھ لوفری بھی۔''

''جانو کسی لڑکی کو ایسے نہیں کہتے، بری بات ہوتی ہے۔'' عامر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ اس کی شکل دیکھیں ذرا...... کیسی چالاکی رچی ہوئی ہے اور وہ آنکھیں کیسے نچا نچا کر بول رہی تھی۔''

''یہ سب میں نے نہیں دیکھا۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مجھے تو غلط قسم کی لڑکی لگ رہی ہے۔ جوان جہان لڑکی کو کسی انجانے گھر میں آتے ہوئے کوئی ڈر بھی محسوس نہیں ہوا۔''

''بری بات مونا، کسی پر بہتان نہیں دھرا کرتے، وہ بے چاری لُٹ پٹ کر ہمارے گھر آئی ہے۔ ہم اگر اس کی اتنی سی مدد کر دیں کہ تھوڑی دیر اپنے گھر میں ٹھہرنے دیں تو کیا مضائقہ ہے۔'' عامر نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آج بارش بھی تو رکنے کا نام نہیں لے رہی۔ پتا نہیں وہ کب جائے گی۔'' مونا کے لہجے میں بے رخی نمایاں تھی۔

''جانو تم کسی کی کوئی فکر نہ کرو اور سو جاؤ۔'' اب عامر اسے کسی بچے کی طرح تھپک رہا تھا۔ مونا نے بھی اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ عامر نے اسے غنودگی میں دیکھ کر اسے اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا۔ ابھی وہ مونا کی پیشانی کے بال پیچھے ہی کر رہا تھا کہ لاؤنج سے سسکنے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں اور اتنی بڑھیں کہ مونا نے بھی یکدم آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''عامر یہ کون رو رہا ہے؟''

''شاید وہی لڑکی۔'' اس نے جواب دیا۔

''مگر کیوں؟''

''یہ تو پوچھ کر ہی پتا چلے گا۔'' عامر اور مونا لاؤنج میں پہنچے تو وہ اپنے گھٹنوں میں منہ دیے سکڑی بیٹھی سسک رہی تھی۔ عامر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟''

''لگتا ہے میں سردی سے مر جاؤں گی۔ میرے سارے کپڑے بارش میں تر ہیں اور آپ کی ایک پتلی سی گرم چادر نے میری سردی کسی طرح کم نہیں کی ہے۔ گیلے کپڑوں کی وجہ سے میری حالت تو بہت خراب ہو رہی ہے۔ شاید میں صبح تک زندہ بھی نہ رہ پاؤں۔''

''آؤ میرے کمرے میں۔ میں تمہیں اپنے سوتی کپڑے دے دیتی ہوں تم تبدیل کرلو مگر یہ پکا یقین کرلو کہ تم مرو گی ہرگز نہیں۔'' مونا نے تلخ لہجے میں کہا مگر لڑکی کی حالت شاید اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ اس نے مونا کے جملے شربت کے گھونٹ کی طرح اپنے حلق سے اتارے اور مونا کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ مونا نے اپنی الماری میں سے ایک سوٹ اسے دے کر واش روم کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لڑکی جب کپڑے بدل کر آئی تو مونا نے اسے بغور دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی شاید اس کے جتنی خوب صورت۔ مونا اسے بار بار دیکھ رہی تھی۔ اب وہ اس کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے لمبے بالوں میں برش کر رہی تھی اور مونا اس کے دراز گھنے بال دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

''کیا اب بھی لڑکیوں کے اتنے لمبے بال ہوتے ہیں؟'' لڑکی نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈال کر کہا۔

''آپ کا بیڈ روم بہت خوب صورت ہے اور آپ بھی۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' مونا کا لہجہ نخوت بھرا تھا۔

''معاف کیجیے گا، کیا آپ کے کچن میں جا کر میں اپنے لیے چائے بنا سکتی ہوں؟''

''آپ کو کیا پتا کچن کہاں ہے اور آپ کسی اجنبی گھر میں دودھ، پتی اور چینی کیسے ڈھونڈ سکتی ہیں؟'' مونا کا لہجہ کچھ الجھا ہوا تھا۔

''مجھے پتا ہے۔'' اس کا لہجہ وثوق بھرا تھا۔

''آپ کو میرے کچن اور اس کی چیزوں سے آگاہی کیونکر ہو سکتی ہے؟'' مونا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ سارے کچن کم و بیش ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کیبنٹ میں پتی اور چینی ہوگی اور فریج میں دودھ۔'' لڑکی نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''ذہین لگتی ہو۔'' مونا اس کی بات سن کر پہلی مرتبہ مسکرائی۔

''اگر میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے میں آپ کو مزہ نہ آئے تو میرا نام شگفتہ سے بدل کر سنجیدہ رکھ دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم بنا لاؤ۔'' شگفتہ کمرے سے نکل کر چلی گئی اور مونا بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی۔

''ہے تو یہ لڑکی ہمت والی۔ اس کے ساتھ اتنا بڑا سانحہ ہو گیا ہے پھر بھی اپنے آپ پر اس نے قابو پا رکھا ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو وہیں حادثے کی جگہ پر کب کی بے ہوش ہوئی پڑی ہوتی اور برسات کی اس رات میں نہ جانے کتنی ہی گاڑیاں مجھے کچل کر آگے بڑھ چکی ہوتیں۔'' عامر جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنی سوچوں میں ہی گرفتار تھی۔

''وہ لڑکی کہاں گئی؟'' کمرے میں آکر اس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ چلی گئی۔'' مونا نے کہا۔

''اللہ تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔ چلو اب ہم بھی چین سے سو جاتے ہیں۔'' وہ بیڈ پر آتے ہوئے بولا۔

''ہم نہیں سو سکتے، وہ محترمہ ابھی اسی گھر میں

موجود ہیں۔''

''مگر ہیں کہاں؟''

''محترمہ چائے بنانے گئی ہیں۔'' مونا نے بتایا۔

''اتنے سرد موسم میں اسے چائے کی طلب یقیناً ہو رہی ہوگی۔'' عامر نے خود کلامی میں بڑبڑاتے ہوئے مونا کی طرف دیکھا۔

''عامر اتنے پیارے اور رومینٹک موسم میں اس لڑکی نے ہماری ساری رات کالی کردی۔''

''جب ہم کسی کے کام آتے ہیں تو نہ رات کالی ہوتی اور نہ ہی دن سیاہ۔'' اس نے مونا کو پیار بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیا اس لڑکی کا یوں آنا آپ کو برا نہیں لگا؟'' مونا نے حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

''میں تو ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ میری ذات سے کسی کی مدد ہو جائے اور بس...... اس لیے اس برستی رات میں کوئی بھی مدد کے لیے آتا میں اس کی مدد ضرور کرتا۔''

''ہاں...... ہاں کوئی ٹرسٹ کھول لیں آپ۔'' مونا جمائی لے کر بولی اور عامر بیوی کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

☆☆☆

سچی بات تو یہ تھی کہ مونا کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیے۔ اس کے دل میں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بے ہوشی کی دوا ملا کر لوٹ مار کرنے والی نہ ہو مگر عامر کو چائے پیتا دیکھ کر اس نے بھی چائے پی لی تھی۔ یہ واقعی سچ تھا کہ اس نے بہت اچھی چائے بنائی تھی۔ سبز الائچی کی مسحور کن خوشبو نے بھاپ اڑاتی چائے کا مزہ دوبالا کردیا تھا مگر پھر بھی اس نے چائے کی تعریف کرنے کے بجائے اس سے طنزیہ لہجے میں یہی پوچھا۔

''تم آج رات اپنے گھر نہیں پہنچو گی تو کیا تمہارے گھر والے تمہارے لیے پریشان نہیں ہوں گے؟ میرا خیال ہے اب تک انہوں نے کئی تھانوں اور اسپتالوں میں رجوع کرلیا ہوگا۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... اگر کوئی لڑکی رات کو اپنے گھر نہیں پہنچتی ہے تو اس کے گھر کے لوگ متفکر نہیں ہوتے یا وہ ایسے واقعات اور سانحات کے عادی ہوا کرتے ہیں۔''

''باجی، یہ بات ہرگز نہیں ہے۔'' وہ بوکھلائی۔

''باجی...... کون باجی؟'' مونا نے غصے سے اسے دیکھا۔

''میرا مطلب آپ سے ہے میڈم۔'' اس نے سر جھکا کر گلوگیر لہجے میں کہا۔

''میرے گھر میں میرے ساتھ صرف میری والدہ ہی ہوتی ہیں۔ وہ بیمار ہیں، رات کو دوا کھا کر جلد سو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میرا فون بھی ریسیو نہیں کر پا رہی ہیں۔''

''تمہاری قسمت اچھی ہے کہ ہم لوگ شریف ہیں اور اگر نہ ہوتے تو......؟'' مونا نے تمسخرانہ لہجے میں عامر کو دیکھتے ہوئے شگفتہ سے کہا۔ عامر کو بیوی کی یہ بات اچھی نہیں لگی مگر اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا اور نیچی نظریں کیے بیٹھا رہا۔

''یہ اللہ کا احسان ہے کہ میرا ناتا ہمیشہ اچھے لوگوں سے ہی رہا ہے۔'' شگفتہ نے سادہ لوحی سے کہا۔

''فرض کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر ہم لوگ ایسے ویسے ہوتے تو پھر؟'' مونا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو میں اپنی جان پر کھیل جاتی۔'' وہ بوکھلا سی

گئی تھی۔

''اوہ...... کھیلتی بھی ہو تم۔'' مونا کو اس وقت اسے چڑانے میں شاید مزہ آرہا تھا۔

''ہاں، کالج میں اچھی اسپورٹس گرل رہی ہوں میں۔''

''اوہ...... تو تم اسپورٹس گرل بھی ہو۔ جب ہی تو......!'' مونا نے تمسخرانہ لہجے میں کہا کہ عامر جو چپ چاپ بیٹھا تھا بے اختیار ہنسنے لگا مگر اس کی ہنسی مونا کے مقابلے میں خاصی دھیمی تھی۔

''آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' اب وہ عامر کو دیکھ کر بدحواس سے لہجے میں بولی۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی، ڈونٹ وری۔'' عامر نے زیرلب تبسم کے ساتھ کہا۔

''سنو لڑکی، ہم لوگ بلاوجہ ہنسنے کے عادی ہیں۔''

''اوہ۔'' لڑکی نے گہری سانس لی اور خوشامدی لہجے میں بولی۔

''سچ کہہ رہی ہوں میں، آپ جیسا خوب صورت کپل میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' مونا نے بڑے زعم سے کہا۔ ''ہم واقعی خوب صورت ہیں۔'' بیوی کی یہ بات سن کر عامر پھر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

☆☆☆

کراچی میں بارش کا موسم خال خال ہی آتا ہے اور یہ اس سال کی پہلی بارش تھی اور وہ بھی اچانک ہی شروع ہوئی تھی اور اب رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ محکمۂ موسمیات والوں نے تو صاف کہا تھا کہ اس سال دور دور بارش کا امکان نہیں ہے مگر اچانک ہو جانے والی بارش نے جہاں موسم کی خنکی کو بڑھا دیا تھا وہاں کراچی کے ایک گھر میں ایک لڑکی کے یوں آجانے سے وہاں مقیم گھر کی مالکہ کو ایک عجیب شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا۔

اس وقت شگفتہ، مونا کے بیڈروم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ عامر بیڈ کے ساتھ رکھے صوفے پر قصداً کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھا اور مونا اپنے سوالات کی چھری کی مختلف دھاریں اس لڑکی پر آزما رہی تھی کہ اس کا دل اس کی باتوں سے کسی طرح سے مطمئن جو نہیں ہو پا رہا تھا۔

''سنو تم نے بتایا تھا ناں کہ اپنی کسی سہیلی کی منگنی کی تقریب سے آرہی تھیں۔''

''جی ہاں، نمرہ میری اسکول سے کالج تک کی سہیلی ہے، اسی کی منگنی تھی۔''

''تم نے اپنی دوست کو بتایا کہ تمہارے ساتھ کیا حادثہ ہوا ہے؟'' مونا نے پوچھا۔

''اس کا فون ہی نہیں مل رہا۔''

''ہمیں بتاؤ نمبر، ہم ملاتے ہیں فون، کیوں عامر!'' مونا نے عامر کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں مونا، آپ ہمیں بتائیں نمبر ہم خود فون ملاتے ہیں۔ ہم بھی تو دیکھیں آپ کی سہیلی کو کتنا رنج ہوگا یہ سب سن کر۔'' عامر نے بھی مونا کے لہجے میں کہا۔ شگفتہ نے نمبر لکھ کر عامر کو دیا اور عامر نے کئی بار رابطہ کرنے کی کوشش کی اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تو خیر بارش کی وجہ سے نیٹ ورک کا نظام خراب ہے اور ویسے بھی رات کے تین بجے کون کسی کو فون کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے ریسیو کرتا ہے۔'' عامر نے موبائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے وہ جان بوجھ کر نہ اٹھا رہی ہو۔'' مونا نے عامر کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں ہوسکتا ہے۔'' عامر نے اس کی تائید کی۔

''کبھی کبھی کسی کی خوشی دوسرے کا غم بن جاتی ہے۔'' لڑکی کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔

"میں سمجھی نہیں...... کسی کی خوشی دوسرے کا غم کیسے بن سکتی ہے؟" مونا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہ میں نمرہ کی منگنی میں جاتی اور نہ ہی میرے ساتھ یہ حادثہ ہوتا۔ اس کی خوشیوں بھری تقریب تھی مگر میرا یوں لٹنا میرے لیے کسی بڑے سانحے سے کم نہیں ہے۔"

"مگر تمہارے اس غم میں ہم لوگ تو برابر کے شریک ہیں۔" عامر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہا عامر نے...... تمہارا غم ہمیں بھی غم ناک کر گیا ہے۔ میں تو جلدی سونے کی عادی ہوں اور آج سونے کو ہی نہیں مل رہا ہے۔"

"اس کے لیے تو میں ہمیشہ آپ سے معذرت خواہ رہوں گی۔ میری وجہ سے آپ دونوں کو کس قدر زحمت ہوئی ہے۔" لڑکی کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"پلیز آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں اور یاد رکھیں انسان ہی انسان کا مرہم ہوا کرتا ہے۔ آج اگر ہم لوگ آپ کے کام آگئے ہیں تو کل آپ کسی اور کے کام آجایئے گا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے ناں۔" عامر حلیمی سے کہہ رہا تھا اور مونا کے چہرے کے تناؤ میں بھی کافی حد تک کمی آچکی تھی۔

"سر آپ کتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ بڑے لوگ کیسے ہوتے ہیں اس کا اندازہ مجھے آج اچھی طرح ہو گیا ہے۔"

"یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" مونا نے ہنس کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ "باتیں کرنے میں ان کا تو واقعی کوئی جواب ہی نہیں ہے۔"

"اکثر لوگ چائے پینے ہماری باتوں کی وجہ سے تو آتے ہیں۔" عامر نے ہنس کر شوخی سے بیوی کو دیکھ کر کہا۔ اب عامر رازدارانہ لہجے میں مونا سے مزید کچھ کہہ رہا تھا جسے سن کر مونا کی ہنسی رکنے میں نہیں آرہی تھی اور ان دونوں کو یوں ہنستا مسکراتا دیکھ کر شگفتہ بڑی متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اب خفت محسوس کرتے ہوئے مونا کے موبائل پر بار بار نمبر پش کر رہی تھی اور نمبر نہ ملنے کا ملال اس کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔ مونا نے اسے دیکھا اس کے چہرے پر دکھ کے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔

"تم کہیں پڑھتی ہو کیا؟" مونا نے جمائی لے کر پوچھا۔

"میں جاب کرتی ہوں ایک کمپنی میں۔"

"لگتی تو چھوٹی سی ہو جاب کیسے مل گئی؟"

"ایک سال پہلے ہی میری ایجوکیشن مکمل ہوئی ہے تو میں نے جاب کر لی۔"

"جاب کیوں کر لی؟"

"بس ایسے ہی وقت گزاری کے لیے۔"

"شادی کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

"منگنی ہو چکی ہے میری۔" وہ شرمائی۔

"اور شادی کب ہوگی؟" مونا نے پوچھا۔

"لڑکے والوں کے اپنے مسائل چل رہے ہیں۔ اس لیے دیر ہو رہی ہے۔"

"اللہ کرے تمہاری شادی جلدی سے ہو جائے۔" مونا نے مسکرا کر کہا۔

"آپ دعا کریں بلکہ آپ سر سے کہہ کر مسجد میں بھی دعا کروا دیں تو شاید دیر نہ لگے اور کسی کی دعا مجھے لگ جائے۔"

"مس پلیز آپ برابر کے کمرے میں جا کر آرام سے سو جائیں۔ صبح جب بارش رک جائے گی تو اپنے گھر چلی جایئے گا۔" عامر نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ لوگوں کو کافی پریشان کیا ہے ناں؟" وہ شرمندگی سے بولی۔

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" مونا ہنسی۔

"اس کے لیے میں آپ سے تہہ دل سے معافی مانگتی ہوں۔"

"اگر تم جا کر فوراً دوسرے کمرے میں سو جاؤ تو ہم تمہیں معاف کر سکتے ہیں۔ بہت رات ہو چکی ہے۔" مونا نے جمائی لے کر کہا۔ اس کے کمرے سے باہر جاتے ہی مونا نے اپنا کمرا لاک کر لیا اور عامر کو دیکھ کر بولی۔

"ساون کی خوب صورت رات کیسی خراب گزری ہے، ہے ناں؟"

"پتا نہیں۔" عامر نے کروٹ لے کر کمبل سر تک تان لیا۔

☆☆☆

شگفتہ دوسرے کمرے میں پہنچی...... پہلے ایک، ایک چیز کو غور سے دیکھتی رہی پھر کمرے کی کھڑکی کھولی تو تیز بارش ہو رہی تھی۔ بادل کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی چمک نے ماحول کو عجیب سا بنا دیا تھا۔ ریشمی پردے ہوا سے سرسرا رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ بارش کا نوحہ سنتی رہی۔

ساون کا ایک خوب صورت گیت اس کے لبوں پر مچلنے لگا۔ آواز اس کی ہمیشہ سے ہی بہت اچھی تھی۔ آنکھیں موند کر جب اس نے گانا شروع کیا تو شاید وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کہاں ہے اور کیوں گا رہی ہے۔

☆☆☆

مونا اور عامر اپنے بیڈ روم میں ایک دوسرے کی جانب سے پیٹھ موڑ کر تو ضرور لیٹے ہوئے تھے مگر وہ دونوں ہی جاگ رہے تھے۔ لڑکی کے گانے کی آواز سن کر پہلے مونا اٹھی اور وہ عامر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"عامر یہ گانے کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟"

"شاید وہ محترمہ ہی گا رہی ہیں۔"

"جس لڑکی کی گاڑی، پرس اور موبائل چھین لیا گیا ہو اُسے تو ساری رات بلک بلک کر رونا چاہیے تھا۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئی جو اس سچوئیشن میں گا رہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ پاگل ہی ہو گئی ہو۔"

"عامر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" مونا نے کہا۔

"مگر کیوں لگ رہا ہے؟"

"ہو سکتا ہے یہ لڑکی چڑیل ہو، روپ بدل کر ہمارے گھر آئی ہو اور موقع ملنے پر ہمارا خون پی جائے۔" مونا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ واقعی چڑیل ہو۔" عامر نے جھلا کر کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے آج چاند کی چودھویں میں وہ کوئی شیش ناگن ہو جو بہروپ بدل کر ہمارے ہاں داخل ہوئی ہو اور اب اپنے کمرے میں ناگن ڈانس کر رہی ہو۔ دیکھیں اس کی آواز کتنی سُریلی ہے جبکہ بات چیت میں اس کی آواز میں ایسا لوچ تو ہرگز نہیں تھا۔"

"ویسے اگر ایسا ہوا تو وہ ابھی آکر ہمارا دروازہ کھٹکھٹائے گی کہ دروازہ کھولو...... مجھے آپ کا خون پینا ہے۔" عامر نے مونا کی یہ بے تکی باتیں سن کر کلس کر کہا۔

"کیا وہ واقعی ایسا کر سکتی ہے؟" اب مونا تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"وہ ایسا کر نہیں سکتی بلکہ کر کے رہے گی۔" عامر کو غصہ آنے لگا تھا۔ مونا نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا اور ابھی وہ یہ پوچھنا چاہتی ہی تھی کہ آیا عامر نے اس لڑکی کے پیر دیکھے ہیں یا نہیں کہیں وہ چھل پیری تو نہیں۔ کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی اور مونا چیخ مار کر عامر سے چمٹ گئی۔

"خدا کے لیے دروازہ مت کھولنا، ورنہ وہ اندر آجائے گی۔" مونا کو یوں ہراساں دیکھ کر عامر بھی بدحواس ہو گیا۔

"پریشان مت ہو، میں پوچھتا ہوں ان محترمہ سے بات کیا ہے آخر؟ اور وہ ہمیں سونے کیوں نہیں

دے رہیں۔"
"نہیں...... نہیں ہم دروازہ ہی نہیں کھولیں گے۔"
"تم پریشان مت ہو، میں پوچھتا ہوں۔" مونا کے منع کرنے کے باوجود عامر نے دروازہ کھول دیا اور کافی دُرشتگی سے اس سے پوچھا۔
"کیا بات ہے؟"
"سر پلیز میں اس کمرے میں نہیں رہ سکتی۔ اس کمرے میں پتا نہیں کہاں سے ایک بڑا سا کاکروچ آگیا ہے اور اسے دیکھ کر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"
"تم کاکروچ سے ڈرتی ہو؟" مونا نے تنک کر پوچھا۔
"جی، میں بہت ڈرتی ہوں۔"
"آپ مونا کے ساتھ لیٹ جائیں، میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔" عامر نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"میرا مطلب آپ لوگوں کو ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔" لڑکی وہیں صوفے پر کمبل لے کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"وہ تو تم کر چکی ہو بس اب سو جاؤ۔" لڑکی صوفے پر لیٹ گئی اور مونا اپنے بیڈ پر مگر مونا کی پوری توجہ اسی لڑکی کی جانب تھی وہ دیکھ رہی تھی کہ لڑکی کچھ بے چین سی ہے کبھی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور کبھی گہری گہری سانسیں لینے لگتی جیسے سانس کے مریض تیز تیز سانسیں لیتے ہیں اور پھر اس کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات بڑھنے لگے۔ مونا یہ سب دیکھ کر گھبرا سی گئی...... سرعت سے اس کے پاس آئی اور پوچھا۔
"کیا تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے؟"
"آپ آرام کیجیے، مجھے تو بس ایسے ہی کبھی کبھی دے کا اٹیک ہو جاتا ہے۔" لڑکی نے اپنی بات کچھ اتنے دھیمے لہجے میں کہی کہ اس کی صرف آدھی بات مونا کی سمجھ میں آئی اور وہ پریشان سے لہجے میں بولی۔
"کیا تمہیں ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے؟"
"نہیں، نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"پھر تمہاری طبیعت کیوں خراب ہو رہی ہے؟"
"بارش میں بھیگنے کے سبب ایسا ہو رہا ہے۔ میرے پرس میں ہمیشہ میرا ان ہیلر ہوتا ہے اور وہ بھی پرس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ دراصل مجھے سانس کی تکلیف، خراب موسم میں اکثر ہو جاتی ہے۔"
"تو پھر کیسے ٹھیک ہو گی تم؟" مونا اس کی حالت دیکھ کر واقعی پریشان ہو گئی تھی۔
"آپ پریشان نہ ہوں، میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بس آپ کمرے کا دروازہ کھول دیجیے۔ بند کمرے میں مجھے گھٹن سی ہو رہی ہے۔" مونا نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کی آہٹ سن کر عامر نے دوسرے کمرے سے آ کر پوچھا۔
"خیریت تو ہے، یہ تم ابھی تک جاگ کیوں رہی ہو؟"
"عامر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"
"کیوں، ڈر کیوں لگ رہا ہے جانو؟" وہ پریشان سے لہجے میں بولا۔
"وہ لڑکی شاید مر رہی ہے۔"
"وہ کیسے مر سکتی ہے؟"
"آپ آ کر تو دیکھیں لگتا ہے وہ اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔" عامر بھاگ کر کمرے میں آیا اور اس لڑکی سے پوچھا۔
"کیا میں آپ کو گرم پانی لا کر دوں؟" لڑکی کی حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا لڑکی نے تائید میں سر ہلایا۔ عامر کچن میں جا کر سرعت سے ایک گلاس میں گرم پانی لے کر آیا۔ جسے اس نے مشکور نظروں سے دیکھتے ہوئے تھام لیا۔ لڑکی نے گھونٹ گھونٹ پانی

پینا شروع کیا۔ مونا وِکس اس کے گلے اور سینے پر لگاتی رہی جس سے اس کی طبیعت میں کافی بہتری آئی۔ طبیعت میں افاقہ ہوا تو وہ تشکر بھرے لہجے میں بولی۔

''آپ دونوں کا بے حد شکریہ، اب میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

''کیا میں آپ کو رضائی لادوں تاکہ آپ کو ذرا بھی ٹھنڈ محسوس نہ ہو۔'' عامر نے اس سے پوچھا شاید اسے ایک کمبل میں ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔

''اگر آپ آسانی سے دے سکیں تو۔'' عامر تیزی سے دوسرے کمرے میں گیا اور ایک بلور یشمی رضائی اس پر لا کر ڈال دی جسے اس نے اچھی طرح سے اپنے اردگرد لپیٹ لیا۔

''شگفتہ آج تمہاری وجہ سے ہمارا رت جگا ہو رہا ہے۔'' مونا نے ہنس کر کہا تو وہ شرمندہ سی ہوگئی اور معذرت کرنے لگی۔

''اب رات رہ ہی کتنی گئی ہے، ایک دو گھنٹے کے بعد تو صبح ہو جائے گی۔'' عامر نے مسکرا کر مونا سے کہا۔

''ہاں، فجر کی اذان ہونے میں اب کچھ زیادہ وقت نہیں رہا۔'' مونا نے شوہر کی تائید کی۔ ''اب اگر ہم سونے کی کوشش بھی کریں گے تو نیند نہیں آئے گی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''مونا تم ڈرائی فروٹ ہی لے آؤ۔''

''اس کے بعد آپ کہیں گے گرما گرم کافی بھی۔''

''میری بیوی سے زیادہ بھلا کوئی ذہین ہو سکتا ہے۔'' عامر نے مسکرا کر کہا اور مونا کچن میں کافی بناتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

''یہ عامر بھی وقت دیکھتے ہیں اور نہ موقع۔ مہمان داری کرنے کا تو اتنا شوق ہے کہ توبہ... میں کبھی اپنے لیے کافی خود نہیں بناتی۔ اب اس سانس کی مریضہ کو کافی بنا کر پلاؤں گی۔'' اور جب وہ کافی بنا کر کمرے میں لائی تو وہ لڑکی صوفے پر بے خبر سو رہی تھی اور عامر بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

''جب سونا ہی تھا تو مجھ سے کافی بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ عامر سے خفگی بھرے لہجے میں گویا تھی۔

''یار میں کہاں سویا ہوں، کافی کا انتظار کر رہا تھا۔''

''رضائی نے مجھے حرارت سی دی اس لیے میں نے آنکھیں موندھ لی تھیں شاید جھپکی بھی لگ گئی۔ ویری سوری مجھے آپ کے پاس کچن میں آنا چاہیے تھا۔'' لڑکی بولی۔

''بیکار کی باتیں مت کرو...... یہ کافی لو۔ یہ تمہاری طبیعت کو مزید بہتر کرے گی۔'' مونا نے اسے کافی کا مگ دیتے ہوئے کہا۔ اب وہ تینوں ڈرائی فروٹ ٹونگتے ہوئے کافی بھی پی رہے تھے۔

''موسم سرما کی پہلی بارش کی یہ رات میں اپنی ساری زندگی بھول نہیں پاؤں گی۔'' لڑکی نے کہا۔

''اور ہم بھی، ہے ناں مونا؟'' عامر نے مسکرا کر بیوی کو دیکھا جو خاموش بیٹھی تھی اور اسے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لڑکی نے چلغوزے چھیل کر مونا کو دیتے ہوئے کہا۔

''کیا میں آپ کو باجی کہہ سکتی ہوں؟''

''نہیں، میری عمر ابھی باجی اور آنٹی کہلانے والی نہیں ہے۔'' اور ہاتھ پر دھرے چلغوزے پلیٹ میں ڈال دیے۔

''کیا میں پھر کبھی دوبارہ آپ کے ہاں آسکتی ہوں؟'' مونا نے ایک نظر اس لڑکی کو دیکھا اور تلخ لہجے میں بولی۔

''ہاں ضرور... مگر ایک شرط کے ساتھ۔''

''کیسی شرط؟'' اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

''پھر کوئی دوبارہ تم سے گاڑی کے ساتھ موبائل اور پرس چھین لے تو تم پناہ لینے آجانا۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو مونا۔ اللہ نہ کرے کسی پر کوئی مشکل وقت آئے۔'' عامر نے بیوی کو دیکھ کر خفگی

بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ اللہ نہ کرے کسی پر مشکل وقت آئے۔'' مونا نے اس کا جملہ خود بھی دُہرایا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر لڑکی کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا اور وہ اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر بولی۔

''اگر میں کبھی آپ کو اپنے گھر بلاؤں تو کیا آپ آنا پسند کریں گی؟''

''تمہاری شادی میں آجاؤں گی۔'' مونا نے کہا۔

''وہ تو آپ دونوں کو لازمی آنا پڑے گا۔''

''سوری مس، ہم لوگ تقاریب میں کم کم ہی جاتے ہیں۔'' عامر نے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں کے آنے سے میری محفل کی خوب صورتی میں اضافہ جو ہو جائے گا۔'' اب عامر مونا کو دیکھ کر مسکرانے لگا اور مونا کھڑکی کے پاس آکر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے خیال میں بارش رک گئی ہے۔''

''ابھی رکی تو نہیں ہے مگر خاصی ہلکی ہوگئی ہے۔'' عامر نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''مگر ابھی صبح تو نہیں ہوئی ہے، رات کی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔'' یہ باتیں سن کر لڑکی قدرے پریشان ہوگئی۔

''محترمہ اب آپ اپنے گھر جا سکتی ہیں۔'' اچانک عامر لڑکی کے سامنے آکر بولا۔

''اس وقت نہ مجھے کوئی ٹیکسی ملے گی اور نہ ہی کوئی رکشا، میں کیسے اکیلے جاؤں؟'' لڑکی کا لہجہ پریشانی لیے ہوئے تھا۔

''محترمہ آپ نے کہا تھا کہ بارش رک جائے گی تو آپ چلی جائیں گی اور اب بارش تقریباً رک ہی چکی ہے۔'' عامر کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''سر آپ اگر برا نہ مانیں تو میں صبح تک آپ کے گھر میں رک جاؤں؟ میں رضائی لے کر لاؤنج میں جا کر لیٹ جاؤں گی۔'' لڑکی کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

''ٹھیک ہے، آپ لاؤنج میں چلی جائیں۔'' مونا نے کہا۔

''مگر میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔'' عامر نفی میں گردن ہلا رہا تھا اور مونا، عامر کا یہ نیا روپ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ تو بے حد نرم مزاج کا حامل شخص تھا یوں اچانک وہ ایک دم اکھڑ سا کیوں ہو گیا تھا۔ اس کا ایسا روپ اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ لڑکی گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''سر اس وقت میں تن تنہا کیسے جا سکتی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے ڈر لگے گا۔''

''محترمہ حقیقت یہ ہے، مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگے گی کہ کوئی جوان لڑکی اپنے گھر سے پوری رات یوں غائب رہے۔'' عامر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دے۔

''میں امی کو تو بتا دوں گی کہ بارش کی وجہ سے میں نہیں آپائی۔'' لڑکی اپنی بات اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی، وہ یکدم خوف زدہ سی ہوگئی تھی۔

''آپ اپنی بے گناہی کا ثبوت کس کس کو دیں گی۔ اس لیے پلیز آپ اسی وقت اپنے گھر چلی جائیں۔'' عامر کا لہجہ مزید سخت ہو گیا اس کی شکل سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس صورتِ حال سے بیزار ہو گیا ہو۔

''کیسے ظالم ہیں آپ، ایک لڑکی کو اپنے گھر سے اس طوفانی رات میں باہر نکال رہے ہیں۔'' لڑکی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''پریشان مت ہوں آپ...... اور نہ ہی رونے دھونے کی کوئی ضرورت ہے۔''

''روؤں نہیں تو پھر کیا کروں میں؟''

''میں اس ٹائپ کا شخص نہیں ہوں۔''

''مجھے کیا معلوم، میں کون سا آپ کو جانتی ہوں۔''

"محترمہ آپ کو میرا ڈرائیور آپ کے گھر تک چھوڑ آئے گا، اوکے۔" وہ جیسے زچ ہو کر بولا۔

"سر میں ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گی اکیلے، وہ بھی اتنی رات کو؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"یہ شریفوں کا گھر ہے، اس کے ملازم بھی بااعتبار ہیں۔ رستم خان آپ کو ابھی آپ کے گھر چھوڑ کر آئے گا۔"

"مگر مجھے ڈر تو لگ رہا ہے ناں!" اس کی سوئی بدستور ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"عامر میں نے آپ کو بتایا تو تھا رستم اور کریمن تو شام سے ہی چھٹی لے کر گئے ہوئے ہیں۔" مونا نے عامر کو جیسے یاد دلایا۔

"مگر یہ لڑکی اسی وقت اپنے گھر جائے گی اور ابھی جائے گی تاکہ ہم لوگ بھی اپنے گھر میں سکون سے آرام کرسکیں۔" عامر کے لہجے کا جلال بڑھ گیا تھا۔

"جی ٹھیک ہے، میں چلی جاتی ہوں۔ آپ لوگ یقیناً پریشان ہوگئے ہیں۔" لڑکی نے اپنے آنسو پونچھے۔

"ہاں ہوگئے ہیں پریشان!" عامر پھر چلّایا کہ مونا نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کوئی سخت جملہ کہہ دے۔ لڑکی شاپر میں اپنے گیلے کپڑے رکھنے دوسرے کمرے میں گئی تو مونا نے اپنے شوہر سے کہا۔

"عامر آپ جیسے معاملہ فہم پر مجھے ناز ہے۔ آپ نے بالکل صحیح اسٹیپ لیا ہے۔ حد ہوگئی صرف ایک بے وقوف لڑکی کی وجہ سے ہم دونوں کی پوری رات پریشانی میں گزری ہے۔" عامر کا موڈ تاحال آف تھا۔

"آپ جلدی سے اسے چھوڑ آئیں۔" مونا نے اسے آرام سے سمجھایا۔

"دل تو چاہ رہا ہے کہ اسے کسی کچرا کنڈی میں پھینک آؤں۔" عامر غصے میں تاحال بڑبڑا رہا تھا۔

لڑکی اپنا شاپر ہاتھ میں لے کر سہمی سہمی سی کھڑی تھی۔

"جانو تم اندر سے دروازہ لاک کرلو اور آرام کرو۔ میں چابی سے لاک کھول کر اندر آجاؤں گا۔" عامر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ مونا اندر آگئی اور اپنے بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔

"اچھا ہے لڑکی ابھی چلی گئی اگر وہ دوسرے کمرے میں جاکر سوجاتی تو پتا نہیں کب اٹھتی۔" بستر پر لیٹنے سے قبل اس کی نظر اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے جھمکے پر پڑی جو اس لڑکی نے نے اتار کر شاید وہاں رکھ دیا تھا۔ اس نے اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ ایمیٹیشن تھا کوئی زیادہ مہنگا بھی نہیں ہوگا مگر وہ اسے ہاتھ میں لے کر عقبی دروازے سے باہر نکلی کہ اگر عامر باہر نہ نکلا ہو تو وہ یہ جھمکے لڑکی کو واپس کردے۔ وہ ننگے پاؤں عقبی لان سے بکروں کے سروں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بیرونی لان کی طرف جو آئی تو ہنسنے کی آواز پر رک سی گئی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ عامر اس لڑکی سے محبت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"جھوٹی...... بہانہ بنا کر کیوں آئی؟"

"میں نے کہا تھا ناں میں آؤں گی...... تو دیکھو کیسے آگئی۔"

"تمہارے ایک کے بعد ایک ڈرامے دیکھ کر تو میرا سر ہی چکرا گیا تھا تانیہ۔" عامر ہنسا۔

"عامر تم نے کہا تھا ناں، میں تمہارے پروڈکشن ہاؤس کے ڈراموں میں کام نہیں کرسکتی اب بتاؤ کرسکتی ہوں یا نہیں؟" وہ زعم سے ہنسی۔

"جانو تم تو میری رانی ہو، تم ہر جگہ کام کرسکتی ہو تو میرے ڈراموں میں کیوں نہیں۔" اب عامر گنگنا رہا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنستے مسکراتے گاڑی میں بیٹھ کر جا رہے تھے اور مونا پتھر کی مورت بنی انہیں دیکھ رہی تھی۔

ناولٹ

انا کا سفر

ام مریم

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے مام؟" لیگ پیس بہت نفاست سے چھری کی مدد سے کاٹ کر کانٹے میں پھنسا کر اس نے منہ میں منتقل کیا تھا۔ وہ صرف طرحدار نہیں تھی، بہت اعلیٰ ذوق کی مالک اور کسی حد تک مغرور اور خود پسند بھی تھی۔ وہ خوب صورت تھی بلکہ بے حد خوب صورت تھی۔ جبھی ہر جگہ توصیف اور ستائش سے بھی نوازی جاتی۔ یہ تعریف وصول کرنا اس کی خوب صورتی کا حق تھا۔ یہ اس کا

قطعاً ذاتی خیال تھا۔ مغرور اور بے نیاز تھی جبھی اپنے آگے کسی کو نہ گردانتی مگر وہ شانزے تھی جو اس کے عشق میں مبتلا ہوگئی تھی اور کچھ اس طرح سے اس پر فدا ہوئی تھی کہ پھر اس عشق کا تھوڑا اثر اس کے اندر بھی منتقل ہوگیا تھا۔ شانزے کو یقین تھا یہ اس کی دعا کا نتیجہ تھا۔ جو قبولیت کی سند پا گئی تھی۔

ان کی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ دو سال ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ کی حیثیت سے گزرے تھے۔ شانزے کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا جبھی وہ روایتوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس صلہ مشہور و کامیاب صنعت کار کی بیٹی تھی۔ وہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ آفاق تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا، ڈیڈی صلہ کو بھی ہائر اسٹڈیز کے لیے ملک سے باہر بھیجنے کے خواہش مند تھے مگر وہ انوکھی ضد لگا کر بیٹھ گئی۔ ہاسٹل میں شانزے کے ساتھ رہنے کی ضد...... جسے کم از کم مام نے بالکل پسند نہیں کیا تھا۔ ایک عام سی لڑکی شانزے کے لیے اپنی بیٹی کا یوں دیوانہ ہو جانا انہیں کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ جبھی اس کی اس فرمائش کو سنتے ہی ان کی تیوریاں چڑھنے لگی تھیں۔

''حرج کیوں نہیں ہے، یہ ہمارا اسٹینڈرڈ نہیں ہے صلہ، کسی بھی لحاظ سے یہ بات تمہیں ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ ہمارے خواب بہت اونچے ہیں تمہارے لیے۔ تم اپنا برائٹ فیوچر چھوڑ کر ایک معمولی لڑکی کی خاطر دو سال ہاسٹل میں سڑنا چاہتی ہو۔ دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔'' ان کے لہجے میں ناگواری تھی۔ انہیں یہ بات اس قدر برہم کر چکی تھی کہ ہاتھ میں موجود اپنے پسندیدہ جوس کا گلاس انہوں نے زوردار آواز کے ساتھ ٹیبل پر دھر دیا تھا مگر سامنے ان کی بیٹی تھی۔ جس کے انداز سے تلخی د برہمی جھلکنے لگی تھی۔

''وہ معمولی لڑکی آپ کی بیٹی کی بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس کے اہم ہونے کی یہی سب سے اہم دلیل ہے اور ڈیڈ میں فی الحال صرف ہاسٹل جاؤں گی۔ ہاں بعد میں اگر مام چاہیں تو یو کے بھی چلی جاؤں گی مگر فی الحال ہاسٹل......'' اس کا انداز قطعی اور دو ٹوک تھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ کرسی دھکیل کر وہاں سے ایک جھٹکے سے چلی گئی۔ مما نے طیش بھرے انداز میں ڈیڈ کو دیکھا۔ ایسا طیش زدہ انداز جس سے بے بسی بھی چھلکتی تھی۔ گویا وہ ڈیڈ سے صلہ کے رویے کی شکایت کر رہی تھیں۔ وہ ماں، بیٹی کے اس جھگڑے میں ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی محض کاندھے اُچکا سکے تھے۔

☆☆☆

''آج ہم کالج سے واپسی پر سپر مارکیٹ چلیں گے۔'' کلاس بنک کر کے وہ دونوں اس وقت کینٹین میں تھیں۔ صلہ کے ہاتھ میں چیز برگر تھا ساتھ میں پیپسی کا ٹن پیک، شانزے بھی یہی کھا رہی تھی۔ اسے ہمیشہ ہی صلہ کو فالو کرنا اچھا لگتا تھا۔

''مارکیٹ...... اب کیا لینا ہے؟ ابھی کچھ دن پہلے تو مارکیٹ گئے تھے۔'' مارکیٹ کا سنتے ہی شانزے جز بز ہونے لگی جس کے جواب میں صلہ نے اسے گھورنا فرض سمجھا۔

''خبردار جو جانے سے انکار کیا ہو۔ میرے کزن کی شادی ہے۔ مجھے اپنے لہنگے کے ساتھ میچنگ جوتے چاہئیں۔ جیولری بھی لے لوں گی اور وہ تمہارا کھڑوس منگیتر ہر روز یہاں شہر کے وزٹ کو نہیں نکلا ہوتا جو باہر جانے کا سنتے ہی جان نکلنے لگتی ہے تمہاری۔'' وہ بلا جھجک اسے جھاڑنے لگی۔ شانزے کی کیا مجال تھی برا مان جاتی۔ منمنا کر کہا تو بس اتنا۔

''یار وہ پچھلی بار بھی انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔''

''ہاں تو...... کہا تو نہیں تھا ناں کچھ۔ الٹا تمہیں چائے پلوانے اور آئس کریم کھلانے کی آفرز دے رہا تھا۔ ویسے بڑی جھوٹی ہے تو شانزے۔ ہمیشہ تو اس کی بے حسی اور لاتعلقی کے رونے روتی رہتی ہے اور تب تو وہ......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ اسے گھورنے لگی۔ شانزے بری طرح سے جھینپی تھی۔

''رئیلی...... قسم سے یار۔ اس دن تو ان کے یکسر بدلے ہوئے انداز نے مجھے بھی کچھ کم حیران نہیں کیا۔ وہ تو وہاں حویلی میں بھی سامنا ہونے پر کبھی مجھ سے بات نہیں کرتے۔'' شانزے کے لہجے میں اب بھی حیرت نمایاں تھی۔ البتہ صلہ کے چہرے سے تنفر و نخوت جھلکنے لگی۔

''اچھی بھلی خوب صورت ہو تم۔ وہ خود ہے کیا جو اتنی بے نیازی برتتا ہے۔ اونہہ اجڈ، دیہاتی میں تو اب بھی کہتی ہوں صاف انکار کر دو اس سے شادی کرنے کے لیے۔'' صلہ کے پاس ایسے مفت کے مشورے وافر مقدار میں جمع رہا کرتے تھے۔

شانزے تڑپ سی گئی۔

''ایسے تو مت کہو صلہ ڈیئر، اتنا برا بھی نہیں ہے بے چارہ بلکہ مجھے تو اچھا ہی لگتا ہے۔'' اور صلہ نے اس آخری بات پر خصوصی طور پر نخوت زدہ انداز میں سر جھٹکا تھا۔ شانزے سے دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں بیتا تھا۔ تب اس کی پہلی بار بالکل اتفاقیہ حیدر سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ شانزے سے نوٹس لینے ہاسٹل آئی تھی۔ اس کے لیے نوٹس ہمیشہ شانزے ہی بنایا کرتی تھی۔ اس دن شانزے اپنے ساتھ فائل لانا بھول گئی تھی۔ تبھی صلہ کو اس کے ہمراہ ہاسٹل آنا پڑا تھا۔ نوٹس والی فائل لے کر وہ واپس آ رہی تھی کہ شانزے بھی اسے گیٹ تک خدا حافظ کہنے چلی آئی تھی حالانکہ کاریڈور سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی تو اسے اندر سے ہی رخصت کر دیا کرتی تھی مگر شانزے کی بوکھلاہٹ نے صلہ کو حیرانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

''کیا ہوا یار، جنگل میں شیر دیکھ لیا کیا؟'' اس نے مذاق اڑایا تھا۔ شانزے کی فق رنگت پر اس کی ہنسی نکل گئی تھی۔ اسے عادت تھی معمولی باتوں پر بھی حد سے زیادہ گھبرا جانے کی۔

''یہی سمجھ لو، شیر بھی خونخوار...... سامنے حیدر کھڑے ہیں۔ اب میری خیر نہیں ہے صلہ۔ انہیں میرا یوں بے مہار باہر آ نکلنا پسند نہیں۔'' شانزے نے سر پر اوڑھے دوپٹے کو اضطرابی کیفیت کے زیر اثر کھینچ کر پیشانی تک کیا۔ حیدر کے دیکھ لینے کے باعث وہ منظر سے غائب ہونے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی تھی البتہ خوف نے حالت ضرور پتلی کر دی تھی۔ صلہ کو اس کا یہی خوف غصہ دلا رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر گیٹ کے پار دیکھا۔ ہاسٹل کے آگے سبزے کی باڑھ تھی۔ اس کے پار کھڑ کھڑاتے لباس میں ملبوس گرے پجارو سے ٹیک لگائے بڑی بڑی مونچھوں والا دراز قد نوجوان کھڑا نظر آیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں یقیناً غصے کی ہی سرخی تھی۔ اونچا لمبا دیہاتی سا...... وہ شانزے کے منگیتر کی حیثیت سے صلہ کو ایک آنکھ نہیں بھا سکا۔ اس سے پہلے وہ شانزے کے پاس اس کی تصویریں بھی دیکھ چکی تھی۔ تب بھی اس نے ناک بھوں چڑھائی تھی اور بلا جھجک اسے منگنی ختم کرنے کا مشورہ بھی دے چکی تھی۔

''ہمارے ہاں اس طرح نہیں ہوتا صلہ۔ اگر بالفرض میں حیدر کو پسند نہ آتی اور وہ مجھ سے شادی نہ کرتے تب بھی مجھے عمر بھر انہی کے نام پر بیٹھنا تھا۔''

اس کی بات سن کر صلہ نے ان کی روایات پر بے حد تنقید کرتے ہوئے شانزے کو بھی کافی باتیں سنائی تھیں کہ وہ کنویں کی مینڈک ہے۔ جسے روایات عزیز ہیں اپنا مفاد نہیں وغیرہ وغیرہ۔ صلہ کو خود بھی یہ ساری باتیں یاد تھیں جبھی اس ٹکراؤ پر اس نے حیدر سے الجھنے کی خواہ مخواہ کوشش کی تھی بلکہ شانزے کے بقول اس سے پنگا لیا تھا۔

''تو آپ ہیں شانزے کے منگیتر؟'' وہ تلملاتے ہوئے جا کے اس کے سر پر سوار ہوئی تھی۔ انداز میں ناگواری و تمسخر کے ساتھ اپنی ذات کا زعم اور تکبر بھی شامل تھا۔ اس کا اعتماد ایسا قابل دید تھا کہ وہ سامنے والوں کے چھکے چھڑانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ حیدر نے چونک کر اور بھویں سکیڑ کر اسے بغور دیکھا تھا۔ بے حد فیشن زدہ لڑکی ہیر کٹ کیے

ہوئے ریشمی خوب صورت بال، بے تحاشا حسین اور تیکھے نقوش۔ پورے چہرے پر گویا حکمرانی کرتی ہوئی آنکھیں ......اور اس کی نظریں ایک مرد کی نظریں تھیں۔

’’ہاں...... آپ کو اعتراض ہے؟‘‘ حیدر کے لہجے میں مخصوص قسم کی رعونت اور بے نیازی تھی مگر صلہ کہاں خاطر میں لاتی۔ جبھی اس نے بے پناہ اعتماد کے ساتھ کندھے جھٹک دیے تھے۔

’’اگر میں کہوں مجھے اعتراض ہے تو کیا آپ شانزے سے اپنا موجودہ تعلق ختم کرلیں گے؟‘‘ اس کے سوال نے مخالف کو صرف ٹھٹکایا نہیں تھا...... اس کی آنکھیں بھی دہکا کے رکھ دی تھیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ عورت اپنے دائرے سے باہر نکلے تو پھر نقصان کا خمیازہ اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ حیدر کے جواب نے یہی واضح کیا تھا۔

’’تو میں کہوں گا نہیں...... صرف یہی نہیں بلکہ میں اس گستاخی کی سزا کے طور پر آپ سے بھی شادی کروں گا اور آپ کو اعتراض کا بھی حق نہیں دوں گا۔‘‘ جواب تھا کہ طمانچہ...... صلہ تو جیسے ہل کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اس عزت افزائی پر دہک کر انگارہ ہوگئی تھیں۔

’’شٹ یور ماؤتھ...... مسٹر حیدر تم ہو کیا چیز؟ کبھی آئینے میں صورت دیکھی ہے اپنی۔‘‘ وہ پھٹ پڑی تھی اور لڑنے مرنے کو تیار بھی۔ اس کے برعکس شانزے ہراساں اور متوحش تھی پھر بڑی مشکل سے وہ صلہ کو کھینچ تان کر وہاں سے لے گئی اور گھنٹوں کے حساب سے منت ترلے کرکے اسے منایا تھا۔

’’جاہل، اِل مینرڈ، گھٹیا انسان۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے آخر؟‘‘ وہ سلگتی اور چیختی رہی تھی۔

’’تمہیں انہیں کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا صلہ۔‘‘ شانزے کے چہرے پر بے بسی اور بے چارگی تھی۔ ابھی حیدر سے اسے پتا نہیں کیا کچھ سننے کو ملنا تھا۔

’’تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے اس منحوس کے منہ لگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ڈیم اٹ۔‘‘ غصے سے کہتی صلہ نے تو وہ بات وہ معاملہ وہاں ختم کردیا تھا مگر حیدر ہضم نہیں کرسکا تھا، اس بات کا اندازہ صلہ کو بہت بعد میں جاکر ہوا تھا۔

☆☆☆

حالانکہ اگلی ہی ملاقات میں جو خالصتاً اتفاقی تھی۔ حیدر اپنے روّیے کی بہت شائستگی سے معذرت کرچکا تھا۔ اس بار ان کا ٹکراؤ مارکیٹ میں ہوا تھا۔ وہ شانزے کو زبردستی ساتھ لیے ونڈو شاپنگ کرتی پھر رہی تھی۔ جب ایک دکان سے نکلتے ہوئے اس کا حیدر سے تصادم ہوگیا۔ یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ صلہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا.... شاپنگ بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پیروں میں جاگرا مگر حواس ٹھکانے آنے کے بعد اسے روبرو پاتے ہی وہ مشتعل نظر آنے لگی۔

’’تم......؟‘‘ وہ آنکھیں نکال کر جس طرح غرائی تھی سب سے زیادہ شانزے گھبرائی تھی۔

’’آئی ایم سوری فار دیٹ میم۔‘‘ حیدر نے بے اختیار دفاعی ومفاہمتی انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے پھر خوش اخلاقی کے ریکارڈ توڑتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

’’کیسی ہیں آپ؟‘‘ اس بدمزاجی کے جواب میں اس کا سامان اٹھا کر بڑے عاجزانہ انداز میں اسے پیش کرتے ہوئے وہ کتنے رسان سے کہہ رہا تھا۔ صلہ نے اپنے بیگز جھپٹے اور شانزے کا ہاتھ پکڑ کر برہم انداز میں اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ وہ اتنی خفا تھی کہ اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

’’شانزے آپ اپنی ڈیئر فرینڈ سے میری سفارش کردیں ناں پلیز۔‘‘ حیدر نے انہیں چند قدموں میں ہی جالیا تھا اور اتنی لجاجت سے بولا تھا کہ شانزے تو گنگ ہونے لگی کیونکہ جانتی تھی کہ عاجزی و انکساری بھی اس کا مزاج نہیں رہی تھی البتہ صلہ کے

چہرے پر شدید ناگواری کے آثار تھے۔

’’دیکھیں مسٹر خواہ مخواہ چپک جانے والے لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔‘‘ اس نے جتانا ضروری خیال کیا مگر وہ شرمندہ نہیں ہوا۔

’’مگر میری مجبوری ہے۔ آپ سے بگاڑ نہیں سکتا۔‘‘ سر کھجا کر وہ یکسر بدلے ہوئے انداز میں بے بسی سمو کر بولا تو صلہ نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔

’’مجبوری اور وہ بھی آپ کی؟‘‘ اس کا لہجہ سراسر طنز آمیز تھا۔ حیدر نے جواب میں قہقہہ لگایا۔

’’یار سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں......‘‘

’’مگر میں شانزے کی بہن نہیں جسٹ فرینڈ ہوں۔‘‘ اس نے تصحیح کی تو حیدر نے بے پروائی سے کاندھے جھٹک دیے تھے۔

’’جو بھی ہیں میرے لیے بہت اہم ہیں۔‘‘

’’کون شانزے؟‘‘ صلہ کے انداز میں خفیف سی شرارت تھی۔ بہرحال وہ کسی بات کے پیچھے پڑنے کی قائل نہیں تھی۔ جواب میں حیدر کی آنکھوں میں عجیب سی تپش اتر آئی تھی۔

’’اس سوال کے جواب کو میں کسی خاص وقت کے لیے اٹھا کر رکھتا ہوں۔‘‘ اس کی مسکراہٹ بھی عجیب تھی جسے صلہ نے سمجھا اور جانا ہی نہیں بلکہ کوشش ہی نہیں کی شاید وہ فطرتاً بے پروا اور بے نیاز تھی حالانکہ ایک عورت کو بے پروائی وبے نیازی اکثر معاملات میں سوٹ نہیں کرتی۔ اس کے لیے یہ شدید نقصان کا باعث بنتی ہے۔

’’چلیں، بیگم سے رونمائی کے وقت کہہ دیجیے گا۔‘‘ وہ اسی بے پروا انداز میں ہنسی۔

’’آپ کا حکم سرآنکھوں پر۔‘‘ حیدر نے نہایت فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے سر تسلیم خم کردیا تھا۔ یوں وہ تلخی اور چپقلش ختم ہوگئی جس کا آغاز پہلی ملاقات میں ہوا تھا۔ حیدر انہیں کافی پینے یا آئس کریم کھانے پر زور ڈال رہا تھا مگر صلہ پر عجلت سوار تھی۔

’’ڈیوڑھی آپ پر...... اور سنیں آپ اگر یہ اپنی بھاری بھرکم مونچھیں کٹوا دیں تو کچھ بھلے لگیں گے یقیناً۔‘‘ جاتے جاتے بھی وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔ دوستی اور بے تکلفی کے لیے اس کے نزدیک مرد، عورت کی تخصیص نہیں تھی۔ یہ اس کے ماحول کا بھی اثر تھا اور ذہن کی خرابی بھی مگر اسلام میں اللہ نے کچھ حد بندیاں قائم کی ہیں جنہیں پھلانگنے والے نافرمان کہلاتے ہیں اور قابلِ گرفت ٹھہرتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

☆☆☆

اگلی ملاقات میں جب اس نے حیدر کو مونچھوں کے بغیر دیکھا تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی پھر زور سے ہنس کر شرارت آمیز انداز میں بولی۔

’’ارے واہ، آپ تو ماشاءاللہ بڑے فرمانبردار شوہر ثابت ہونے والے ہیں۔‘‘ جواب میں حیدر کی نگاہوں کی مردانگی کے مخصوص بے باک انداز نے اسے بہت تفصیلاً دیکھا تھا۔

’’تو پھر غور کرلیں ناں جلدی سے۔‘‘

’’یہ تو شانزے کا کام ہے۔ میں تو اسے اب بھی سمجھاتی ہوں کہ کرلے غور مگر بے چاری مشرقی لڑکی ایک ہی کھونٹے سے بندھی رہنا چاہتی ہے۔‘‘ وہ حیدر کی ذومعنی بات کو سمجھے بغیر اپنی ہانکے گئی جبکہ شانزے اس کے جتنی بے وقوف نہیں تھی جبھی اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا تھا۔ حیدر نے بھی ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ شاید نہیں یقیناً اسے صلہ کی آخری بات نے ناگواری بخشی تھی۔

’’ان گرمیوں کی چھٹیوں میں آپ شانزے کے ساتھ ہمارے ہاں آکر ٹھہریں۔‘‘ حیدر نے اسے خاصی تاخیر سے مخاطب کیا تھا مگر صلہ کے چہرے پر تمسخر پھیل گیا تھا۔

’’آپ کے گاؤں ...... مرنہ جاؤں گی میں وہاں اتنی گرمی میں۔ چھٹیوں میں تو ہم ہمیشہ یوکے جاتے ہیں۔ اب بھی وہیں کا ارادہ ہے۔‘‘

''ہماری حویلی میں بھی ہر قسم کی سہولتیں ہیں۔ چلیں زیادہ نہ سہی چند دنوں کو تو آئیں ناں۔'' وہ اصرار کیے گیا اور صلہ نے مروتاً حامی بھر لی۔

☆☆☆

''مجھے لگتا ہے حیدر سے اب تمہاری دوستی ہوگئی ہے پھر اب کیا حرج ہے اس بات کے بارے میں؟''

اس نے اپنی ضد پوری کی تھی اور شانزے کی خاطر اپنے گھر کے عیش و آرام چھوڑ کر شانزے کے پاس ہاسٹل میں شفٹ ہوگئی تھی۔ شانزے کی خوشی کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا مگر حیدر کے ساتھ اس کی یہ صلح بھی اسے کچھ کم سرشار نہیں کر رہی تھی۔

''دوستی کہاں یار۔ میں تو تمہاری وجہ سے اس گھونچو کا کچھ لحاظ کرتی ہوں ورنہ پسند و ناپسند تو وہ مجھے اب بھی نہیں ہے بلکہ میری آفر اب بھی برقرار ہے۔ کر دو انکار...... اپنے بے حد اسمارٹ اینڈ ہینڈسم بھائی کے لیے تمہارا رشتہ مانگ لوں گی۔'' اس کے لہجے میں صرف شرارت نہیں تھی سچائی کا بھی رنگ غالب تھا۔ جن دنوں ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ ان کی ایک دوسرے سے محبت و یگانگت کے مظاہروں کی بدولت ان کی ایک کلاس فیلو نے ازراہِ مذاق وہ بات کہی تھی جسے بعد میں شانزے نے دل پر لکھ لیا تھا۔

''یار ثنا کی بات قابلِ غور ہے۔ میں سوچ رہی ہوں ہم ایک ہی آدمی سے شادی کرلیں تاکہ ہمیں کوئی ایک دوسرے سے الگ نہ کرسکے۔'' شانزے کی سنجیدگی سے کی گئی بات کے جواب میں وہ اتنا جھلائی تھی کہ ہاتھ میں موجود بھاری بھرکم کتاب اس کے سر پر دے ماری تھی۔

''بکومت یہ بات محض مذاق کی حد تک ہی ٹھیک تھی۔ شوہر شیئر کرنے کی چیز نہیں ہوتا۔''

''کیوں نہیں ہوتا؟ مرد کی اسلام میں ایویں ہی چار شادیوں کی اجازت ہے۔'' وہ چمک کر بولی تو صلہ نے اسے گھورا اور بات ختم کرنی چاہی۔

''وہ اعلیٰ ظرف عورتیں ہوں گی۔''

''اور تمہارے معاملے میں، میں بہت اعلیٰ ظرف ہوں۔'' شانزے نے شرارتی مسکراہٹ سمیت کہا تو صلہ اسے آنکھیں دکھانے لگی مگر وہ پروا کیے بغیر اپنے سوٹ کیس سے تصویروں کا البم نکال لائی۔

''یار تم ایک نظر حیدر کو دیکھو تو۔ ہمارے گاؤں کی ساری لڑکیاں اس گبرو جوان پر مرتی ہیں۔'' اور جب اس گبرو جوان کی صلہ نے تصویر دیکھی تو کیسے بدک گئی تھی۔

''اس پر گاؤں کی لڑکیاں ہی مر سکتی ہیں۔ میں شہر کی طرحدار اعلیٰ چوائس رکھنے والی لڑکی ہوں۔ خبردار جو آئندہ تم نے اتنی فضول بات کی ہو تو...... اگر اتنا ہی میرے ساتھ رہنے کا شوق ہے تو اپنے پینڈو کو گڈ بائے کہہ دو۔ ریئلی میں اپنے بھائی کے لیے لے آؤں گی تمہیں۔'' اب کے وہ سنجیدہ تھی جبکہ شانزے کا منہ لٹک گیا تھا۔

''تمہیں حیدر کے غصے کا پتا نہیں ہے، جان سے تو مار سکتا ہے مجھے مگر کسی اور کا نہیں ہونے دے سکتا پھر یار اس کا فائدہ بھی تو نہیں ہے نا کوئی...... میرا مقصد تمہارے ساتھ رہنا ہے تمہارے گھر نہیں کیونکہ تم تو بعد میں سسرال سدھار جاؤ گی۔''

''چلو تمہاری خاطر میں شہریار کو گھر داماد بننے پر فورس کروں گی۔ بہت پسند کرتا ہے مجھے...... شاید مان جائے میری یہ بات۔'' وہ کھلکھلائی تھی اور اپنے کزن کا حوالہ دیا جس سے اس کی نسبت تقریباً طے تھی۔

''اگر میرے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو تو پھر گھر کے بجائے دل میں گنجائش نکالو میری جان...... شہریار کو مجھ سے شیئر کرلو۔ میں تمہاری خاطر گھر سے بھاگ آئی ہوں۔'' شانزے اب بھی مذاق نہیں کر رہی تھی۔ اس کی سنجیدگی نے ہی صلہ کو گمبھیر سنجیدگی میں مبتلا کیا تھا بلکہ اس کی ساری چونچالی اور مذاق دھرا رہ گیا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے بے حد

خفگی سے دیکھا۔

''تم اس قدر فضول بات بھی کرسکتی ہو شانزے، آئی کانٹ بلیو اٹ۔'' اور شانزے کی تو جان ہی اس کی ناراضی کے آگے ہوا ہونے لگتی تھی جبھی اس وقت بھی ٹپٹا گئی تھی۔

''میں مذاق کر رہی تھی یار، ریلیکس۔''

''مجھے ایسا مذاق بھی نہیں پسند۔ تمہارے دل میں یہ گنجائش ہو تو ہو میرے دل میں نہیں ہے۔'' اس نے بے حد سختی سے کہا تھا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''اُف اتنا یونیک اور اسٹائلش ڈریس کہاں سے لیا؟'' صلہ کالج سے لوٹی تو شانزے کے بستر پر پڑی وہ شرٹ اٹھا کر دیکھتے ہوئے ستائش اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ بلیک علاقائی ڈریس تھا جس پر شوخ رنگوں کے دھاگوں سے بہت خوب صورت کڑھائی کی گئی تھی۔ پورے کرتے پر ننھے ننھے شیشوں کا جال پھیلا تھا۔ جو ہلکی سی جنبش پر بھی جگمگاہٹ بکھیرتا تھا اور یہی اس لباس کی خوب صورتی تھی۔

''اماں نے بھیجا ہے، آج ہی حیدر دے کر گئے ہیں۔'' شانزے آج طبیعت کی خرابی کے باعث کالج نہیں گئی تھی۔

''تو یوں کہو نا منگیتر صاحب تحفہ لائے تھے۔'' وہ آنکھیں نچا کر بولی تو شانزے نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''لائے تو وہی تھے مگر بھیجا ہوا اماں کا ہے۔ حیدر کو تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ اس شاپر میں ہوگا کیا۔ ویسے تمہارا بالخصوص پوچھ رہے تھے۔'' شانزے نے خاص طور پر جتایا جسے صلہ نے اپنے دھیان میں محسوس نہیں کیا تھا۔

''سنو فیئر ویل پارٹی میں یہی ڈریس پہن رہی ہوں، اوکے؟'' صلہ بولی۔

''اتنا پسند آیا ہے تمہیں صلہ تو تم ہی رکھ لو یار، یہ دیکھو میچنگ چپل بھی ہے۔'' شانزے نے دوسرا شاپنگ بیگ اٹھایا اور جوتے کا ڈبا... کھول کر ویسی ہی رنگین دھاگوں کی کڑھائی سے مزین نازک سی لیدر چپل سامنے کی جو سوٹ سے میچ کر رہی تھی۔ صلہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''واؤ...... امیزنگ یار سو بیوٹی فل۔'' اس نے فوری طور پر اپنے جوتے کے اسٹریپ کھول کر اپنا دودھیا سفید مخمل جیسا نرم گداز پیر خوشنما چپل میں اٹکایا چپل جیسے ایک دم انمول ہوگئی۔

''زبردست...... صلہ مجھے تو لگ رہا ہے یہ بنائی ہی تمہارے لیے گئی ہے۔ دیکھو کتنا جچ رہی ہے تمہیں۔'' شانزے نے دل سے تعریف کی تھی وہ بے ساختہ کھلکھلائی۔

''اپنے پاس رکھو یار اسے۔ میں بس ایک بار ہی پہنوں گی۔'' شانزے کو دونوں چیزیں اس کی الماری میں رکھتے دیکھ کر اس نے بے اختیار ٹوکا تھا۔

''نہیں، اب یہ تمہاری ہوئیں۔'' وہ مسکرادی۔

''اتنی فراخ دلی اچھی نہیں ہوتی شانزے ڈارلنگ۔'' صلہ نے نصیحت کرنا ضروری خیال کیا۔

''میں صرف تمہارے معاملے میں فراخ دل ہوں۔ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ تم مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔'' شانزے کے مان و یقین پر صلہ نے کندھے اچکا دیے تھے۔

☆☆☆

ان کے ایگزامز ختم ہوئے تو چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ اسی روز حیدر آن دھمکا تھا۔

''میں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں۔'' وہ شاید صلہ سے ہی مخاطب تھا۔ صلہ جزبز ہوئی۔

''لیکن میں تو آپ کو منع کرچکی ہوں۔'' اس نے صاف انکار کردیا۔

''یہ تو نہیں ہونا چاہیے، آپ ہمیں میزبانی کا شرف تو بخشیں۔ یقین کریں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔'' پھر یہ بحث طول پکڑنے لگی تھی جس

سے عاجز ہو کر صلہ نے یہ کہہ کر حامی بھرلی تھی کہ ممی سے بات کروں گی۔ جس کی اس نے فراخدلی سے اجازت دے دی۔

"ہاں تو آپ کرلیں بات آنٹی سے...... چاہیں تو شانزے کو بھی ساتھ لے جائیں اپنے گھر۔ میں شام میں آپ دونوں کو پک کرلوں گا۔" وہ بہت اطمینان بھرے انداز میں کہہ کر چلا گیا جبکہ وہ جھنجلا کر رہ گئی۔

"یار تمہارا فیانسی بھی عجیب لسوڑا آدمی ہے۔ جان کو آجاتا ہے قسم سے۔" اور شانزے کچھ کہے بغیر بس دانت نکالتی رہی... پھر گھر آنے پر مام سے ایک بار پھر زوردار بحث ہوئی تھی۔ وہ ہرگز بھی اسے یکسر غیر اور انجان لوگوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھیں اور وہ محض شانزے کی وجہ سے بحث کیے جارہی تھی۔

"شازی بھی تو ہمارے گھر آتی ہے ناں۔"

"وہ گھنٹے دو گھنٹے کو آتی ہے۔ تم راتوں اور دنوں کو جاؤ گی۔ کوئی تک نہیں ہے یہ۔"

"کیوں تک نہیں ہے؟ ویسے تو آپ بہت لبرل بنتی ہیں۔ مجھے اسٹڈی کے لیے تنہا یوکے بھیج سکتی ہیں۔ یہاں اپنی فرینڈ کے گھر نہیں، وائے؟" اسے واقعی غصہ آنے لگا تھا خواہ مخواہ کی فضول ضد سے۔

"یہ ایک یکسر مختلف بات ہے پھر وہ لڑکا تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ فیانسی کی فرینڈ سے اسے بھلا کیا لینا دینا؟" ممی نے اپنے اعتراض کی اصل وجہ بالآخر بیان کردی اور صلہ نے جیسے سر پیٹ لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا اسے اصل بات ممی کو نہیں بتانی چاہیے تھی۔

"میں حیدر کی وجہ سے نہیں، شانزے کی خاطر جارہی ہوں، مائنڈ اٹ۔" وہ تلملانے لگی۔

"تم ہاسٹل شانزے کے ساتھ ہی اتنا عرصہ رہی ہو۔ اب یہ چونچلے ختم کرو، مجھے بالکل پسند نہیں۔" ممی نے جھڑک دیا تھا اور وہ غصے میں آگئی۔

"مجھے ہر صورت جانا ہے ممی...... میں بتارہی ہوں۔ ڈیڈ سے میں نے بات کرلی ہے۔ انہیں بہرحال آپ کی طرح خواہ مخواہ اعتراض نہیں ہے۔" پیر پٹخ کر کہتی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہاں شانزے اس کی وارڈ روب کھولے اس کے کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھی۔ گویا اس کی تیاری میں مصروف تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"مل گئی اجازت؟"

"اجازت ہی اجازت ہے یار ڈونٹ وری۔" اس نے اپنا موڈ بحال کرلیا۔ وہ شانزے پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ممی آمادہ نہیں تھیں۔ اس نے شانزے پر ہمیشہ اپنی فیملی کا تاثر براڈ مائنڈڈ لوگوں کا ڈالا ہوا تھا اور یہ سچ بھی تھا۔ اس کے خیال میں کبھی کبھار ممی پر ہی دقیانوسیت کا دورہ پڑجاتا تھا، وہ بھی صرف اس کے معاملے میں۔ ایسے میں وہ ضد میں آکر ہر وہ کام لازمی کیا کرتی تھی۔ وہ بھی کسی نفع نقصان کے احساس سے بے نیاز ہو کر۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ فضا پرندوں کے پروں کی کاٹ سے بوجھل تھی۔ دور کہیں سے کولہو کے چلنے کی یاسیت آمیز آواز بھی فضا میں گونجتی تھی۔ ماحول میں حبس تھا اور چہار سو غبار پھیلا ہوا تھا۔ یہ تینوں اگلے دن سہ پہر کے وقت حویلی پہنچے تھے۔ یہ حویلی ویسی نہیں تھی جیسے صلہ کے تصور میں آباد تھی۔ بڑے بڑے دالانوں اور برآمدوں والی...... جس کی دیواریں سنگ مرمر کی تو رنگین شیشوں کی بڑی بڑی کھڑکیاں۔ یہ عام سی حویلی تھی البتہ صحن بہت وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور یہاں درختوں کی بہتات تھی۔ ہر قسم کے درخت جن کے پتے صحن کے فرش پر اڑتے پھرتے تھے۔ جنہیں ایک ملازمہ لمبے جھاڑو کی مدد سے وقفے وقفے سے سمیٹتی مگر ہوا کا ایک زوردار جھونکا پھر سے آنگن کو خشک پتوں سے بھرجاتا۔ انہی درختوں کے نیچے چند چارپائیاں بچھی تھیں جن پر حویلی کی بزرگ خواتین براجمان تھیں جو

روایتی ریشمی کپڑوں اور زیورات سے لدی پھندی نہیں تھیں۔ ان کے ملبوسات موسم کی مناسبت سے تھے۔ ایک شانزے کی والدہ اور دوسری تائی ماں یعنی حیدر کی اماں تھیں۔ دو جوان لڑکیاں تھیں جن کا تعارف حیدر اور شانزے کی بھابیوں کے طور پر سامنے آیا تھا۔ موسمی پھلوں کے ٹوکرے وہاں موجود تھے اور بھابیاں اپنی نگرانی میں یہ پھل دھلوا کر اندر فریج میں رکھوارہی تھیں۔ بزرگ خواتین اچار ڈالنے کا اہتمام کررہی تھیں۔ شانزے کے ساتھ صلہ کا بھی والہانہ استقبال ہوا تھا۔

"تیری شہرن سہیلی واقعی بہت سوہنی ہے شازی، میم ہے بالکل۔" تائی ماں نے خاص طور پر صلہ کو گلے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کیا تھا۔ ان کے سادہ اور پُرخلوص انداز کے باوجود صلہ کو ان کا یہ ملنے کا اجڈ طریقہ گراں گزرا تھا۔

"ایویں تو میں اس کی اتنی تعریفیں نہیں کرتی تھی تائی ماں۔ یونہی عاشق نہیں ہوگئی اس پر بالکل شہزادی لگتی ہے ناں!" جواب میں شانزے کا جوش دیکھنے لائق تھا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں اور مجھے بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔" جب تائی ماں کے بعد شانزے کی اماں نے اور بھابیوں نے بھی اسے گلے لگا کر پیار کیا تو وہ بیزاری سے کہتی شانزے کے قریب ہوئی تھی۔ یہ بھی یہاں سے جان بخشی کرانے کا اِک بہانہ تھا جسے سمجھ کر شانزے کھسیا سی گئی۔

"سوری یار...... آؤ اندر چلتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ وہاں سے لے گئی۔

"چائے پیوگی یا شربت بنوالوں؟" اسے کمرے میں لا کر شانزے نے پنکھا اور اے سی ایک ساتھ چلادیا۔

"شربت...... نو...... تم چائے بنواؤ، میں جب تک باتھ لے لوں۔" وہ اپنے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔ نہا کر باہر آئی تو کمرے میں شانزے نہیں تھی۔ نیم تاریک کمرا اور اے سی کی کولنگ...... اس کے اندر سکون اترنے لگا۔ سوئچ بورڈ کے نزدیک آکر اس نے کچھ بٹن دبائے تو کمرا روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ اس نے بال تولیے کی قید سے آزاد کرکے جھٹکے سے پشت پر گرائے اور ہیئر برش اٹھالیا۔ تب ہی ہلکی سی تھپتھپاہٹ دروازے پر ہوئی تھی۔

"آجاؤ بھئی، تمہیں اجازت کی بھلا کیا ضرورت۔" اس نے بال سلجھاتے ہوئے حیرانی سے کہا مگر اصل حیرانی اسے اس وقت ہوئی جب شانزے کے بجائے حیدر نے اندر قدم رکھا۔

"جی میرا بھی یہی خیال ہے مگر......" صلہ نے اسے گھور کر اور تنبیہہ کرتی نظروں سے دیکھا۔

"میں سمجھی شانزے ہے اور آپ کو اجازت کی ضرورت بھی اس وقت نہیں ہوگی جب اس کمرے میں میرے بجائے صرف شانزے ہوگی۔" اس نے گویا جتایا تھا۔ حیدر عجیب سے انداز میں مسکرایا اور اس کا سوٹ کیس سائڈ پر رکھ دیا۔

"میرے لیے تو شانزے اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔" صلہ نے دیکھا اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی مگر اسے تو حیدر کے بدلے ہوئے انداز، لہجے اور نظروں نے جھلسا کے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟" وہ بھڑک اٹھی۔ حیدر نے جواباً اسے عجیب نظر سے دیکھا۔

"غصہ کیوں کرتی ہیں مادام، اس سے آپ یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتی ہیں کہ آپ میرے لیے شانزے کی طرح قابلِ احترام ہیں۔ بات کا سیدھا مطلب نکال لیں پھر کہیں گی غلطی ہماری ہے۔" وہ شرم، خفت اور سُبکی سے منجمد ہوگئی تھی۔ حیدر اس پر اِک طنزیہ نگاہ ڈال کر جاچکا تھا۔

☆☆☆

اگلے دو دن وہ اسے نظر نہیں آسکا۔ صلہ نے اس بات کو بھی زیادہ حواس پر سوار نہیں کیا وجہ اس کی فطری بے پروائی ہی نہیں شانزے کی فیملی کا بے

حد محبت آمیز رویہ تھا۔ وہ اس محبت بھرے ماحول میں کسی حد تک مگن ہوگئی تھی۔ اسی شام اس نے آنگن کی دھلائی کرتی ملازمہ کے ہاتھ سے پانی کا پائپ پکڑتے ہوئے شانزے کے لتّے لینے شروع کیے تھے۔

"تم مجھے یہاں اس لیے لے کر آئی تھیں کہ یہاں اپنی حویلی میں لاکر قید کردو۔ تم نے اپنے پنڈ کی سیر نہیں کرائی مجھے۔ میں آج ہی واپس جارہی ہوں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے پائپ کا رخ اس کی طرف کیا تھا اور پانی کی موٹی دھار نے شانزے کو بھگو دیا۔ شانزے تو جھٹ پرے ہٹ گئی مگر اسی پل اچانک آجانے والا حیدر اس زد میں آیا اور سرتاپا بھیگ گیا۔ صلہ نے ایک دم بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو کر پائپ پھینک کر خفت سے اسے دیکھا۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس اوکے اور جاکر تیار ہوجائیں۔ میں آپ کو کھیتوں اور باغات کی سیر کروالاتا ہوں۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ رکے بغیر چلا گیا تھا۔ شانزے نے متحیر نظروں سے اپنے کمرے کی جانب جاتے حیدر اور پھر صلہ کو دیکھا تھا۔

"دیکھو کتنا بدل گئے ہیں یہ...... میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں اگر تمہاری جگہ یہ حرکت مجھ سے سرزد ہوئی ہوتی تو پھر کتنا ذلیل کرتے یہ مجھے۔" وہ صلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حیرت بھرے انداز میں بولی۔

"مہمان کو اتنی گنجائش تو ملنی ہی چاہیے۔" صلہ صرف یہی کہہ پائی۔

"وجہ صرف یہی نہیں ہے سوئٹ ہارٹ۔" شانزے نے آنکھیں نچائی تھیں۔ صلہ چونک اٹھی۔

"مطلب؟"

"مطلب جو بندہ کسی لڑکی کی سرسری سی فرمائش پر مونچھیں کٹوادے جبکہ وہ مونچھ نہیں تو کچھ نہیں کی کہاوت پر عمل بھی کرتا ہو پھر ناک پر غصہ دھرا رہنے کے باوجود اس لڑکی کی بدتمیزی کو فراخ دلی سے معاف کردے اور اس کی گستاخانہ حرکت یعنی پانی سے شرابور کردینے کے باوجود پنڈ گھمانے کی آفر کرے تو اس کے دل میں کچھ تو کالا ہوگا ناں......!"

وہ مسکراہٹ دبائے ہوئے تھی۔ صلہ نے پہلے اس کا ہاتھ جھٹکا پھر اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"شیم آن یو شانزی وہ بندہ تمہارا فیانسی ہے اور......"

"اور کچھ نہیں...... جاکے تیار ہوجاؤ۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا کہہ گئے ہیں۔" شانزے نے اسے کمرے کی جانب دھکیلا تو وہ ایک دم حیرانی سے پلٹ آئی تھی۔

"کیا مطلب...... تم ساتھ نہیں چلوگی؟"

"نہیں، ہمارے ہاں کھلے عام لڑکیوں کا یوں پھرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔" جواب شانزے کے بجائے حیدر نے دیا تھا۔ وہ کپڑے بدل کر آگیا تھا۔ بالوں کی نمی تازہ غسل کی گواہ تھی۔ صلہ کی پیشانی پر ایک دم شکنیں پڑتی چلی گئیں۔

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں حیدر صاحب کہ شانزے کی آپ کی نظر میں عزت ہے اور میری......"

"دیکھیں مس صلہ، میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ یہ میری عزت کا ہی ثبوت ہے کہ میں آپ سے......"

"ہاں بولیں، کیا ثبوت ہے میری عزت کا آپ کے نزدیک؟" صلہ نے ایک، ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔ حیدر نے اک نظر شانزے کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر ٹھہراؤ تھا مگر آنکھوں میں بے چینی و اضطراب نمایاں تھا۔ اسے یقیناً ان دونوں کا متوقع زوردار جھگڑا خائف کررہا تھا۔

"شانزے تم جاؤ، اماں بلارہی ہیں تمہیں۔" شانزے چونکی پھر کچھ کہے بغیر تیزی سے پلٹ گئی۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کریں گی اس عزت کو قبول؟" حیدر اب اطمینان بھرے انداز میں اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی لو دیتی آنکھیں اس کے وجود پر تھیں۔ صلہ کے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر ہونق نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے سنجیدہ پاکر وہ جیسے غصے سے ابل پڑی تھی۔

"واٹ نان سینس حیدر صاحب...... میں پوچھتی ہوں یہ کیا بیہودگی ہے؟"

"یہ غصہ کیوں آرہا ہے آپ کو صلہ میڈم؟ شادی کی خواہش کوئی ناجائز تو نہیں ہے۔" اسے حلق کے بل چیختا پاکر بھی وہ اسی سکون سے بولا تھا جس انداز میں اس نے صلہ سے بات کی تھی وہ کچھ اور تلملائی۔

"اگر آپ شانزے کے فیانسی نہ ہوتے تو اس بدتمیزی پر میں آپ کا سر پھاڑ دیتی۔" صلہ نے پھنکارزدہ آواز میں کہا۔ غم و غصے کی زیادتی سے وہ سرخ ہورہی تھی۔

"چلیں اسی تعلق کے صدقے کچھ اور عنایت کیجیے یعنی شادی کی عنایت......" وہ مسکراہٹ دبائے اس کے کبیدہ خاطر تاثرات سے گویا حظ اٹھارہا تھا۔ کچن سے نکل کر چھوٹی بھابی اسی سمت آرہی تھیں۔ اسے تو شاید پروا بھی نہ ہوتی مگر صلہ کچھ اور خائف نظر آنے لگی اور ہونٹ بھینچے تیزی سے مڑ کر اپنے کمرے میں جاگھسی مگر اس کے بعد بھی بہت دیر تک وہ شدید طیش کی کیفیت میں مٹھیاں بھینچ کر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

"لیکن تمہیں ہوا کیا ہے آخر، اتنا غصہ......؟"

وہ آناً فاناً جانے کو تیار ہوئی تھی۔ شانزے کی منت سماجت بھی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکی تھی۔ اس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ شانزے بوکھلائی جارہی تھی۔

"کچھ تو بتاؤ صلہ، یہاں کسی کی کوئی بات بری لگی ہے تمہیں؟" شانزے اب واقعی رو دینے کو تھی۔

"میں تمہیں بتادوں گی شانزے مگر پلیز...

فی الحال مجھے یہاں سے جانے دو۔" اس نے آخری سوٹ بھی بیگ میں رکھ کر زپ بند کی۔

"ٹھیک ہے، میں تائی ماں سے کہتی ہوں، حیدر چھوڑ آئیں گے تمہیں۔" شانزے کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھی تو شانزے کی مجال نہیں تھی اصرار کرکے زورزبردستی سے اگلوالیتی۔ اس پر کب شانزے کا زور چلا تھا۔ وہ تو ہمیشہ صلہ کی مرضی کے مطابق ہی سر جھکاتی آئی تھی۔ اس کی محبت نے ہمیشہ اسے اس لڑکی کے آگے سرنگوں رکھا تھا۔ یہی ان کے ساتھ اور دوستی کے قائم رہنے کی وجہ تھی۔ ورنہ صلہ کے مزاج کی حاکمیت کب کا اسے شانزے سے دور لے جاچکی ہوتی۔ وہ خود پسند تھی اور صرف خود سے پیار کرنے اور خود کو اہمیت دینے کی قائل تھی اور بس۔

"نہیں، مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا۔ میں ممی کو کال کرتی ہوں ڈرائیور بھیج دیں گی۔" وہ اپنا سیل فون اٹھا کر بٹن پش کرنے لگی۔

"اچھا میں اماں کو بتادوں کہ تم جارہی ہو۔" وہ پژمردہ سی باہر نکل گئی۔ صلہ کا رابطہ نہیں ہو پارہا تھا ممی سے جبھی وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ یہاں گاؤں میں سگنلز کے بہت پرابلم تھے۔ کمرے سے نکلتے ہی پہلا ٹکراؤ حیدر سے ہوگیا۔

"تو مجھ سے ڈر کر بھاگ رہی ہیں آپ...... حالانکہ بظاہر ایسی بزدل تو نہیں لگتیں۔" اس کا لمبا چوڑا وجود صلہ کے آگے دیوار بن گیا تھا۔ جبھی اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں۔

"راستہ چھوڑو میرا۔" صلہ کو جتنا غصہ آیا تھا وہ اس لحاظ سے تلخ ہوئی۔

"اگر میں کہوں تمہارا ہر راستہ مجھ پر آکر ختم ہوتا ہے تو پھر؟" اس کی آنکھوں میں اپنی ذات کا زعم تھا۔ صلہ کا جیسے اس بات نے دماغ خراب کرکے رکھ دیا۔

"اپنی بکواس بند کرو سمجھے اور یہ ڈائیلاگ اپنے معیار کی کسی لڑکی سے بولنا...... میرا اسٹینڈرڈ اتنا گھٹیا

نہیں ہے۔'' غیظ و غضب سے سرخ چہرہ لیے جو اس کے منہ میں آیا وہ بولتی چلی گئی کہ اس کی بات نے مشتعل ہی ایسا کیا تھا۔ اس دوران حیدر کے چہرے نے کتنے رنگ بدلے تھے۔ سارے رنگ توہین و ہتکی کے احساس کے تھے جو یقیناً خطرے کی علامت تھے۔

''بہت غرور ہے تمہیں خود پر...... اس غرور کو اگر میں نے خاک میں نہ ملایا تو حیدر نہ کہنا۔'' بھنچے ہوئے سرد لہجے میں کہتا وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ صلہ نے حقارت بھرے انداز میں سر کو یوں جھٹکا جیسے اس کی دھمکی کو جوتے کی نوک پر رکھا ہو۔

☆☆☆

یہ اس کا حد سے بڑھا ہوا ضرورت سے زیادہ اعتماد ہی تھا کہ وہ محض حیدر پہ کچھ جتانے کی خاطر ہی وہاں پر رک گئی تھی۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ بزدل ہے نہ خائف اور یہ اس کی غلطی تھی۔ عورت چاہے جتنی بھی پُر اعتماد، مضبوط ہو مگر حیدر جیسے شیطان صفت مرد اپنے ناپاک ارادوں سے اسے زیر کر دیتے ہیں۔ وہ نادان تھی جو اس بات کو نہیں سمجھ سکی یا پھر اسے اپنی عقل پر ناز تھا۔

''تھینک گاڈ، تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ورنہ میں اتنی ہرٹ ہو رہی تھی قسم سے۔'' اسے اطمینان آمیز انداز میں پلنگ پر بیٹھ کر پاؤں جُھلاتے اور تربوز کھاتے دیکھ کر شانزے خوشی سے کہہ رہی تھی۔ صلہ نے سر جھٹکا۔

''تمہیں پتا ہے شہرام کی بسم اللہ کی تقریب دو دن بعد ہے۔ میں چاہتی تھی تم اس میں ضرور شریک ہو۔''

''ہاں تو ہوں گی ناں، ڈونٹ وری۔ ویسے بھی میں تمہیں خفا کر کے جانا نہیں چاہتی تھی۔'' وہ اطمینان سے مسکرا کر بولی۔ اس نے حیدر پر کچھ جتانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس میں اور شانزے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شانزے کے ساتھ کھیتوں اور باغات میں جا کر حیدر کو نیچا دکھانا مقصود تھا۔

''او کے فائن، تم رکو میں ابھی اماں سے پوچھ کر آتی ہوں پھر چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے حیدر کہیں باہر گئے ہیں، یہ وقت مناسب ہے۔'' شانزے یقیناً اس کی ناراضی کے خیال سے خائف تھی جبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ صلہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

''تم مجھے کیا نقصان پہنچاؤ گے حیدر۔ تمہاری دُکھتی رگ تو میرے ہاتھ میں ہے۔'' وہ مطمئن تھی، نہیں جانتی تھی چوہے بلی کے اس کھیل میں جیت کس کی ہوئی ہے، اگلے چند لمحوں میں دروازے پر دستک ہوئی اور ملازمہ نے اندر جھانکا تھا۔

''بی بی صاحبہ، آپ کو شانزے بی بی بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں چادر اوڑھ کر خاموشی سے آئیں۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔'' اس کا انداز سرگوشی سے مشابہ تھا۔ صلہ کو حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی شانزے اب گھر والوں کی مرضی کے بغیر خاص طور پر حیدر سے چھپ کر اسے باہر لے کر جائے گی۔ وہ اٹھی اور اپنا دوپٹا کھول کر ذرا سلیقے سے اوڑھ لیا۔ مختلف راہ داریوں سے ہوتی وہ دونوں حویلی کے پچھواڑے باغ میں آئی تھیں۔ جس کے اطراف چار دیواری اتنی بلند تھی کہ گویا حدیں آسمان کو چھوتی محسوس ہوتی تھیں۔ دھول مٹی میں اٹے پیپل، سنبل اور صنوبر کے لاتعداد درخت ساکن کھڑے تھے۔ خشک پتوں کے ڈھیر جمع تھے جو اُن کے پیروں تلے چرمراہٹ کی آواز نکالتے اپنا وجود کھو رہے تھے۔

''آپ جائیں، سڑک کے دوسری جانب کالی گاڑی کھڑی ہے۔ بی بی وہیں آپ کی منتظر ہیں۔'' ملازمہ نے لکڑی کے سال خوردہ پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھول کر اسے باہر نکل جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر سرگوشی میں ہدایت دی۔ صلہ نے محض سر ہلایا اور اسی اعتماد سے پُر انداز میں قدموں کو آگے بڑھا دیا۔ ملازمہ کی بتائی ہوئی بلیک مرسڈیز واقعی سڑک کے پرلی جانب بوہڑ کے درخت کے نیچے موجود تھی۔

''یار اتنی رازداری...... اُف مجھے تو قسم سے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کو نکلی ہوں۔'' دروازہ کھول کر وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی جواب میں خاموشی تھی۔ گاڑی کا ماحول پُرسکون، نیم تاریک اور اے سی کولنگ کے باعث بے حد ٹھنڈک آمیز تھا۔ کچھ وہ کڑی دھوپ اور چلچلاتی تیز روشنی سے آئی تھی جبھی فوری طور پر صورتِ حال سمجھنے سے قاصر رہی مگر اس وقت اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے جب اس نے اپنے مقابل شانزے کے بجائے حیدر کے لمبے تڑنگے وجود کو براجمان دیکھا تھا۔

''اس میں ہرگز بھی کوئی شک نہیں، آپ بلاشبہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر ہی جا رہی ہیں۔'' وہ اس کی طرح سکتہ زدہ تھا نہ اس کے لیے یہ صورتِ حال غیر متوقع تھی جبھی اسی اطمینان بھرے انداز میں کہتے اس کا گال چھوا تو جیسے صلہ کا یہ سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ نہ صرف بدک کر فاصلے پر ہوئی بلکہ بپھرے ہوئے انداز میں اسے زور سے پیچھے کی جانب دھکیلا تھا۔

''تم نے چیٹ کیا ہے مجھے۔ کہاں لے جا رہے ہو، کس طرح؟'' وہ بدحواس تو تھی ہی ساتھ میں روہانسی بھی ہو گئی۔ صورتِ حال کی گمبھیرتا اس کے اوسان خطا کر چکی تھی۔

''گھبراتی کیوں ہو بولڈ لڑکی۔ تمہیں جہاں بھی لے جا رہا ہوں کچھ وقت اکٹھے گزار کر واپس لے آؤں گا۔ ڈونٹ وری کسی کو پتا نہیں چلے گا۔'' اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔ صلہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے خوف سے پھٹی پھٹی نظروں میں غیر یقینی لیے حیدر کو دیکھا۔

''تم میرے ساتھ اس طرح نہیں کر سکتے۔'' وہ خوف کی شدت سے کانپنے لگی۔ حیدر طنز سے مسکرایا۔

''میں تمہارے ساتھ ایسا کر چکا ہوں۔ باقی کے ارادے بھی پورے کر لوں گا، تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔'' اس کے لہجے میں صرف زعم و نخوت نہیں... نفرت بھی تھی۔ صلہ کو پہلی بار اپنا آپ اتنا کمزور اور بے بس محسوس ہوا تو ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں دروازے کی جانب سرکی تھی مگر حیدر اس سے غافل نہیں تھا۔ جبھی اسے بہت بے دردی اور جارحانہ انداز میں اپنی جانب کھینچا کہ وہ پوری نہیں تو کسی حد تک ضرور اس کی گود میں سما گئی تھی۔

''دروازہ کھول کر باہر کودنا چاہتی ہو۔ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی تمہاری۔ یہ شوق پورا کر لینا واپسی پر ابھی تو تمہاری بڑی ضرورت ہے۔'' وہ اس کے بالوں میں منہ دے کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت میں نہ کوئی نرمی تھی نہ گنجائش۔ صلہ کی جان پر بن آئی جو اس وقت اس کی پوزیشن تھی وہ اس قدر آکورڈ تھی کہ اسے ہتکی کے احساس سے رونا آنے لگا۔ جبھی ایک بار پھر اپنے وجود کی پوری طاقت صرف کر کے اس کی گرفت سے نکلنے کو پھڑپھڑائی تھی۔ حیدر کو اس پر یک دم غصہ آیا تھا۔

''اگر تم انسان نہیں بنیں تو میں یہیں ڈرائیور کی

آہ لبنیٰ عروج

پاکیزہ کی معروف مصنفہ لبنیٰ عروج نے پاکیزہ کے لیے بہت کچھ لکھا ان کی ہر کہانی دل کو چھو لیتی تھی۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر نہیں دیکھا تم نے
اے مجھے صبر کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا وہ منظر نہیں دیکھا تم نے

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

موجودگی کی پروا کیے بغیر تم سے بدتمیزی شروع کردوں گا۔ جو تمہاری بولڈنیس کے باوجود تمہیں یقیناً اچھا نہیں لگے گا۔ بہتر ہے فضول حرکتیں بند کرو۔'' وہ بولا نہیں تھا پھنکارا تھا۔ صلہ بےبسی اور ذلت کے ساتھ شرم سے بھی کٹ مری تھی۔ آنسوؤں نے اس کے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا۔ بےچارگی کی اس کیفیت میں وہ صرف پھڑپھڑا کر رہ گئی تھی۔

''مجھے چھوڑ دو، میں باہر کودنے کی کوشش نہیں کروں گی۔'' اس نے بہ مشکل گلے سے آواز برآمد کی تھی۔ حیدر نے کچھ کہے بغیر اپنے ہاتھ ہٹالیے۔ وہ سرعت سے فاصلے پر ہوئی اور اپنا رخ بدل کر آنسوؤں کو بہنے دیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اسے نہیں خبر تھی گاڑی کتنی دیر یونہی فراٹے بھرتی دوڑتی رہی۔ وہ تو بس سراسیمہ سی خود پر بیت جانے والی اس قیامت پر لرزاں و پریشان تھی۔ معاً گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ اس نے چونک کر کھڑکی کے پار نگاہ کی۔ یہ ایک ویران مگر سرسبز علاقہ تھا۔ فضا میں درختوں کے پتوں کی ہوا سے ہلنے کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دروازہ کھٹاک کی آواز سے کھلا تو صلہ نے وحشت زدہ نظروں کو اٹھا کر حیدر کا چہرہ دیکھا جہاں کوئی رحم اور نرمی کی گنجائش نہیں تھی۔

''باہر آؤ۔'' اس کا لہجہ بھی اس کے چہرے کے تاثر کی طرح کرخت تھا۔ وہ اِک دم جیسے بےجان سی ہوگئی۔

''مجھے معاف کردو حیدر...... مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، مجھے اعتراف ہے۔'' اس کے ارادوں کی سفاکی کا خیال اس کا سارا طنطنہ ساتھ بہا لے گیا تھا۔ وہ باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی۔ حیدر نے تنفر سے بھری نگاہ لیے اس بےبس لڑکی کو دیکھا۔

''ارے...... ارے میرے قدموں میں کیوں بیٹھ رہی ہو، تمہارا معیار اتنا پست نہیں ہونا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ صلہ کا دل ہر لحظہ دھڑکنیں گم کر رہا تھا۔

''پلیز حیدر معافی مانگ رہی ہوں ناں۔'' وہ بےاختیار سسک اٹھی تھی...... بےبسی سے، لاچاری سے...... جب وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر فارم ہاؤس کے اندرونی کمرے میں سے ایک میں لے آیا تھا اور صلہ کی مزاحمت اس کے آگے حقیر تنکے کی حیثیت سے بھی کم ثابت ہوئی تھی۔

''لفظ معافی میری لغت میں نہیں ہے صلہ بیگم۔ سو کیا کروں تمہارے غرور کا سر نیچا کیے بغیر مجھے سکون نہیں ملے گا۔ یاد کرو تمہیں عزت راس نہیں آئی تھی۔ اب یہ ذلت تمہیں سمجھائے گی اچھائی اور برائی کے فرق کو۔'' وہ اسے بستر پر اچھالتے ہوئے غرّا اٹھا تھا۔

''تم ایسا مت کرو حیدر...... میں بہت شرمندہ ہوں اور وعدہ کرتی ہوں آئندہ کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ مجھے اب یہاں سے جانے دو۔'' اب کے وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔ اسے حیدر کی آنکھوں میں رحم کی کوئی رمق نظر نہیں آرہی تھی۔ صحیح معنوں میں اس کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

''تمہیں یہاں سے جانا ہی ہے۔ ساری عمر میں تمہیں اپنے پاس رکھ بھی نہیں سکتا۔ اتنی پسند بھی نہیں ہو تم مجھے۔'' وہ تضحیک آمیز انداز میں بولا اور جن نظروں سے اسے دیکھا تھا صلہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

''میں خودکشی کرلوں گی حیدر...... تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا یہ سب کرنے کا۔'' کوئی بس نہ چلتا دیکھ کر وہ غم و غصے کی زیادتی سے چیخنے لگی۔

''ہاں تو کرلینا خودکشی، مجھے کیا فرق پڑتا ہے بلکہ جو کچھ تمہارے ساتھ ابھی ہوگا اس کے بعد تمہیں خودکشی ہی کرنی چاہیے۔'' اس کی بےحسی اور سفاکی کے مظاہرے نے صلہ کو سن کردیا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔

''تم شادی کرنا چاہتے تھے ناں مجھ سے حیدر، کرلو شادی لیکن اس طرح مجھے میری نظروں میں نہ

گراؤ۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔'' اپنی بات کہہ کر وہ اس وحشت سے روئی تھی کہ حیدر اسے دیکھتا رہ گیا۔ صاف لگتا تھا اس نے عزت کی حفاظت کی خاطر اپنی پسند، اپنی زندگی، اپنی خواہشات سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہو۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔

☆☆☆

''السلام علیکم!'' وہ کمرے میں اندھیرا کیے تکیے میں منہ گھسیڑے ساکن پڑی تھی۔ شانزے کی آواز سن کر ایک بار پھر خائف سی ہوگئی۔ حیدر سے نکاح کے بعد وہ شانزے کے سامنے خود کو بوجھل، دل گرفتہ اور مجرم محسوس کرتی تھی۔ نکاح کے بعد وہ ایک دم کیسے پینترا بدل گیا تھا۔ طیش، اشتعال اور غصے کی جگہ سرشاری، ترنگ اور فاتحانہ خمار نے لے لی تھی۔

''تھینک گاڈ تم نے اللہ کا واسطہ مجھے شادی کرنے کے لیے دیا۔ واپس چھوڑ آنے کو نہیں۔'' وہ کتنا ہنسا تھا یہ بات کہہ کر اور صلہ پہلے ہونق ہوئی تھی پھر اسے جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے اسی غصے میں آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تھا۔

''تم ہوتے کون ہو اس طرح میرے جذبات سے کھیلنے والے؟'' وہ بپھری اٹھی تھی۔ جواباً حیدر پھر سے سرد مہر ہوگیا۔

''اپنے آپ کو قابو میں رکھنا سیکھو صلہ۔ تمہاری انہی حرکتوں کی وجہ سے آج تمہیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ شکر ادا کرو کہ میں گھٹیا اور کمزور نفس انسان نہیں ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو جیسا تم مجھے کہہ کر طیش دلاتی رہی ہو تو اس وقت تمہاری حیثیت میری منکوحہ کے بجائے داشتہ کی ہوتی۔ آئندہ مجھ سے کوئی بھی فضول بات کرنے سے قبل ہزار بار سوچنا ضرور ورنہ نقصان کی ذمّے دار تم خود ہوگی۔'' صلہ کو لگا تھا الفاظ کے سنگ ریزوں نے اس کا وجود لہولہان کردیا ہو۔ سارے راستے وہ گم صم رہی تھی۔ حویلی ان کی واپسی شام ڈھلے ہوئی تھی۔ صورتِ حال کو بھی حیدر نے ہی سنبھالا۔

''سنبھالو اپنی سہیلی...... دیکھ لو صحیح سالم ہیں محترمہ۔ گاؤں کی سیر کا شوق اتنی شدت سے چُرایا جبھی اکیلے نکل کھڑی ہوئی، وہ تو شکر کرو بھٹک گئیں تو میرے ہاتھ ہی لگیں ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔'' اسے پریشان حال متفکر خواتین کے سپرد کرکے وہ خود اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا مگر اس کا آخری فقرہ تمام تر ذومعنویت اور تلخی سمیت صلہ کے وجود میں نیزہ بن کر پیوست ہوگیا تھا۔ احساس صرف زیاں و ملال کا ہی تو نہیں تھا۔ شرمندگی و بےبسی بھی جان لیوا تھی۔ اسے اب یہ پچھتاوا آن لگا تھا اس نے خود سے آخر حیدر کو شادی کا کیوں کہا۔ عزت سے بچاؤ کا صرف یہی راستہ تو نہیں تھا۔ وہ جان دے کر بھی عزت محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اس طرح تو گویا اس نے خود کو اور ذلیل کرلیا تھا۔ ایسی جان لیوا صورتِ حال سے گزرنے کے بعد بھی اس کی اکڑ کا وہی عالم تھا۔ وہ حیدر کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کے خیال میں وہ تھا بھی نہیں اس قابل کہ اس جیسی حسین، طرح دار شہری لڑکی کو ڈیزرو کرتا۔ صلہ ہرگز بھی اس کمپرومائز پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ چاہتی تو وہاں سے اب بھی جاسکتی تھی مگر وہ شاید احمق تھی اور خود کو اب بھی بہت کچھ سمجھنے کی حماقت میں مبتلا تھی۔ جبھی وہاں رہ کر حیدر کا مقابلہ کرنا اور اس سے مستقل جان چھڑانا چاہتی تھی مگر کیسے...... یہی اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاؤں، بخار تو اب قدرے ہلکا ہے۔'' شانزے نے اس کا ماتھا چھوا اور نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ صلہ گہری سانس بھر کے اٹھ بیٹھی۔

''میں ٹھیک ہوں شانزے، تم اتنا پریشان کیوں ہورہی ہو؟'' وہ بات بھلے اس سے کررہی تھی مگر اس سے نظریں نہیں ملاسکی۔ وہ اب اس وقت تک اس سے نظریں ملا بھی نہیں سکتی تھی جب تک

حیدر سے وہ یہ نام نہاد تعلق توڑ نہیں لیتی۔

"پریشان کیوں نہ ہوں، تم بستر سنبھال کے ایسے پڑ گئی ہو جیسے یہاں بیمار ہونے کو ہی تو آئی تھیں۔ یار کل شیری کی بسم اللہ ہے۔"

"اوہ...... یار میں ٹھیک ہوں اور تمہارے بھتیجے کی تقریب میں پوری سج دھج سے شریک ہوں گی، ڈونٹ وری۔"

"جی مگر دھیان رہے، سج دھج آپ نے اپنی رخصتی کے لیے کرنی ہے اس پر صرف ہمارا حق ہونا چاہیے۔" اس وقت حیدر دروازہ کھول کر اندر آیا تھا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا لہجہ گو کہ سرگوشی سے مشابہ تھا اس کے باوجود صلہ نے سراسیمہ ہو کے کچھ فاصلے پر موجود شانزے کو اس خوف سے دیکھا کہیں وہ سن تو نہیں چکی۔

"میں تمہارے لیے چائے کے ساتھ کچھ لاتی ہوں صلہ! تم کچھ کھاؤ گی تو ہی دوا لے سکو گی۔" شانزے ہمیشہ کی طرح سادہ، پُرخلوص اور مہربان تھی۔ صلہ نے محض سر ہلا دیا۔ وہ اس وقت اگر حیدر سے بات نہ کرنا چاہ رہی ہوتی تو لازمی شانزے کو اپنے پاس روک کے رکھتی۔

"کہاں غائب تھے تم، مت بھولو کہ میں تم سے اس طرح اپنا مطالبہ پورا نہیں کراؤں گی سمجھے۔" وہ زور سے پھنکاری تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم بھی میری طرح بے چین ہو تو کروالیں پھر رخصتی...... تم نے بڑی زیادتی کی صرف نکاح پر ٹرخا کر۔" اس کی آنکھوں میں کتنی چمک اور شوخی اِک ساتھ در آئی تھی۔ صلہ کو اس سے بے تحاشا گھن محسوس ہوئی۔

"اپنی شکل دیکھی ہے کبھی تم نے جو اتنی فضول باتیں سوچ رہے ہو۔ طلاق چاہیے مجھے تم سے۔ وہاں سچوئشن اتنی نازک تھی کہ مجھے مجبوراً یہ طوق گلے میں پہننا پڑا۔ اسے میں عمر بھر کا روگ نہیں بنانا چاہتی۔" اس کے لہجے کا تکبر، غرور اور نخوت ایک بار پھر وہی تھا بلکہ اس سے بھی سوا تر۔ حیدر کا چہرہ توہین اور ہتک سے سرخ ہوا تھا۔ کچھ دیر اس نے لہو رنگ دہکتی ہوئی آنکھوں سے صلہ کو دیکھا تھا پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ صلہ ہونٹ بھینچے بیٹھی تھی۔ اسے احساس نہیں تھا وہ اپنے لیے مزید مشکلات سمیٹ رہی ہے۔

☆☆☆

"میں تمہارا مطالبہ پورا کر دوں گا، رات دس بجے چھت پر آجانا وہیں انتظار کروں گا تمہارا۔" یہ شام کا وقت تھا جب صلہ کے سیل نے حیدر کا ٹیکسٹ وصول کیا۔ آج بسم اللہ کی تقریب تھی اور پوری حویلی برقی قمقموں سے روشن ہو چکی تھی۔ تقریب کا اہتمام اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ مہمان اتنے تھے کہ اتنی بڑی حویلی میں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ صلہ نے شانزے کی بے حد منت سماجت کے نتیجے میں اپنا وہی سلور لہنگا پہنا تھا جو اس نے اپنی کزن کی شادی کے لیے بنوایا تھا۔ ساتھ میں میچنگ سلور جیولری۔ وہ صحیح معنوں میں چمکیلی پری یا پھر اپسرا لگ رہی تھی۔ کھلے بال کندھوں سے پھسل کر کمر...... پر آرہے تھے۔ دمکتی پیشانی پر بندیا لشکارے مار رہی تھی۔ اس تیاری اس آرائش میں جی جان اس لیے بھی صرف کی تھی کہ وہ حیدر کو جتانا چاہتی تھی، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس جیسی چاندنی جیسا سراپا اور حسن رکھنے والی لڑکی حیدر جیسے عام مرد کا نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ بہرحال وہ اتنا خوش نصیب نہیں تھا اور یہ بات وہ اسے کچن میں جتا بھی چکی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان دونوں کا سامنا اس وقت وہاں ہو گیا تھا جب حیدر چائے کی طلب میں وہاں آیا تھا اور صلہ شانزے کی ہدایت پر فریج سے گجرے اٹھانے کو فریج کا دروازہ کھولے گجروں کا پیکٹ نکال رہی تھی۔

آہٹ پر بے ساختہ وہ مڑی تو حیدر تھا...... مبہوت اور گنگ سا اسے دیکھتا ہوا۔ صلہ کے چہرے پر زعم

اور فاتحانہ مسکان بکھر گئی۔

"تم حسین ہو میں جانتا تھا مگر اتنی حسین ہو گی مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔" اپنی بے خودی پر قدرے قابو پا کر وہ کچھ کھسیا کر بولا تھا، صلہ آہستگی سے کھنکھاری۔

"اچھا ہوا تمہیں اندازہ ہو گیا۔ اب فیصلہ کرنے میں اور بھی آسانی ہو گی۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کون سا فیصلہ؟" وہ حیران نظر آنے لگا جبکہ صلہ کی نظروں کی تلخی اور تپش ایک ساتھ بڑھی۔

"طلاق مانگی تھی میں نے تم سے، یاد ہے؟"

"میں ایسی فضول باتوں پر کان نہیں دھرا کرتا۔" حیدر کا خوشگوار موڈ غارت ہوا تھا۔ جبھی زہر خند لہجے میں بولا۔

"میری بات سنو۔" وہ پلٹ کر وہاں سے جا رہا تھا کہ صلہ نے کاٹ دار انداز میں پکار کر ٹوکا۔

"ہاں بولو۔" حیدر کی نظروں میں اس ناگواری کا تاثر ہنوز موجود تھا۔

"تم نے مجھے دیکھا ناں، جان بھی لیا کہ میں کس درجہ حسین ہوں۔ اب تمہیں چاہیے کہ خود کو دیکھو اور جان بھی لو کہ تم خود کیا ہو۔ کیا ایبنالائز کرتے ہو کہ میرے جیسی لڑکی تمہاری بنا دی جائے؟" اس کے لہجے میں واضح حقارت تھی۔ حیدر کا چہرہ یکایک دہک اٹھا۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتا رہا تھا پھر آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

"تم ایک بار پھر اپنی حد بھول رہی ہو۔ میں تمہیں بتا دوں کہ تم میری بن چکی ہو۔ تمہاری یہ اکڑ میری نرمی تک محدود ہے۔ مجھے سختی پر مت اکساؤ صلہ صاحبہ...... ورنہ کچھ اور بھی پچھتاؤ گی۔"

کچن کے باہر آہٹ ہوئی تھی۔ حیدر زور سے چونکا پھر اسے چھوڑ کر پلٹا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ صلہ سنبھل نہیں سکی۔ کچن کے دروازے پر بھابی کھڑی تھیں۔ اسی کی جانب حیرانی اور کسی حد تک مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی طرح داری تو حیدر ہی اڑا چکا تھا رہی سہی کسر بھابی کی نظروں نے نکال دی۔

"مم...... میں یہ گجرے...... شانزے کے لیے......"

"صرف گجرے ہی نہیں یہاں موجود ہر شے، ہر رشتہ شانزے کا ہی ہے صلہ بیگم، سو بی کیئر فل۔" بھابی کی صرف نظریں ہی نہیں لہجہ اور الفاظ بھی اسے جھلسا گئے۔ وہ وہاں سے نکلی تو اس کے چہرے پر خفت ہی خفت تھی۔

"اونہہ پتا نہیں کس زعم میں ہیں یہ محترمہ۔ انہیں کیا پتا میں تو جان چھڑا رہی ہوں اس خبیث سے۔" وہ کتنی دیر تک ان کے جملے سے جھلستی رہی۔

☆☆☆

بسم اللہ کے بعد فوراً کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کے دوران ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چل سکا۔ صلہ سے تو ویسے بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ اس کے زعم اور خود اعتمادی کو حیدر نے ایسی ٹھوکر لگائی تھی کہ وہ ابھی تک لرزیدہ تھی۔ صلہ حقیقتاً اس سے خائف ہو چکی تھی۔

"آج رات دس بجے...... اور دس بجنے میں اب صرف پندرہ منٹ ہیں۔ اگر تم نہ آئیں تو انجام کی تمام تر ذمے داری تمہاری ہو گی۔" حیدر جانے کس کونے سے نکل کر آیا تھا اور اس کے پاس سے گزرتے ہوئے گویا یاددہانی کروائی۔ صلہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے خائف نظروں سے پہلے اسے پھر اپنے اطراف میں دیکھا تھا۔ ہر سو گہما گہمی تھی اگر کوئی ان کی سمت متوجہ بھی تھا تو سرسری انداز میں۔ وہ قدرے ریلیکس ہو گئی اور ہاتھ میں پکڑی پلیٹ رکھ دی۔ سب لوگ اپنے اپنے طور پر مصروف تھے۔ وہ گہری سانس بھرتی وہاں سے ہٹ کر زینے کی طرف آئی۔ زینے کی گرل برقی قمقموں اور گیندے کی لڑیوں سے آراستہ تھی۔ اوپر چڑھتے ہوئے اس کا پیروں کو چھوتا لہنگا بار بار جوتوں تلے آکر اسے لڑکھڑا کے رکھ جاتا۔ اس نے احتیاطاً لہنگے

کو آگے سے پکڑ کر تھوڑا سا اوپر اٹھا لیا۔ اس جانب اس پل ہُو کا عالم تھا۔ اسے اس سناٹے میں اپنے دل کی دھڑکنیں بہ خوبی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا دل اس کے لباس کی طرح اس کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر یوں تنہا حیدر کے پاس جانے سے روکتا رہا مگر اس کے قدم نہیں رکے تھے۔ وہ ہر قیمت پر یہ آگ کا دریا پار کر لینا چاہتی تھی۔ وہ ہر صورت اس کے تسلط سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ چھت سنسان تھی اور رات بے حد تاریک۔ سرخ اینٹوں کے فرش پر منڈیروں پر جلتے چراغوں کی روشنی کا غبار پھیلا ہوا تھا جو آرائش کی غرض سے سجائے گئے تھے۔ حیدر کا دور تک پتا نہیں تھا البتہ شمالی دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے وہیں آ کر ٹک گئی۔ چند لمحے اس کا انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے اپنا سیل فون نکال کر حیدر کو ٹیکسٹ بھیجا۔

''کہاں ہو تم؟ میں چھت پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' سیل فون رکھ کر وہ تھکے ہوئے انداز میں وہیں نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھیں اس پل شدید جلن سمیٹ لائی تھیں۔ دیوار سے کوئی سایہ سا اترا وہ اتنی غافل تھی کہ اسے کوئی آہٹ کوئی خبر تک نہیں ہو سکی کہ حیدر اس کے اس قدر قریب آ گیا۔ اس خاموش اور حسین رات میں وہ اپنے ساحرانہ حُسن کے ساتھ اس کے بے حد نزدیک تھی اتنی کہ وہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر اسے بہ آسانی چھو لیتا۔ وہ جسے پانے، جسے چھونے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ جائز ناجائز کے فرق کو بھلا کر بس اسے حاصل کرنے کی جستجو میں لگ گیا تھا۔ معاً وہ چونک گیا صلہ کی بند آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ ایک دم سے اضطراب کا شکار ہو کر ہاتھ بڑھا کر اس نمی کو سمیٹنے لگا۔

''تم رو رہی ہو؟'' صلہ اس کا لمس پاتے ہی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول چکی تھی۔ اسے روبرو بلکہ اتنے قریب پا کر ایک جھٹکے سے اٹھنا چاہتی تھی کہ حیدر نے اپنا بازو اس کے اوپر رکھ کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

''کیوں رو رہی تھیں تم؟'' دل کی کیفیات کے برعکس اس کا لہجہ بظاہر سخت تھا۔

''تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تم وہ بات کرو جس کے لیے تم نے یہاں بلایا ہے مجھے۔'' اس کا ہاتھ بے حد غصے سے جھٹکتی صلہ اٹھ کر فاصلے پر جا کھڑی ہوئی۔

''میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھنے اور پیار کرنے کے لیے بلایا تھا۔ غلطی ہوئی یہ جگہ مناسب نہیں چلو اب بیڈ روم میں چلتے ہیں۔'' وہ شروع سے اب تک جان بوجھ کر اسے تلملاہٹ دلاتا اور پھر اس کے ہراس زدہ چہرے کو دیکھ کر حظ اٹھایا کرتا۔ اس وقت بھی اس کا مقصد یہی تھا مگر صلہ پر اس پل الٹا اثر ہوا اس قدر ذہنی اذیت اور تناؤ کا شکار تھی کہ سوچے سمجھے بغیر اس پر حملہ آور ہو گئی۔

''بکواس بند کرو سمجھے۔ اپنی زبان سے مت پھرو مردانگی کا کچھ تو لحاظ کرو اگر تم میں شرم ہے تو۔'' حیدر نے اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے تک پہنچنے سے پہلے قابو کر لیا تھا پھر ایک زوردار جھٹکا اس انداز میں دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر لے جا کر ایک ہاتھ میں پکڑے دوسرے سے اس کا چہرہ جکڑ لیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ تم پر اثر کیوں نہیں ہوتا اور طلاق کا لفظ اگر دوبارہ تمہاری زبان پر آیا تو میں اس زبان کو ہی کاٹ کر پھینک دوں گا۔ نکاح میں نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ تمہارے کہنے پر ختم کر دوں۔'' صلہ کی سانسیں رک گئی تھیں اور آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھیل سی گئیں۔ اس کی پوزیشن اس وقت نازک تھی وہ واقعی اس پل مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی۔ یہ حیدر نے اپنے ہر عمل سے اسے جتا دیا تھا۔

''میں اگر چاہوں تو یہاں سے اپنے کمرے میں لے جا سکتا ہوں کسی کو خبر بھی نہیں ہو گی اور تم...... تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ مجھے روک سکو۔'' وہ اسے جھٹکتے ہوئے گویا ایک بار پھر اس پر اس کی اوقات واضح کر رہا تھا۔ صلہ لڑکھڑا کر دور ہوئی اور نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں بہت خاموشی سے برس رہی تھیں۔ بے بسی، بے کسی، لاچاری کا احساس اضطراب بن کر رہ گیا تھا۔

''جاؤ واپس نیچے...... اگر کسی نے یہاں دیکھ لیا تو مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔'' حیدر نے اس کے سحر انگیز سراپا سے نگاہ چراتے ہوئے بظاہر تلخی سے کہا تھا۔ جتنا بھی اس پر غصہ تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اس پر جبر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لڑکی اپنی تمام تر خودسری، نخوت اور اکڑ کے باوجود اسے عزیز تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی دیر ٹہل ٹہل کر خود کو کمپوز کرتا رہا۔

☆☆☆

''میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا لیکن تمہیں لوٹ کر یہیں آنا ہے۔'' اگلے دن جب وہ جانے کو تیار تھی تو حیدر نے آ کر اسے جتانا ضروری خیال کیا۔ صلہ اتنی متنفر تھی کہ نگاہ بھر کے اسے دیکھا تک نہیں۔ حیدر اس کی خفگی محسوس کر کے نرمی سے مسکرایا۔

''ناراض ہو؟'' یہ سوال صلہ کو بھڑکا کے رکھ گیا۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ تمہاری اوقات کے لیے یہ ایک فقرہ ہی کافی ہونا چاہیے۔'' وہ عادت سے مجبور تھی، پسپا ہونا اسے پسند نہیں تھا حالانکہ اسی باعث وہ کتنا نقصان اٹھا چکی تھی۔

''تمہاری اوقات یہ ہے کہ تمہیں اس تمام تر نفرت اور بیزاری کے باوجود میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔''

''میں ایسی زندگی پر لعنت بھیجنا زیادہ پسند کروں گی اگر ایسا ہوا تو......'' وہ نفرت کی آخری سیڑھی پر جا کھڑی ہوئی۔

''یہ تو آنے والا وقت بتائے گا مسز...... قسم کھا کر کہوں کہ تم خود مجھ سے یہ گزارش کرو گی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ جنوں خیزی سے لبریز سرخ آنکھیں صلہ کو جانے کیوں خوف محسوس ہوا۔ اس نے نگاہ پھیر لی اس وقت وہ واقعی اس کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔

''رات تک رک جاؤ تمہارا مطالبہ پورا کر دوں گا۔'' اسے ہونٹ بھینچے دیکھ کر حیدر نے موڈ بدل کر مسکراہٹ دبائی اور صلہ کے چہرے پر خون چھلک آیا۔ وہ اس کی خباثت کا واقعی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ صبح ایک بار پھر ان کے بیچ تکرار ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر وہی مطالبہ کر رہی تھی اور وہ انکار کیے جا رہا تھا۔

''ایسا مت کرو میرے ساتھ حیدر۔'' وہ زچ ہوئی تھی جبھی منت پر اتر آئی۔

''یعنی طلاق نہ دوں تمہیں...... میں خود بھی تو یہی چاہتا ہوں جانِ من۔ کتنی حسین ہو تم، میں چاہتا ہوں ہمیشہ تم میری بیوی رہو۔'' وہ اس دل جلاتی مسکان سمیت بولا تھا جو صلہ کا خون جلا کر رکھ دیتی تھی۔ صلہ کا طیش پھر سے امڈ آیا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے، میں تمہیں مکرنے نہیں دوں گی۔'' وہ حلق کے بل چیخنے لگی۔ پچھلے دنوں سے وہ اتنی ٹینشن کا شکار تھی کہ خود کو ہسٹیرک ہونے سے بچا نہیں سکی جبھی حیدر نے ٹوکا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں صلہ، اپنی پوزیشن کا خیال کرو۔ اگر کوئی یہاں آ گیا تو؟''

''تم مجھے طلاق دو ابھی اسی وقت۔'' وہ ہر صورت اس سے چھٹکارے کی متمنی تھی۔ یہ تعلق کوڑیالا سانپ تھا جو ہر لمحہ ہر پل اسے ڈستا تھا۔

''یہ تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔'' اس کی بات کے جواب میں وہ غرایا، صلہ ہکا بکا رہ گئی۔

''کیا مطلب؟'' وہ سہمی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''کسی مرد کو اتنا شریف دیکھا ہے تم نے کہ وہ اپنے قبضے میں آئی حسین ترین لڑکی پر ہاتھ صاف کیے بنا چھوڑ دے۔ کتنا ترسایا ہے تم نے مجھے...... تمہیں تو

اندازہ بھی نہیں ہوگا۔'' اس کی زبان بھی اس کی نظروں اور سوچوں کی طرح سطحی اور گھٹیا تھی۔ صلہ شرم اور خفت سے کٹ کر رہ گئی۔

''مجھے تمہاری ہوس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ٹھیک ہے، تم یہ خراج وصول کرلو اور ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ دو۔'' اس پل وہ خود بھی بے باک ہوگئی تھی۔ ورنہ ایک باحیا لڑکی اس قسم کی بات منہ سے نکالنے سے قبل مرنا پسند کرتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایک کھیل تھا جس میں وقتی طور پر حیدر کو فتح حاصل ہوگئی تھی، وہ ہر صورت یہ جیت، یہ فتح دوبارہ حاصل کرلینا چاہتی تھی مگر خود کو پامال کرنے کے بعد۔ انتہا کی جذباتیت نے اس سے عقل چھین لی تھی۔ حیدر نے چونک کر اسے دیکھا پھر کسی قدر خباثت سے ہنس پڑا۔

''اس کا مطلب...... بہت جلدی ہے تمہیں!''

''ہاں ہے۔'' وہ بلا جھجک بولی۔ اسے اس پل یہ بھی پروا نہیں تھی کہ اس کی نسوانیت کس درجہ پستی میں گر رہی تھی۔

''مگر مجھے نہیں ہے...... کچھ دن انتظار کرلو۔''

وہ کندھے اچکا کر بولا اور وہاں سے جانے کو پلٹا تھا کہ ذلت، تنگی اور توہین کے احساس سے بھڑ بھڑ جلتی صلہ نے اس کا کالر پکڑ کر کھینچ لیا۔

''گھٹیا، انسان تم اپنی بات سے پھر رہے ہو۔ میں چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔''

''اچھا۔'' وہ تمسخر سے ہنسا پھر کندھے اچکا دیے۔ ''تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ جو کرسکتی ہو تم کرو۔'' اس کے ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔ صلہ ششدر ہوکر رہ گئی۔

''تم کہہ لو میں یہ ہوس ایک بار نہیں مٹا سکتا۔ بہت خوب صورت ہو تم...... میں ہمیشہ تمہیں ساتھ رکھنا چاہوں گا۔'' اس کا گال چھو کر وہ مسکرا کر کہتا وہاں سے چلا گیا اور صلہ وہ تو جیسے زمین میں گڑ گئی تھی۔ وہ تو یہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس سارے سلسلے میں اس کا اپنا قصور کس حد تک تھا اور اب حیدر کا اسی بات کا حوالہ اسے پھر سے جھلسا کے رکھ گیا تھا۔

''میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ وہ آزمائش میں اس صورت سہتی اگر تم چپ چاپ مجھے طلاق دیتے مگر اب میں جان گئی ہوں، تم میں انسانیت اور شرافت سرے سے موجود ہی نہیں۔''

''چلو اچھی بات ہے تمہیں سمجھ آگئی۔ ویسے اتنے بڑے بول نہیں بولا کرتے، وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ عین ممکن ہے کل پھر کسی مجبوری میں تمہیں یہ بات مجھ سے کہنی پڑجائے۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ صلہ کے چہرے پر جیسے کسی نے آگ پھینکی تھی۔ یہ طے تھا کہ وہ اس آدمی کے گھٹیا پن کے آگے نہیں ٹھہر سکتی تھی جبھی پیر پٹختی خود وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن بیت گئے۔ اسے صحیح معنوں میں اپنے نقصان کا احساس ہوا تو گم صم ہوکر رہ گئی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ حیدر کے پھینکے جال میں پوری طرح جکڑی جا چکی تھی جبکہ اس کی اس کمزوری کا احساس بھی کسی کو نہیں تھا۔ شہر یار سے اس کی نسبت ٹھہر چکی تھی اور وہ کسی وقت بھی شادی کا مطالبہ کرسکتا تھا پھر کیا ہوتا...... دوسری جانب حیدر تھا جو ہرگز اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ کبھی کبھار گھبرا کر رونے بیٹھ جاتی۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ جو بھی تھا اس میں ہرگز شک نہیں تھا کہ قصور صرف اس کا تھا۔ اسے صاف لگتا یہ ممی کی حکم عدولی کی سزا ہے اگر شروع میں ان کی بات مانی ہوتی تو شاید یہ صورتِ حال اس حد تک گمبھیر نہ ہوتی۔ شہر یار تو شاید یہ سن کر ہی پھر جاتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا۔ ممی نے بھی اسے ہی لعن طعن اور ملامت کرنی تھی۔ لے دے کر ڈیڈ رہ جاتے وہ ہارٹ پیشنٹ تھے شاید اس کی حماقت کی انتہا سہہ نہ پاتے۔ وہ جتنا سوچتی اسی قدر دماغ پلپلا ہونے لگتا۔

''صلہ تم خفا ہو ناں مجھ سے؟'' اس کے گریز سے

شانزے الگ ہلکان تھی۔ یہاں تک کہ اس سے ملنے گھر آ پہنچی تھی۔ صلہ کو اسے دیکھ کر الگ غصہ آنے لگا۔

''تم یہاں کیوں چلی آتی ہو؟'' اسے دیکھ کر وہ کلس کر بولی۔ اسے شانزے پر بھی تاؤ آرہا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ منحوس آدمی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

''کیا اب میرے ملنے پر بھی پابندی ہے۔ تم تو مجھے اس قابل نہیں سمجھتی ہو۔'' شانزے کے دل پر چوٹ پڑی تھی جبھی سسک اٹھی۔ صلہ نے اک نظر اسے دیکھا پھر اس کے لیے انٹر کام پر چائے آرڈر کرنے لگی۔

''تمہیں ہوا کیا ہے، اتنی ویک کیوں ہو رہی ہو۔ چہرہ بجھا بجھا سا ہو رہا ہے۔'' شانزے کو اسے دیکھ کر ہول اٹھنے لگے تھے۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے بے اختیار نظریں چرالیں۔

''مجھ سے بھی چھپاؤ گی اب؟'' شانزے کو جیسے بے تحاشا دکھ نے آن لیا۔

''میں کیا چھپاؤں گی، طبیعت ٹھیک نہیں ہے کچھ۔'' وہ جھنجلانے لگی۔ شانزے نے کچھ دیر اسے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

''اب کیا ہوا؟ منہ کیوں لٹکا لیا تم نے؟'' صلہ جھلاتے ہوئے بولی۔ شانزے نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میری شادی ہو رہی ہے صلہ۔ حیدر کو پتا نہیں کیا سوجھی ہے، فائنل ایگزام بھی نہیں دینے دے رہے۔'' شانزے کی اس بات نے اسے ایک دم ہی گم صم کر کے رکھ دیا۔

''یار تم میری سفارش ان سے کر دوناں اور تو کسی کی نہیں سن رہے۔ میری اتنی سالوں کی محنت ہے۔'' اس کی سوچوں سے بے خبر شانزے اپنی کہے جا رہی تھی۔ صلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس نے شانزے سے وعدہ کرلیا تھا حیدر سے بات کرنے کا۔ اس کے خیال میں اب وہ اسے زیادہ اچھے انداز میں فورس کرسکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد صلہ نے حیدر سے رابطہ کیا تھا۔ اس کے تعارف کے جواب میں وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔

''بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں یہ تم ہی ہو صلہ۔''

''اچھا، تو الہام بھی ہوتے ہیں تمہیں؟'' وہ طنز کرنے سے باز نہیں رہ سکی۔

''ہاں جیسے یہ الہام ہوا تھا مجھ پر کہ تم اس دنیا میں صرف ایک مرد کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو اور وہ مرد میں ہوں۔'' وہ کس سکون سے کہہ کر ہنس رہا تھا، صلہ کو اسی حساب سے آگ لگ گئی۔

''شانزے کے بارے میں بھی تمہیں ایسا ہی الہام ہوا ہوگا، ہے ناں...... شرم تو نہیں آتی ہوگی تمہیں؟''

''شرع میں کیسی شرم...... میں نے تم دونوں سے شادی کرنی ہے۔ دو کی مزید گنجائش ہے۔'' مجال ہے جو وہ لاجواب ہوجائے۔

''میری بلا سے تم چار کے بجائے آٹھ کرلینا مگر مجھے چھوڑ دو۔''

''تمہیں نہیں چھوڑ سکتا صلہ...... یہ بات بار بار نہ کیا کرو۔ اپنے لیے مشکلات میں اضافہ کرتی ہو... اس طرح۔'' اب اس کا لہجہ سرد اور سفاک تھا مگر وہ خائف نہیں ہوئی۔

''میں کورٹ سے رجوع کر کے بھی تم سے علیحدگی اختیار کرلوں گی۔ یہ میری ضد ہے کہ تمہیں اب جیتنے نہیں دوں گی۔'' وہ چیخنے لگی مگر حیدر نے قہقہہ لگا کر گویا اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔

''نکاح نامہ ہے تمہارے پاس...... جب کوئی ثبوت نہیں تو کیس کیسے کروگی؟'' صلہ سرد پڑنے لگی تھی۔ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر اپنی شدید بے بسی کا احساس ہوا تو جھنجلا کر فون بند کردیا تھا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

☆☆☆

شانزے کی شادی طے ہوگئی تھی۔ وہ روتی

دھوتی واپس گاؤں روانہ ہوگئی۔ صلہ سے شادی میں شریک ہونے کے وعدے لے کر مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دن یونہی گزر رہے تھے کہ اِک انجان نمبر سے اس کے سیل پر کال آئی۔

"تمہیں اپنے شوہر کی شادی کی یقیناً خوشی نہیں ہوگی مگر سہیلی کی شادی میں بہر حال تمہیں شریک ہونا چاہیے۔" وہ حیدر تھا اپنے مخصوص دل جلانے والے انداز میں بات کرتا ہوا، وہ اتنا بھڑکی کہ فون بند کر دیا۔ دوبارہ اس نمبر سے کال آنے لگی ایک بار دو بار تین بار صلہ ڈھیٹ بن گئی۔ اس کا حل نظر انداز کرنا ہی تھا۔ تب میسج ٹون بج اٹھی۔ اسی نمبر سے ٹیکسٹ تھا۔ صلہ نے بے دلی سے کھولا۔

"تمہیں مہندی کی رات حویلی میں پہنچنا چاہیے صلہ۔ مہندی کی رات اس لیے کہ یہ تمہاری گولڈن نائٹ ہوگی۔ میں بڑا اصول پرست ہوں یار۔ پہلی بیوی تم ہو تو مجھ پر پہلا حق بھی تمہارا ہی ہے۔ یاد رکھنا اگر تم نے اکڑ دکھانے کی کوشش کی تو تمہاری سہیلی اس وقت تک مجھے حاصل نہیں کر سکے گی جب تک میں تمہیں نہ پالوں۔" صلہ کا چہرہ بے تحاشا سرخ ہوگیا۔ اس کی انگلی کی ایک جنبش نے یہ میسج ضائع کر دیا۔ یہ طے تھا کہ اب اسے حیدر کی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لانا تھا۔ وہ اگر شانزے کی وجہ سے اسے بلیک میل کرنا چاہتا تھا تو یہ حیدر کی بھول تھی۔ بہر حال شانزے اس کی دُکھتی رگ کبھی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

شانزے کی شادی کا دن آیا اور گزر گیا۔ وہ شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر ضرور مضطرب تھی۔ حیدر سے خائف بھی مگر خیریت گزری تھی۔ اس کے بعد بھی بہت دن بیت گئے۔ شانزے کا کبھی کبھار فون آجاتا، وہ اس سے اس لاتعلقی کا شکوہ کرتی جو صلہ نے اس سے اپنائی تھی مگر صلہ کبھی اسے خاطر میں نہیں لائی۔ انہی دنوں جب.... گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں شہریار اچانک واپس آگیا۔ ممی کے ذریعے اسے شہریار کے ارادوں کا بھی پتا چل گیا کہ وہ شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ صلہ کی پھر سے جان پر بن آئی۔ حیدر سے بات کرنے کا معلوم نہیں کس حد تک فائدہ ہوتا کہ آج کل اس کی جانب سے مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس سے اپنا مطالبہ دُہرانے کا سوچ رہی تھی کہ اس سے پہلے شہریار نے خود اس سے رابطہ کر کے ملنے کا کہہ دیا۔ اسے شکوہ تھا کہ صلہ اسے نظر انداز کر رہی ہے حالانکہ یہ نظر اندازی نہیں تھی، وہ اپنے مسائل میں اس طرح الجھ گئی تھی ورنہ محبت صرف شہریار نے نہیں کی تھی وہ بھی اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ صلہ اسی شام اس سے ملی تھی اور بہت سبھاؤ سے اپنی کچھ خود ساختہ مجبوریاں بیان کر کے فی الحال شادی روکنے کا مطالبہ کیا۔ شہریار جز بز تو ہوا البتہ اسے انکار نہیں کر سکا۔ صلہ کی ٹینشن آدھی سے زیادہ ریلیز ہوگئی مگر اس وقت وہ حواس قائم نہیں رکھ سکی تھی جب اگلے دن کالج سے واپسی پر اسے حیدر نے غیر متوقع طور پر اس وقت اپنی گاڑی میں زبردستی کھینچ کر بٹھا لیا تھا جب وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی۔

"واٹ نان سینس۔" حیدر کو روبرو اور خطرناک تیوروں کے ساتھ پا کر وہ اپنی جان ہوا ہوتی محسوس کر چکی تھی مگر اس پر اپنا خوف ظاہر کر کے اسے شیر ہونے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتی تھی جبھی ناگواری سے بولی تھی۔

"کل کس کے ساتھ تھیں تم؟" حیدر نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟" وہ بھڑک اٹھی مگر حیدر اس کے بھڑکنے کو برداشت نہیں کر سکا جبھی اگلے لمحے اس کے الٹے ہاتھ کا تھپڑ صلہ کا چہرہ پھیر کر رکھ گیا تھا۔

"تمہاری بے شرمی اور بے باکی کی کوئی حد ہے کہ تم اپنے شوہر پر کس دھڑلے کے ساتھ اپنا گناہ ظاہر کر رہی ہو۔" اس پل وہ سراپا قہر تھا، صلہ تو

بھونچکی رہ گئی تھی۔ تبھی اس کی آنکھیں خوف اور حیرت کے باعث پھٹ سی گئیں۔

"میں ابھی اسی وقت تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ سمجھ لو رخصتی ہوگئی تمہاری۔ اس سے زیادہ چھوٹ نہیں دے سکتا میں تمہیں کہ تم میری عزت یوں رولتی پھرو۔" وہ بھڑک کر پھنکارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ صلہ جیسے اسی پل ہوش میں آئی۔

"وہ شہریار ہے میرا فیانسی...... جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا اس کی سوائے میرے کسی کو بھی خبر نہیں ہے۔ میں اس سے شادی نہ کرنے کی وجہ سے ملی تھی اور......"

"اور اب سب کو پتا چل جائے گا...... تم خود بتاؤ گی یا میں بتاؤں۔" وہ ہنوز شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا۔ صلہ کا دل پاتال میں گرنے لگا۔

"دیکھو دس از ناٹ فیئر۔ یہ سب کچھ اس طرح نہیں ہوسکتا میں......"

"اپنی بکواس بند رکھو صلہ۔ میں نے کہا ناں میں تمہیں مزید چھوٹ نہیں دے سکتا، تم میری بیوی ہو تو یہ بات اب سب کو معلوم ہونی چاہیے۔" وہ اتنی زور سے غرایا کہ صلہ کی سماعتیں بیکار ہونے لگیں مگر وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

"تمہاری وجہ سے میں پہلے ہی بہت ذلیل ہو چکی اپنی نظروں میں حیدر، اب اور نہیں...... اگر تم مجھے اس طرح اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں میں زہر پھانک لوں گی۔ یہ آخری فتح تمہارا نصیب نہیں بننے دوں گی میں۔" وہ ضبط کھو کر چیخ اٹھی تھی۔ حیدر کے سنگی چہرے پر لمحے بھر کو تغیر پیدا ہوا۔ شاید نہیں یقیناً صلہ کے لہجے و انداز میں اتنی پختگی اور شدت تھی کہ وہ اس پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

"میں جانتا ہوں جتنی نفرت تم مجھ سے کرتی ہو ساری عمر بھی خود سے یہ سب نہیں چاہو گی مگر صلہ میں ہر قیمت پر تمہیں حاصل کروں گا، یہ یاد رکھنا۔" اس نے گاڑی کا رخ پھیر دیا تھا اس کے بعد وہ اسے اس کے گھر کے سامنے ڈراپ کر کے مزید کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔ صلہ کے لیے فی الحال یہی کافی تھا کہ وہ طیش سے بھرے مرد کے چنگل سے صحیح سالم بچ نکلی تھی۔

☆☆☆

زندگی پر جیسے جمود چھا گیا تھا...... وہ ہر چیز سے بیزار رہنے لگی تھی۔ ممی اس کے بدلے مزاج پر حیران ہوا کرتیں۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آئی تھی وہ ایسا کیا کرے کہ اس مصیبت سے جان چھڑا لے۔ حیدر سے اس دوران جتنی بار بھی اس نے رابطہ کیا اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"مجھے تمہیں طلاق دینے میں حرج نہیں لیکن پہلے شانزے کو دوں گا۔" اُدھر شانزے تھی جو بے چاری ہر قسم کے حالات سے بے خبر...... حیدر کی لاتعلقی نے جسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ چونکہ وہ خود کو سب سے زیادہ صلہ کے نزدیک پاتی تھی اپنا دکھ اس کے آگے کھولا تھا۔

"شادی کے محض چند ماہ بعد ہی ہر کوئی مجھ سے بچے کے متعلق سوال کرنے لگا ہے صلہ، میں کیا جواب دوں۔ حیدر کا تو مجھ سے ایسا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی اگر وہ مجھے اتنا ناپسند کرتے تھے تو پھر یہ شادی ہی کیوں کی۔ وہ بھی اتنی جلدی۔"

اس کے آنسو نہیں رکتے تھے اور صلہ کو لگتا تھا کہ کسی نے اسے کند چھری سے ذبح کرنا شروع کر دیا ہو۔ حیدر اس حد تک گر جائے گا۔ وہ اتنا کینہ پرور ہوگا صلہ کو گمان تک نہیں تھا۔ اب وہ سمجھی تھی اس نے سارا کھیل کس خوبی سے کھیلا تھا۔ مقصد یقیناً صلہ کو قابو کرنا، بے بس کرنا تھا۔ وہ جتنی بھی بے حس سہی مگر اس سے شانزے کا دکھ برداشت نہیں ہوا جبھی وہ اس سے بات کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔

"شانزے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اسے کیوں سزا دے رہے ہو؟" اس نے چھوٹتے ہی مقصد کی بات کی تھی۔ تمام تر غصے کے باوجود اس نے لہجہ

کنٹرول میں رکھا تھا۔ وہ ہٹ دھرم انسان تھا اگر مزید اکڑ جاتا تو وہ کیا کر سکتی تھی۔

''یہ سزا اسے میں نہیں، تم دے رہی ہو۔'' جواباً اس کا لہجہ روکھا اور سرد تھا۔ صلہ حق دق رہ گئی......

''میں دے رہی ہو؟''

''میں نے کہا بھی تھا صلہ کہ تم میری پہلی بیوی ہو۔ میں یہ مقام یہ درجہ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ جب تک تم اپنی حیثیت واضح نہیں کرتیں، میرے حقوق ادا نہیں کرتیں، میں بھی پابند نہیں ہوں سمجھیں۔'' وہ نہایت غصے میں لگ رہا تھا۔ صلہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''تم جانتے ہو ایسا ممکن نہیں ہے، تم ہمیں مزید الو نہیں بنا سکتے...... شرافت اسی میں ہے کہ اپنا رویہ بدل لو۔'' صلہ نے بغیر کسی لحاظ کے تلخی و تنفر سے کہا، وہ جواباً ہنسنے لگا۔

''ایک بات ہمیشہ کے لیے کان کھول کر سن لو صلہ، میں تمہیں ساری زندگی طلاق نہیں دوں گا۔ شانزے بھی یونہی رہے گی۔ بے اولاد تو وہ کہلائی جا رہی ہے۔ پوزیشن اس کی مشکوک ہے۔ بانجھ بھی وہی کہلائے گی اس صورت میں کہ جب میں ایک اور شادی کروں گا اور میری اولاد بھی ہوگی، سمجھ رہی ہو؟ اب فیصلہ کر لینا، زیادتی کون کر رہا ہے۔ شانزے کے ساتھ تم یا پھر میں......؟''

اس بار سلسلہ پہلی مرتبہ حیدر نے خود منقطع کر دیا۔ صلہ پتھرا سی گئی تھی۔ اسے لگا تھا اس کے وجود سے بھاری پتھر بندھا ہے اور اس کا وجود ہر لحہ گہرے تاریک سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

پھر وہ پوری طرح سے ہار گئی۔ ہوا پہلے بھی وہی تھا جو حیدر نے چاہا تھا ہُوا اب بھی وہی تھا جو حیدر چاہتا تھا۔ ہوتا ہے ایسا بھی کبھی کہ کوئی جیتتا ہے تو جیتتا چلا جاتا ہے...... اور کسی کے مقدر میں مستقل ہار لکھ دی جاتی ہے۔ صلہ اور حیدر کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ صلہ نے خود ممی، ڈیڈ اور شہریار کے سامنے اپنا مطالبہ رکھا اور اپنی سہیلی کے شوہر کی بیوی بن کر گاؤں اس کی حویلی میں آ گئی۔ اس روز اس کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔ اس سج دھج کے ساتھ وہ پیا دیس نہیں مقتل میں آئی تھی اور اپنی سہیلی کی خوشی کی خاطر قربان ہو گئی۔ وہ سہیلی جس نے ہمیشہ اس سے محبت کی تھی...... جس نے ہمیشہ اسے اولیت دی تھی...... جس نے ہمیشہ اسے دیا تھا۔ وہ سب جو اس نے اس سے چاہا...... مان، چاہ، خلوص، ایثار، وفا، محبت پھر وہ کیسے پیچھے رہ جاتی وہ بھی اس صورت جب ہاتھ پھیلا کر شانزے نے خود مانگ لیا تھا اس سے۔

صلہ اس روز بینک کے کسی کام سے جا رہی تھی جب بالکل اچانک شانزے چلی آئی تھی۔ صلہ کتنی حیران ہوئی تھی اسے دیکھ کر۔

''تم...... تمہارے شوہر نے تمہیں اجازت دے دی حویلی سے نکلنے کی؟'' صلہ خود کو سنبھال کر دانستہ مسکرائی۔

''ہاں دے دی اجازت، تمہارے معاملے میں حیدر ضرورت سے زیادہ فیاض ہیں۔'' شانزے کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ چونک اٹھی تھی۔

''کیا مطلب؟'' وہ جز بز ہی نہیں ہوئی متوحش بھی ہونے لگی تھی۔

''ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ صلہ اگر میں ڈوب رہی ہوں تو تم مجھے بچانے کی سعی کرو گی...... کرو گی تو کس حد تک؟'' عجیب سوال تھا اور صلہ سرد پڑنے لگی تھی۔ وہ اس بات سے خائف تھی۔

''تمہیں یاد ہے صلہ تمہیں ایک بار میرا سونے کا بریسلٹ پسند آ گیا تھا۔ وہ میں نے تمہیں دے دیا۔ تمہیں میرا ڈریس پسند آیا میں نے خوشی سے تمہیں تھما دیا۔ یہ بہت معمولی چیزیں تھیں صلہ جنہیں تمہیں دیتے وقت مجھے کوئی خیال اور احساس تک نہیں تھا...... کبھی مجھے ان کے بدل میں تم سے تمہاری سب سے انمول چیز یعنی تمہیں مانگنا پڑ جائے گا۔ مجھے معاف کر دینا صلہ میں بہت کم ظرف ثابت ہوئی ہوں۔'' اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپے وہ

بلک بلک کر رونے لگی جبکہ صلہ سکتے میں تھی۔

''میری عزت...... میری گرہستی...... میری ساری زندگی کی خوشیاں تمہاری ایک ہاں کی منتظر ہیں، تم حیدر کو انکار نہ کرو...... وہ میرے نہیں تمہارے ہیں، میں تمہیں ان سے مانگنے آئی ہوں صلہ، چاہو تو مجھے خالی لوٹا دو، چاہو تو میری جھولی بھر دو اگر نکاح کسی مجبوری میں کیا تھا تو اب رخصتی بھی کرا لو...... پلیز...... پلیز......'' وہ کہہ رہی تھی اور صلہ ساکت بیٹھی تھی۔ اسے لگا فضا سے یکلخت آکسیجن ختم ہو گئی ہو۔ ہر سمت حبس تھا اور تاریکی۔ اس وقت وہ بادشاہ تھی اور شانزے سوالی...... وہ اس سوالی کو خالی نہیں لوٹا سکی۔ اس نے اس کا دامن بھرا اور خود عمر بھر کو خالی ہو گئی......

کچھ تعلق اور رشتے اپنا خراج وصول کرتے ہیں۔ شانزے سے اس کا تعلق بھی ایسا ہی ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

پھر پتا نہیں کتنا عرصہ بیت گیا لیکن بہت بیت گیا تھا۔ اس کے لیے تو ایک صدی کے برابر تھا۔ اس کی ہٹ دھرمی اور ضد کا نتیجہ تھا کہ ممی اور ڈیڈ اس سے ہنوز خفا تھے اور لاتعلق بھی...... شانزے پریگننٹ تھی مگر اس کی طرح شانزے بھی پوری طرح خوش نہیں تھی...... اس نے صلہ سے محبت کی تھی اور اس محبت کا خراج صلہ سے وصول کر کے بھی وہ خوش نہیں تھی۔ وہ اکثر اس سے معافی مانگتی اور اس کے سامنے شرمندہ شرمندہ پھرا کرتی...... حالانکہ صلہ کو اس سے شکایت نہیں تھی۔ شکایت تو اسے حیدر سے تھی۔ جس نے اسے اس کی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پریگننسی کے باعث شانزے کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔ اس وقت صلہ اس کی طبیعت کا ہی پوچھنے آئی تھی مگر اس کے قدم چوکھٹ پر ہی ساکن رہ گئے تھے۔ حیدر اس کے ساتھ تھا وہ اس سے صلہ کے متعلق ہی بات کر رہا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود نہیں پلٹ سکی۔

''تم صحیح کہتی ہو شانزے، محبت زور زبردستی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اب جا کے ہی تو میں نے اس بات کو سمجھا ہے۔ صلہ بجھ کر رہ گئی ہے۔ وہ میرے لیے مفتوح زمین کا اِک ٹکڑا ہے جسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس پہ بیج بویا جا رہا ہے یا پھر بے آب و گیاہ چھوڑ دیا گیا۔ میں نے بہت جلد یہ جان لیا تھا کہ جسم کی فتح سے دل فتح نہیں کیے جا سکتے...... اور محبت کی فتح تو دلوں کی فتح میں ہے...... میں نے اس سے محبت کی ہے تو یہ میری فطری خواہش تھی وہ مجھے چاہے، مجھ سے محبت کرے، ایسا تو شاید قیامت تک ممکن نہیں۔ وہ نفرت کرتی ہے مجھ سے۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ صلہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''اب میرا دل چاہتا ہے، میں اسے ساری دنیا کی خوشیاں دے دوں مگر میری مفلسی کا عالم یہ ہے کہ میں اسے اِک مسکراہٹ تک نہیں دے سکتا۔ اپنی خواہش کی جنوں خیزی میں، میں نے کتنے دلوں کو اجاڑ دیا ہے تمہارا خود اپنا، صلہ کا اور شہریار کا بھی۔ وہ صلہ سے بہت محبت کرتا تھا۔'' وہ پلٹی تو حیدر ایک دکھ کی کیفیت میں بوجھل آواز سے کہہ رہا تھا۔ صلہ سرد آہ بھر کے رہ گئی تھی۔ وہ صحیح کہتا تھا بہت دل اجڑ گئے تھے اور اب کوئی ازالہ بھی ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

بدلتے موسم ماہ سال کے گزرنے کا پتا دیتے رہے، اب موسم سرما کی آمد کے ساتھ عیدالضحیٰ کی بھی آمد تھی۔ شانزے شاپنگ کرنے گئی تھی۔ حیدر نے صلہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہا مگر اس نے اسی بے دلی سے انکار کر دیا جو اس سے شادی کے بعد اس کے دل میں اتر آئی تھی۔ یہ نو ذی الحجہ کی شام تھی جب ممی غیر متوقع طور پر اس سے ملنے چلی آئیں۔ اس کی عیدی اور بے تحاشا محبتوں کے ہمراہ...... وہ تو ششدر سی رہ گئی۔

''آپ نے معاف کر دیا مجھے؟'' اس کا گلا آنسوؤں سے بھرّانے لگا تھا۔

''بھلا والدین بھی اولاد سے خفا رہ سکتے ہیں؟ وہ تو تمہاری اس ضد نے ہمیں وقتی طور پر بدگمان کر دیا تھا مگر پھر حیدر نے مجھے ساری بات بتائی

......قصور تمہارا نہیں تھا، خیر جانے دو، جو ہونا تھا ہوگیا۔'' ممی اکیلی نہیں آئی تھیں ان کے ساتھ ڈیڈ اور آفاق بھائی بھی تھے۔ ان کی شادی عید کے بعد تھی۔ وہ لوگ انہیں انوائٹ کرنے بھی آئے تھے۔

''آپ اب خفا تو نہیں ہیں ناں مجھ سے؟'' جب وہ لوگ جارہے تھے صلہ نے ممی کا بازو پکڑ کر اک خوف کی کیفیت میں سوال کیا تھا۔ ممی نے سرد آہ بھری۔

''اب تو خفا رہنے کا جواز ہی نہیں ہے بیٹے۔ مجھے بس اس بات کی تکلیف ہے کہ تمہیں اپنی دوست جتنی بھی عزیز تھی مگر اس کی خاطر تمہیں پھر بھی اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ یہ تمہارا اسٹینڈرڈ نہیں تھا بیٹے۔'' ممی واقعی ملول تھیں۔ اس نے بھنچی بھنچی ہوئی سانس کھینچی۔

''یہ میرا نصیب تھا ممی! اور نصیب خدا کا طے کیا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے جو کیا تھا اس کی جزا سزا تو مجھے اللہ نے دی مگر میں نے صرف اور صرف اپنی سہیلی کی خاطر یہ قدم اٹھایا۔ میں کبھی خود کو سمجھ ہی نہیں سکی تھی شاید...... میرا نام آپ نے صلہ رکھا تھا تو پھر وہ کسی کے لیے بوجھ کیسے بن سکتی تھی۔ خیر آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔'' اس نے اپنے طور پر انہیں ریلیکس کرنے کی کوشش کی تھی پھر اسی رات جب حیدر بیڈ پر اس کے برابر سونے کو آکر لیٹا تو صلہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔

''یہ سب آپ نے کیا مگر کیوں......؟''

''اپنی زیادتی کا کچھ نہ کچھ ازالہ کرنے کی خاطر...... صلہ مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ......'' وہ خاموش ہوگیا۔

''کیا جو کچھ ہوگیا اسے دُہرانا بہت ضروری ہے؟ ہم بھول بھی سکتے ہیں حیدر......'' وہ پہلی بار اسے دیکھ کر مسکرائی۔ حیدر قدرے حیران سا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ پُرجوش بھی تھا اور خوش بھی...... صلہ نے گہری سانس بھری۔

''اِک سچ کچھ دن پہلے آپ نے بھی کہا تھا پر بجائے شانزے سے اگر محبت مجھ سے کی تھی تو اظہار مجھ سے کرنے میں کیا حرج تھا؟'' وہ خفا ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ حیدر پہلے ٹھٹکا پھر خفت زدہ ہو کر سر کھجانے لگا۔

''تمہارے سامنے کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ پتا نہیں تم یقین کرتی نہیں کرتیں۔''

''کاش آپ نے یہ بزدلی باقی کارناموں میں دکھائی ہوتی تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔'' اس کے دل سے ہوک نکلی۔

''صلہ تم نے مجھے معاف کردیا ناں؟ میں اتنا شرمندہ تھا کہ معافی مانگتا بھی کیسے...... محبت کا اظہار کرتا بھی تو کیسے؟ میں نے تمہیں تم سے چھینا تھا چالبازی سے، دھوکے سے۔'' وہ افسردہ ہونے لگا۔

''اِٹس اوکے حیدر، بھول جائیں...... میں نے جان لیا کہ یہی قدرت کی رضا تھی۔ اب میں آپ کے اور شانزے کے ساتھ خوش ہوں۔'' اس نے حیدر کے دل پر دھرا بوجھ سرکانا چاہا اور کامیاب رہی تھی۔ حیدر واقعی سب کچھ بھلا کر چہکنے لگا تھا۔ کل عید تھی وہ جا کر شانزے کو بھی بلا لایا...... اور وہ چوڑیاں بھی نکال لایا جو اس نے خریدی تھیں۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ صلہ نے بھی خود کو خوش ظاہر کیا۔ اس میں حرج بھی کیا تھا۔ قربانی خوشی سے ہی دی جاتی ہے ورنہ قبول نہیں ہوتی۔ وہ خوش نہیں تھی۔ خوشی ظاہر تو کرسکتی تھی۔ یہ اللہ کا فیصلہ تھا جبھی تو آج اس کی حیثیت یہ تھی۔ اللہ نہ چاہتا تو حیدر کچھ بھی کرلیتا۔ وہ صلہ کو حاصل نہیں کرسکتا تھا اگر یہ اللہ کا فیصلہ تھا تو پھر اسے قبول کرنے میں قباحت کیوں...... جب تک وہ نہیں سمجھی تھی ٹھیک تھا...... اب یہ بات سمجھ آگئی تھی تو سر جھکا لیا تھا۔ اسے یقین تھا اس کے دل میں گنجائش نکالنے والا اللہ اس کے دل میں محبت بھی جگا دے گا۔



پھانس

نگہت اعظمی

''میں جانتا ہوں تمہارا غم اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن اب تو پاپا کا دسواں بھی ہوچکا ہے۔ تمہیں شادی میں شرکت سے انکار کیوں ہے؟'' اظفر کے سمجھانے پر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے حتی الامکان آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی وہ جانتی تھی کہ اظفر اس کے بات بے بات رونے پر

بہت چڑتا تھا اور اس وقت تو وہ کچھ زیادہ ہی جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"اب اتنی سی بات پر تم رونے نہ بیٹھ جانا۔" وہ باوجود کوشش کے اپنے آنسو نہ روک سکی تو اظفر نے چڑ کر کہا۔ اظفر کے اس طرح غصہ کرنے پر اس کے آنسو اور زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں نے یا میرے گھر والوں نے تم پر ایسا کون سا ظلم توڑا ہے جو تم اس طرح رو رہی ہو۔" اظفر کا لہجہ اس قدر طنزیہ اور تکلیف دہ تھا کہ اس سے مزید برداشت نہ ہوسکا اور وہ وہاں سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی تا کہ اچھی طرح رو کر دل کی بھڑاس نکال لے۔

اظفر نے سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ چند لمحوں پہلے ہی وہ اپنی ماں کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا اس کی ماں بہت سمجھدار خاتون تھیں انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اسے سمجھایا تھا کہ ان کے جیٹھ کے بیٹے کی شادی میں حنا (اظفر کی بیوی) کی شرکت لازمی ہے ورنہ وہ اپنی سسرال میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گی۔ سارے خاندان میں ان کی ذلت ہوجائے گی، لوگ باتیں بنائیں گے اور پھر دستور بھی یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کا شادی کے بعد میکے والوں سے زیادہ تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ ایسی لڑکیاں جو شادی کے بعد بھی میکے کا راگ الاپتی رہیں وہ کبھی سسرال میں خوش نہیں رہ سکتیں۔ ہر لڑکی کا فرض ہے کہ وہ سسرال کی خوشی اور غم کو میکے کی خوشی اور غم پر ترجیح دے اور حنا کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ شادی کے بعد عورت پر بڑی ذمے داریاں عائد ہوجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ماں کی نصیحتیں سن کر اظفر کو یقین ہوگیا کہ حنا اس کے چچازاد بھائی کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا بہانہ بنا رہی ہے ورنہ باپ کا ایسا بھی کیا غم...... اور باپ بھی کون سا جوان تھے اچھی خاصی عمر تھی اور سب بچوں کی شادیوں سے بھی فارغ ہوچکے تھے۔ اب تو خدا کے گھر جانے کا ہی وقت تھا اور پھر یہ بھی کتنا بڑا مسئلہ تھا کہ اگر حنا ذیشان کی شادی میں شریک نہ ہوگی تو شاید پورے خاندان میں تہلکہ مچ جائے گا اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ امی کی نندوں کے دل یہ سوچ کر خوشی سے کھل اٹھیں گے کہ بھابی کے اپنی بہو سے تعلقات خوشگوار نہیں اور مزید یہ کہ جس طرح بھابی نے ان کو ساری زندگی جلایا اور کلسایا ہے اب اللہ نے ان کے صبر کا بدلہ دیا ہے۔

"تم تو اپنی پھوپیوں کو جانتے ہو، وہ تو ہر وقت اس فکر میں رہتی ہیں کہ کس طرح ہمارے گھر کی باتیں انہیں پتا چلیں اور وہ انہیں سارے جہان میں مشہور کریں۔" امی کے ان جملوں پر اظفر کا دل دُکھنے لگا۔

"امی کتنی مظلوم ہیں اور ان کی نندیں کتنی تیز اور چالاک ہیں۔"

"تم امی کی پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب سب خاندان والے تمہارے بارے میں پوچھیں گے تو امی کیا جواب دیں گی۔" وہ اچھی طرح رو دھو کر جب واش روم سے باہر آئی تو اظفر نے پھر وہی قصہ شروع کردیا۔

"یہ کون سا الجبرا یا جیومیٹری کا سوال ہے کہ جس کے لیے آپ کی امی کو ذہن پر زور ڈالنا پڑے، وہ بتادیں کہ میرے باپ کا انتقال ہوا ہے اور سب کو پتا ہے۔" اس دفعہ اس نے رونے کے بجائے تڑخ کر جواب دیا۔

"تم نہیں جانتیں ہمارے ددھیال والے کتنے تیز اور چالاک ہیں، وہ کہیں گے یہ کون سی انوکھی بات ہے سب ہی کے ماں باپ مرتے ہیں۔ کیا ماں باپ کے مرنے سے انسان دنیا چھوڑ دیتا ہے۔"

"تو میں کون سا دنیا چھوڑ رہی ہوں، پاپا کے سوئم کے دوسرے دن ہی گھر آگئی اور گھر کے سارے کام ہی کر رہی ہوں۔ کون سا میں پاپا کا سوگ منائے

بیٹھی ہوں لیکن میرا شادی میں جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ کیا مجھے اپنے گھر میں اتنی آزادی بھی نہیں کہ میں اپنے باپ کا غم اپنی مرضی سے منا سکوں؟" اس نے اظفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے سوال کیا تو ایک لمحے کے لیے وہ بھی گڑبڑا گیا۔

"لاحول ولاقوۃ...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔"

"مجھے کس نے روکا ہے، ہونہہ...... پاپا کو دنیا سے رخصت ہوئے صرف دس دن ہوئے ہیں اور میں سوئم کے بعد صرف ایک دفعہ گئی ہوں کیونکہ مجھے رات کا کھانا پکانا ہوتا ہے اور آفس سے آنے کے بعد آپ اتنا تھک جاتے ہیں کہ آپ کی کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔" اس نے حقیقت بیان کی تو اظفر کا پارا ایک دم ہائی ہوگیا۔

"تو کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم چاہتی ہو کہ میں مستقل وہیں رہنے لگوں۔" اظفر کا لہجہ ایک دم بیگانہ ہوگیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔" اس کی آواز پھر بھرّانے لگی۔

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم چاہتی کیا ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم یہاں خوش نہیں ہو۔ تمہارا اپنے میکے میں زیادہ دل لگتا ہے۔ وہاں تم بہت خوش رہتی ہو۔ اصل میں تم وہیں رہنا چاہتی ہو۔"

"اگر مجھے وہاں رہنا ہوتا تو سوئم کے بعد واپس نہ آتی۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم شادی میں نہیں جاؤ گی؟" وہ زچ ہو کر بولا۔

"بالکل، میں پاپا کے چہلم سے پہلے کسی خوشی کی تقریب میں شرکت نہیں کروں گی۔" اس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی تم چہلم کیوں...... ساری زندگی اپنے باپ کا سوگ مناتی رہو۔ میں اب تم سے کہیں جانے کے لیے نہیں کہوں گا۔ میں امی کو بتا دیتا ہوں کہ اب حنا سسرال کی کسی تقریب میں شرکت نہیں کرے گی۔" وہ غصے سے تنتناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ گھبرا کر اس کے پیچھے پیچھے دوڑی مگر اتنی دیر میں وہ امی سے یہ سب کہہ کر گھر سے باہر چلا گیا پھر امی نے اپنے شوہر یعنی اس کے سسر سے نہ جانے کیا کہا کہ چند لمحوں بعد وہ غصے میں لال پیلے ہوتے ہوئے اس کے پاس آئے۔

"تم چاہتی کیا ہو بہو؟"

"میں...... وہ...... اصل میں۔" وہ خوف کے مارے ایک جملہ بھی نہیں بول سکی۔

"اگر تم سسرال میں رہنا چاہتی ہو تو تمہیں یہاں کے طور طریقوں کے مطابق چلنا ہوگا۔ یہ مرنا جینا تو زندگی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا کو تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ میں اس سلسلے میں کوئی دوسری بات نہیں سنوں گا۔ تمہیں اس شادی میں شرکت کرنا ہوگی۔" انہوں نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ بستر پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایک دن پہلے ہی تو پاپا کا دسواں ہوا تھا اور اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ پاپا اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اسے تو لگتا تھا جیسے پاپا یکدم کہیں سے آجائیں گے اور کہیں گے۔ "کیا حال ہے میری بیٹی کا؟ مجھے تم کچھ کمزور سی لگ رہی ہو، خوب کھایا پیا کرو۔" پاپا کو ہمیشہ ہی وہ کمزور لگتی تھی۔ اس سے بڑے تین بھائیوں کے بعد جب وہ اس دنیا میں آئی تو کلیم صاحب تو جیسے خوشی سے ناچنے لگے۔ انہوں نے پورے اسپتال میں مٹھائی بانٹی تھی۔ وہ ہر وقت اسے گود میں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ انہیں بیٹی کی بڑی تمنا تھی۔ ان کی ایک بہن تھی جو بہت بچپن میں دنیا سے چلی گئی تھی۔ وہ انہیں بہت عزیز تھی اس کے مرنے کے بعد وہ جب بھی اسے یاد کرتے ان کی

آنکھیں اشکبار ہوجاتیں پھر جب ان کی شادی ہوئی اور شادی کے آٹھ سال بعد انہیں خوش خبری ملی تو انہوں نے پہلا جملہ یہ کہا تھا۔ ”میری بڑی خواہش ہے کہ خدا میرے گھر اپنی رحمت بھیج دے۔“

”اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش کو پورا کرے میری تو یہی دعا ہے کہ اللہ نیک، صحت مند اور زندگی والی اولاد دے۔“ راحت بیگم نے شوہر کی خواہش سن کر خلوصِ دل سے بیٹی کے لیے دعا مانگی تھی۔

”مجھے بچیاں بہت پیاری لگتی ہیں ۔ ایسا لگتا ہے جیسے ننھی ننھی پریاں گھر میں پھر رہی ہوں۔“ کلیم صاحب کے لہجے سے ہی ان دیکھی بیٹی کے لیے محبت کی شیرینی ٹپک رہی تھی۔

”آپ کو اپنی بہن سے بھی بہت محبت تھی۔“ انہوں نے شادی کے بعد آٹھ سالوں میں ان کی زبان سے اتنی دفعہ اس بہن کا تذکرہ سنا تھا کہ اس کی مختصر سی زندگی کا ہر ہر پہلو ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ جو پانچ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔

”مجھے لگتا ہے مجھے اس سے اتنی محبت نہیں تھی جتنی محبت وہ مجھ سے کرتی تھی۔ میں اس سے پانچ سال بڑا تھا اور وہ سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرتی تھی۔ ہم دونوں ساتھ اسکول جاتے ساتھ واپس آتے، وہ اسکول سے واپسی پر پہلے وین میں سوار ہوتی تھی اور پھر میری راہ تکتی رہتی ۔ ایک دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ مجھے وین تک آتے آتے تھوڑی دیر ہوگئی اور ڈرائیور نے وین اسٹارٹ کردی تو اس نے رو رو کر ایسا حشر مچایا کہ ڈرائیور کو وین چلانے کی ہمت نہ ہوسکی اور جب میں سوار ہوا تو مجھے دیکھ کر سخت ناراض ہوئی اور مجھے امی کی طرح ڈانٹنا شروع کردیا۔ مجھے آج تک اس کے الفاظ بھی یاد ہیں۔“ کلیم صاحب ہمیشہ کی طرح بھرائی ہوئی آواز میں بہن کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے۔

”مجھے تو لگتا ہے اگر ہمارے گھر بیٹی آئی تو آپ تو مجھے بالکل بھول جائیں گے۔“ انہوں نے ماحول کو بدلنے کے لیے ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

”تو آپ کو ابھی سے اپنی بیٹی سے جیلسی ہورہی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”اللہ نہ کرے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے لیکن اگر آپ مجھے اگنور کریں گے تو یقیناً مجھے برا لگے گا۔“

”آپ کو بھی کوئی اِگنور کرسکتا ہے بھلا اور وہ بھی مجھ جیسا معصوم، مظلوم شوہر۔“ انہوں نے مسکرا کر چھیڑا۔

”اگر آپ مظلوم ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ میں ظالم ہوں۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ خود بہت سمجھ دار ہیں۔“ وہ پھر مسکرائے۔ ان کو مسلسل مسکراتا دیکھ کر ان کے دل میں جیسے خوشیوں کی پھوار برسنے لگی تھی۔

شادی کے آٹھ سال بعد خدا نے انہیں یہ خوش خبری عطا کی تھی دونوں ہی بے پناہ خوش تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ آٹھ سال بھی ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے گزارے تھے اور کبھی ایک لمحے کو بھی انہوں نے خدا سے شکوہ نہیں کیا تھا لیکن جب دنیا والے طرح طرح کے سوال کرتے اور ان کو اس کمی کا احساس دلاتے تو وہ دکھی ہوجایا کرتیں ایسے موقع پر وہی ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتے تھے۔

”آپ خدا کا شکر ادا کریں جس نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اگر ایک نعمت نہیں دی تو کیا ہوا۔ ہم ایک دوسرے کے سہارے اپنی زندگی بہت خوشی خوشی گزار سکتے ہیں۔“ اور جب وہ ان کو اس طرح حوصلہ دیتے تو وہ اپنے شوہر کی محبت اور ان کے صبر و شکر کے سامنے اپنے آپ کو بہت کمتر محسوس کرتیں۔

انہیں تو یہ پتا ہی نہیں تھا کہ کلیم صاحب کو بچے اس قدر پسند ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی بچوں کے لیے اپنی خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں انہیں بچوں سے کوئی خاص لگاؤ ہی نہیں ہے لیکن اب ان کی خوشی اور مسرت کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں شوہر کے لیے محبت اور عقیدت اور بڑھ گئی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھیں کہ خدا اُن کے شوہر کی خواہش کو پورا کردے لیکن جب نرس نے خوش خبری سنائی کہ خدا نے انہیں بیٹا عطا کیا ہے تو انہیں ایسا لگا جیسے خوشی اور توانائی کی لہریں ان کی رگ رگ میں گردش کرنے لگی ہوں۔ اس وقت ایک لمحے کو بھی انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ اِن کے شوہر کو بیٹی کی خواہش تھی۔

”آپ کو تو بیٹی کی خواہش تھی۔“ وہ نومولود بچے کو گود میں لیے پیار کررہے تھے تو انہیں خیال آیا۔

”وہ تو اب بھی ہے۔“ وہ کھل کر مسکرائے۔ وہ شوہر کے اس جملے پر کچھ چپ سی ہوگئیں تو وہ آہستہ سے بولے۔

”فکر نہ کرو، اگلی دفعہ خدا ہماری اس خواہش کو ضرور پورا کردے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ انہوں نے صدقِ دل سے دعا کی اور پھر اگلی بار بھی وہ بیٹی کے منتظر رہے اور پھر بیٹی کے بجائے خدا نے انہیں بیٹے سے نواز دیا پھر دو بیٹوں کے بعد تو جب تیسری بار وہ امید سے ہوئیں تو ان کی بھی شدت سے یہ خواہش تھی کہ اس دفعہ ان کے گھر خدا کی رحمت نازل ہوجائے لیکن شاید خدا ان کے صبر کے نتیجے میں انہیں بیٹوں کی صورت میں اپنی نعمتیں دے کر آزما رہا تھا۔

تیسرے بیٹے کے بعد تو کلیم صاحب اپنی خواہش سے دستبردار ہوگئے اور وہ بھی بچوں اور گھر میں اتنی مصروف ہوگئیں کہ کسی خواہش اور کسی آرزو کا ہوش ہی نہیں رہا۔

خدا کا نظام کچھ ایسا ہے کہ کبھی دعائیں فوراً قبول ہوجاتی ہیں اور کبھی ان کی قبولیت میں تاخیر ہوجاتی ہے اور انسان تو بہت جلد باز اور بے صبرا ہے ......وہ بہت جلد مایوس ہوجاتا ہے۔ وہ اس بات سے لاعلم ہوتا ہے کہ اس کا پروردگار دعاؤں کی قبولیت میں تاخیر کرکے اپنے بندوں کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

سب سے چھوٹے بیٹے کی پیدائش کے پورے چھ سال بعد جب انہیں خدا کی طرف سے پھر خوش خبری ملی تو وہ بے حد گھبرا سی گئیں اب اُن کی عمر بھی چالیس کے قریب تھی اور ان میں وہ طاقت اور ہمت بھی نہ رہی تھی۔

"مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے، میں اس بچے کو کیسے پالوں گی۔"

"گھبرائیں نہیں، والدین تو صرف وسیلہ ہوتے ہیں ورنہ پالتا تو اللہ ہی ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھیے۔" کلیم صاحب نے ہمیشہ کی طرح ان کی ہمت بڑھائی۔ شوہر کی محبت اور حوصلے نے ان کے اندر یک گونہ اطمینان پیدا کر دیا اور وہ پوری تندہی سے آنے والے مہمان کی تیاریوں میں مصروف ہوگئیں لیکن اس دفعہ وہ بہت زیادہ نقاہت اور کمزوری محسوس کر رہی تھیں۔ ان میں ہیموگلوبن کی بہت کمی ہوگئی تھی اور ان کا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہوگیا کہ بچی کی پیدائش کے چند گھنٹوں بعد ہی وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ کلیم صاحب کی تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی انہیں تو جیسے سکتہ ہوگیا تھا۔ کئی دن تک وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے پھر جب ان کی والدہ نے بچی کو ان کی گود میں دے کر کہا۔

"بیٹا مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں سکتے، اس بچی کو دیکھو جو پیدا ہوتے ہی ماں سے بچھڑ گئی۔ تمہیں اب اسے باپ کے ساتھ ساتھ ماں بن کر بھی پالنا ہے۔" اور چند دنوں کی بچی نے جب اپنی معصوم آنکھیں کھول کر ان کو دیکھا تو انہیں ایسا لگا جیسے ساری دنیا سمٹ کر ان دو آنکھوں میں بس گئی ہو۔

اس دن کے بعد سے جیسے حنا اُن کے وجود کا حصہ بن گئی تھی، وہ ہنستی تو وہ ہنستے، وہ روتی تو وہ بھی افسردہ ہو جاتے، وہ آفس سے آنے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ رہتے اور وہ بھی باپ کی اتنی شیدا کہ ان کے جانے کے وقت سے ہی ان کی راہ دیکھتی رہتی۔

حنا جیسے جیسے..... بڑی ہو رہی تھی ان کی محبت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھار اُن کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کو دیکھ کر ان کی ماں پریشان ہو جاتیں اور سمجھاتیں۔ "بیٹیوں سے اتنا پیار نہیں کرتے، انہیں دوسرے... گھر جانا ہوتا ہے تم اتنا پیار کرو گے تو وہ اپنی سسرال میں کیسے رہ سکے گی۔ وہ تو ہر دم تمہی کو یاد کرے گی۔" اور اپنی اماں کی یہ باتیں سن کر وہ روہانسے ہو جاتے۔

"اماں ایسی باتیں نہ کیا کیجیے، میرا دل بند ہونے لگتا ہے۔"

"بیٹا یہ تو دنیا کا دستور ہے، سرکارِ دو عالم نے بھی اپنی بیٹی کو رخصت کیا جن سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔"

"اماں جب وہ وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا آپ ابھی سے یہ باتیں کر کے میرا دل نہ ہولائیں۔" جب بھی اماں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں وہ ایسی ہی باتیں کر کے بات ختم کر دیتے۔ وہ حقیقت میں حنا کو خدا کی رحمت سمجھتے اور ہر لمحے اس کی رحمت کا شکر ادا کرتے رہتے۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی اس کا رنگ روپ نکھرتا جا رہا تھا۔ وہ میٹرک میں تھی کہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی سوالی بن کر آ جاتا۔ دادی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی پوتی کو اس کے گھر کا کر دیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی آنکھ بند ہو جائے اور بچی کے رشتے کی فکر کرنے والا کوئی نہ رہے۔ ان کے سامنے کئی مثالیں موجود تھیں کہ جن بچیوں کی مائیں نہیں ہوتیں ان کے گھر مشکل ہی سے بستے ہیں کیونکہ لڑکیوں کے رشتے کے لیے جتنی فکر ایک ماں کو ہوتی ہے کسی کو نہیں ہوتی جبکہ باپ تو عام طور پر اس معاملے میں خاصے بے پروا ہوتے ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سب ہو جائے گا۔ اماں جب بھی ان سے کسی رشتے کا ذکر کرتیں وہ کچھ سنے بغیر صاف انکار کر دیتے۔

"اماں ابھی حنا بہت چھوٹی ہے، میں اس کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے اس کی شادی نہیں کروں گا۔" اور بیٹے کے اس طرح صاف جواب دینے پر

اماں بادلِ ناخواستہ خاموش ہو جاتیں۔

☆☆☆

وہ بی اے کا امتحان دے کر گھر میں جی بھر کے بور ہو رہی تھی کہ پھر اس کے رشتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چند ماہ پہلے ہی بڑے دونوں بھائیوں کی شادی ہوئی تھی دونوں بھابیاں سگی بہنیں تھیں گھر میں ایک دم ہی رونق آ گئی تھی۔ ہر وقت قہقہے گونجنے لگے تھے۔ وہ باپ اور بھائیوں کے ساتھ ساتھ بھابیوں کی بھی چہیتی بن گئی تھی۔ اس کے باوجود دادی کو اس کی شادی کی فکر چین نہیں لینے دیتی تھی۔ سب کچھ اچھا تھا۔ بھاوجیں بہنوں سے بڑھ کر خیال رکھتی تھیں۔ تینوں بھائی جان دیتے تھے مگر دادی پھر بھی مطمئن نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں خونی رشتوں کو اس طرح بدلتے دیکھا کہ اب ہر رشتے پر سے اُن کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ بہت ضعیف ہو چکی تھیں اب انہیں ٹھیک طرح سے کچھ سنائی دیتا تھا نہ دکھائی دیتا تھا ان کے تمام حواس آہستہ آہستہ جواب دیتے جا رہے تھے لیکن حنا کا گھر بسانے کی خواہش جوانی کی امنگوں کی طرح تر و تازہ اور توانا تھی۔

"کلیم تم آخر کس دنیا میں رہتے ہو۔ اگلے ماہ حنا پورے بیس سال کی ہو جائے گی اور یہی عمر لڑکیوں کی شادی کے لیے بہترین ہوتی ہے۔ تم کب تک اس طرح انکار کرتے رہو گے، یہ رشتے بھی اللہ کی نعمت ہیں اس طرح کفرانِ نعمت نہ کرو۔ خدا کو تکبر کرنا پسند نہیں ہے۔" گھر میں جب سے اظفر کا رشتہ آیا تھا اماں کو ایک لمحے کو قرار نہیں تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے بیٹے کو سمجھاتی رہتیں اور پھر کچھ اماں کے مسلسل اصرار اور پھر اظفر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے بعد کلیم صاحب کے موقف میں بھی وہ سختی نہ رہی تھی۔

"پاپا اظفر بہت اچھا لڑکا ہے۔ اتنا قابل، لائق، اتنی کم عمری میں اتنے اچھے عہدے پر فائز ہے پھر ان کا خاندان بھی دیکھا بھالا ہے۔ مائرہ کے ماما اور پاپا کی بھی یہی رائے ہے کہ ہمیں اس رشتے کے لیے ہاں کر دینی چاہیے۔" ان کا بڑا بیٹا سلیم بھی اس رشتے کی پُرزور حمایت کر رہا تھا کہ اظفر اس کی بیوی کا چچا زاد بھائی تھا اور یہ کہ اس کی بیوی کے چچا خاندان میں خاصے بااثر اور خوشحال تھے۔ اس کی شادی کو صرف چھ ماہ ہوئے تھے اور وہ دنیا کو اپنی بیوی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پاپا میرا بھی یہی خیال ہے کہ حنا کو اس سے بہتر رشتہ نہیں مل سکتا۔" سلیم سے چھوٹا شہیر بھی بھائی کا ہم نوا تھا کہ اس کی بیوی بھی یہی چاہتی تھی۔

"میرا خیال ہے پہلے ہمیں حنا سے پوچھنا چاہیے۔" سب سے چھوٹا سرید حنا کو سب سے زیادہ چاہتا تھا اس نے مشورہ دیا۔

"ظاہر ہے اس سے تو پوچھا ہی جائے گا اس کی مرضی کے بغیر میں کسی رشتے کے لیے رضامندی نہیں دوں گا۔" انہوں نے دل کڑا کر کے رضامندی کا اظہار کیا۔

یہ حقیقت تھی کہ اظفر بہت اچھا لڑکا تھا اس کے والدین بھی پڑھے لکھے تھے۔ ان کا خاندان بھی بہت اعلیٰ و مہذب تھا۔ سب کچھ اچھا تھا لیکن نہ جانے کیا تھا کہ ان کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

"حنا میرے پاس سے چلی جائے گی۔" وہ سوچتے تو ان کے دل پر گھونسا سا پڑتا۔ "کیا ہوا ساری ہی لڑکیاں اپنی سسرال میں رہتی ہیں لیکن حنا تو...... میں...... حنا کو ایک دن نہ دیکھوں تو مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا...... پھر کیا ہوگا......؟ کیا حنا روز میرے گھر آئے گی؟ ایسا کیسے ممکن ہے...... شادی کے بعد تو لڑکیوں کو میکے آنے کے لیے بھی شوہر سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ اگر اظفر اجازت نہ دے...... حنا کی ماں بھی تو...... ایک ایک مہینہ گھر نہیں جاتی تھیں اور وہ اپنے گھر جانے کے لیے کہتیں تو مجھے بھی تو برا لگتا تھا اور میری اماں کو بھی...... ان کے جانے پر ہمیشہ

اماں کا موڈ آف ہوجاتا تھا، اماں کہتی تھیں وہی لڑکیاں سسرال میں خوش رہتی ہیں جو میکے سے زیادہ تعلق نہ رکھیں تو کیا حنا کو بھی اپنا گھر بسانے کے لیے کم کم آنا ہوگا......‘‘خود ہی وہ سوال جواب کرتے ان کے دل میں کہیں ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔

رشتہ منظور ہوتے ہی دونوں گھروں میں جھٹ پٹ تیاریاں شروع ہوگئیں اور پلک جھپکتے ہی وہ دن آگیا کہ جس کے بارے میں سوچتے ہوئے ان کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ حنا دلہن بن کر اتنی حسین لگ رہی تھی انہوں نے گھبرا کر اپنی نظریں جھکالیں کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے۔ وہ رخصتی کے وقت ان کے گلے لگ کر اس طرح روئی کہ ان کا دل چاہا وہ اسے لے کر کہیں دور چلے جائیں، انہوں نے نہ جانے کس دل سے اسے رخصت کیا اور اسے رخصت کرکے اپنے بیڈروم میں آئے تو انہیں لگا جیسے ہر طرف سناٹوں کا راج ہوگیا۔ تنہائیاں ہاتھ پھیلائے ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ بیٹی خدا کی رحمت ہے اور خدا کی رحمت کو اپنے سے جدا کرنا کیسا دشوار اور صبر آزما مرحلہ تھا۔

وہ حنا کی تصویر کو سینے سے لگائے واپس لاؤنج میں ہی آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس کی ڈھیروں تصویریں گھر میں لگا رکھی تھیں۔ انہیں نہ جانے کیا، کیا یاد آرہا تھا۔ وہ اس کے کتنے ناز اٹھاتے تھے۔ اس کی چیزوں کے لیے ماں کی طرح شاپنگ کرتے...... وہ اس کے لیے ہر رنگ کے کلپ، ہر رنگ کی پونیاں خریدتے تھے۔ وہ ایک ماں سے زیادہ اسے بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو صبح صبح اپنے ہاتھوں سے ناشتا کرا کے خود اسکول پہنچاتے اور چھٹی کے وقت آفس سے لینے آتے اور گھر پہنچا کر کھانا کھلا کر دوبارہ آفس جاتے۔ وہ بھی باپ کی شیدائی تھی۔ ہر وقت باپ کے گرد دیوانہ وار پھرتی رہتی۔ ان کے دل میں ایک ہُوک سی اٹھی، رخصتی کے وقت وہ جس طرح روئی تھی اس نے ان کے پورے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں پائے تھے۔ حالانکہ سارے گھر والے رخصتی کے بعد اُن کے پاس بیٹھے اُن کا دل بہلانے کی کوشش کررہے تھے۔ حنا کی باتیں یاد کررہے تھے۔ اُن کی محنتوں اور قربانیوں کو سراہ رہے تھے۔ شادی کے انتظامات کی تعریفیں کررہے تھے لیکن انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سب سے معذرت کرکے اپنے کمرے میں آگئے۔ آج پہلی رات گھر حنا کے وجود سے خالی تھا۔ روتے روتے نہ جانے کس پہر ان کی آنکھ لگ گئی اور پھر اس وقت کھلی جب وہ خوشبوؤں میں بسی مسکراتے ہوئے ان کو آوازیں دے رہی تھی۔

’’پاپا......‘‘ وہ ان کے گلے سے لگ گئی۔

’’تم کب آئیں......؟‘‘ انہیں لگا ان کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی بکھر گئی۔

’’میں ابھی ابھی آئی ہوں، میں تو سمجھ رہی تھی آپ میرا انتظار کررہے ہوں گے لیکن آپ تو گہری نیند سو رہے تھے۔‘‘ وہ مصنوعی خفگی سے بولی تو چاہتے ہوئے بھی وہ یہ نہ کہہ سکے کہ انہوں نے پوری رات کس کرب میں گزاری تھی۔

’’ہاں، رات کو میں بہت تھک گیا تھا......‘‘ اُن کے لہجے میں برسوں کی تھکن گونج رہی تھی۔

’’مجھے معلوم ہے، آپ نے کام بھی تو کتنا کیا تھا......بس اب آرام کریں۔‘‘ اس نے پیار سے اُن کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

’’واقعی اب تو آرام ہی کرنا ہے، سارے کام تو ختم ہوگئے۔‘‘ انہیں لگا جیسے سب کچھ ختم ہوگیا اور کچھ بھی باقی نہیں رہا۔

’’پاپا...... آپ اتنے اداس کیوں ہیں؟ اگر آپ اس طرح اداس ہوں گے تو میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔‘‘ وہ باپ کو افسردہ دیکھ کر ضبط کھو بیٹھی اور کاندھے پر سر رکھ کر رونے لگی اور اس کے آنسوؤں نے ان کے پورے وجود کو پانی کردیا۔

’’پاپا آپ اپنے آپ کو سنبھالیں، حنا آپ کو دیکھ کر کتنی پریشان ہورہی ہے۔‘‘ بڑی بھابی جو اسے بلانے آئی تھیں اُن دونوں کو روتا دیکھ کر خود ہی آبدیدہ ہوگئیں۔

’’جاؤ بیٹا سب کے ساتھ بیٹھو، میں ابھی فریش ہوکر آتا ہوں۔‘‘ وہ اس کی پیشانی چوم کر کھڑے ہوگئے اور اُن کے تھکے تھکے وجود اور لڑکھڑاتی چال کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔

’’بھابی پاپا کا بہت خیال رکھیے گا۔ پاپا نے ہم لوگوں کو بہت محنت سے پالا ہے۔‘‘ وہ باپ کے واش روم میں جانے کے بعد بھابی سے لپٹ کر رو دی۔

’’پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘ بھابی نے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے سمجھایا لیکن نہ جانے کیوں وہ مطمئن نہ ہوسکی۔

☆☆☆

شادی کے ابتدائی دنوں میں تو وہ روزانہ ہی باپ سے ملنے کے لیے آتی پھر وہ اور اظفر ایک مہینے کے لیے گھومنے پھرنے چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد زندگی کی روٹین شروع ہوئی تو اسے پتا چلا کہ اس کی سسرال بہت بڑی ہے اور آئے دن خاندان میں کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی ہے۔ اس کے سسرال والے بہت ملنسار اور با اخلاق لوگ تھے ہر جگہ جانا، ہر ایک کی خوشی اور غم میں شریک ہونا ان لوگوں کا شیوہ تھا۔ اسے بھی یہ سب اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی آدم بیزار نہیں تھی لیکن ان مصروفیات کی وجہ سے اسے میکے جانے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ کبھی کبھی پورا ہفتہ گزر جاتا اور وہ پاپا سے مل ہی نہیں پاتی، اُدھر ان کا یہ حال تھا کہ ان کی نظریں اس کے انتظار میں دروازے پر جمی رہتیں۔ ہر آہٹ پر انہیں اس کے آنے کا گمان ہوتا۔

وہ روز بروز کمزور اور بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ہر دفعہ جب ان سے مل کر آتی یہ عہد کرتی۔

''اب میں روزانہ پاپا سے ملنے آؤں گی اور ایک دن بھی ناغہ نہیں کروں گی۔'' لیکن ایسا ہونا ممکن نہ ہوتا کیونکہ اس کی ساس کو بھی اس کا آئے دن میکے جانا پسند نہیں آتا۔ وہ جب بھی میکے جاتی اور واپس آتی تو ان کا موڈ آف پاتی اور پھر وہ بات بے بات نکتہ چینی کرتیں کبھی اپنی مثال دیتیں کہ وہ شادی کے بعد مہینوں اپنی ماں کے گھر نہیں جاتی تھیں کبھی دوسروں کی بہوؤں کا ذکر کرتیں جو شادی کے بعد میکے جانے کا نام نہیں لیتی تھیں اور یہ ساری باتیں اظفر کے سامنے کی جاتیں جنہیں سن کر اظفر کو بھی احساس ہوتا کہ وہ اپنے میکے جانے کے لیے زیادہ ہی بے چین رہتی ہے اس لیے کبھی کبھار اس کا موڈ بھی آف ہو جاتا۔ گھر میں عجیب کھنچاؤ پیدا ہو جاتا تو وہ گھر کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے اپنے دل پر جبر کر لیتی۔

☆☆☆

''حنا پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ اسپتال میں ہیں۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔'' وہ دوپہر کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھی تو اظفر کا فون آیا۔

''کیا ہوا...... پاپا اسپتال میں ہیں؟'' اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔ ان کو بہت ہلکا سا اٹیک ہوا ہے۔'' اظفر نے بہت نارمل انداز میں اسے بتایا جبکہ اُن کو شدید اٹیک ہوا تھا وہ آئی سی یو میں تھے اور ڈاکٹرز ان کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں تھے لیکن وہ تو معمولی سے اٹیک کا سن کر اتنا پریشان تھی کہ سارا گھر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ سب اسے تسلی اور دلاسے دے رہے تھے لیکن اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ اظفر کے گھر آنے تک وہ آدھی جان کی ہو چکی تھی۔ اس نے بھابیوں کو فون کیا انہوں نے بھی تسلی دینے کی کوشش کی لیکن کچھ ایسا تھا جو اسے شدت سے بے چین کر رہا تھا اور جب اس نے اسپتال میں جا کر پاپا کو دیکھا تب اسے اپنی بے قراری کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کی چھٹی حس اسے خبردار کر رہی تھی۔ پاپا کی حالت دیکھ کر اسے یقین آ گیا تھا کہ اب اس محبت کے شجر کا سایہ زیادہ دیر تک اس کے سر پر نہیں رہ سکے گا۔ دو دن اور دو راتیں وہ سی سی یو میں ان کے بیڈ کے ساتھ کھڑی رہی اور دو دن بعد جب پاپا آخری سانسیں لے رہے تھے اور اسے ڈاکٹروں نے وہاں سے ہٹا دیا تھا تب اسے لگا جیسے زندگی کے سارے رنگ اُڑ گئے اور ساری دنیا رنگوں اور روشنیوں سے خالی ہو گئی۔

☆☆☆

''تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' پاپا کے سوئم کی فاتحہ کے بعد اظفر نے اس سے پوچھا تو وہ خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

''میرا مطلب ہے ابھی تم یہاں رکنا چاہتی ہو یا......؟'' اظفر نے رکتے رکتے پوچھا۔

''ابھی تو مشکل ہے سب افسوس کرنے میرے ہی پاس آتے ہیں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، ویسے تم دیکھ لو اگر مناسب سمجھو تو......'' وہ ادھوری بات کہہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں لیکن روزانہ فاتحہ میں شرکت کے لیے آ جایا کروں گی۔'' وہ اس کی ہچکچاہٹ اور ادھورے جملوں کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

☆☆☆

کل ہی پاپا کا دسواں ہوا تھا اور ان کی فاتحہ سے گھر آتے ہوئے اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے پاپا اسے خدا حافظ کہنے دروازے پر کھڑے ہوں۔ پاپا کو

دنیا سے رخصت ہوئے دس دن ہو چکے تھے لیکن ان کے کمرے میں جا کر اسے لگتا تھا وہ وہیں موجود ہیں اور اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بے شمار پچھتاوؤں میں گھری رہتی۔ اسے لگتا وہ باپ کی محبت کا حق ادا نہیں کر سکی۔ اس نے سب کی طرح پاپا کو تنہا چھوڑ دیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ اتنی جلدی دنیا سے چلے گئے۔ اس کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا وہ ہر وقت پاپا کی باتیں کرتی رہے، ان کو یاد کرتی رہے۔ ان کا ذکر کرتی رہے لیکن سسرال میں ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے سسرال میں سب کے ساتھ ہنسنا بولنا بھی پڑتا تھا۔ وہ وہاں ہر وقت رونی صورت بنائے نہیں رہ سکتی تھی۔ اس پر سب سے زیادہ اعتراض تو اظفر کو ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ گھر میں آئے تو حنا ہمیشہ سجی بنی، ہنستے مسکراتے اس کا استقبال کرے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ کر رہی تھی جو اس کے سسرال والوں کی خواہش تھی لیکن اب ذیشان کی شادی میں شرکت کے لیے سب کا اصرار اس کے لیے بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔

''کیا کسی کو میرے غم کا احساس نہیں؟ کیا میں اپنی مرضی سے اپنے باپ کا غم بھی نہیں منا سکتی؟ کیا اظفر نہیں جانتے کہ مجھے پاپا سے کتنی زیادہ محبت تھی؟ کیا میرے دل سے پاپا کی محبت اتنی جلدی ختم ہو سکتی ہے؟ میرا باپ جس نے مجھے ماں باپ بن کر پالا ...... کیا میں دس دن میں ان کی محبت فراموش کر کے شادیوں میں شریک ہوں، خوشیاں مناؤں ...... لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ہنسوں، مسکراؤں ...... کیا مجھے اپنے احساس کی قربانی دینی ہو گی۔ ہاں ...... شاید وہی گھر بستے ہیں جہاں کی عورت گھر کے سکون اور خوشیوں کے لیے اپنے ہر جذبے اور احساس کو قربان کر دیتی ہے۔''

وہ بھی اظفر کے کزن ذیشان کی شادی کی ہر تقریب میں اس طرح شریک ہوئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جیسے ابھی چند دن پہلے اس کے پاپا کا انتقال ہوا ہی نہ ہو۔ اس نے ہر تقریب میں تقریب کی مناسبت سے لباس بھی پہنا، جیولری بھی پہنی، میک اپ بھی کیا، مبارک بادیں بھی دیں، جبراً مسکراتی بھی رہی پھر بھی اس کی ساس کو شکوہ تھا کہ حنا شادی کی تمام تقریبات میں ہر جگہ منہ بنائے بیٹھی رہی بلکہ اس کی رونی صورت دیکھ کر مجھے سب کو بتانا پڑا کہ ابھی اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے اور اس پر بڑے تایا کی بہو نے کہہ بھی دیا۔

''سب ہی کے ماں باپ مرتے ہیں ایسے تو کوئی سوگ نہیں مناتا۔ آخر دنیا کے ساتھ تو چلنا پڑتا ہے اور اگر اس طرح مرنے والوں کا سوگ مناتے رہے تو دنیا کے کام کس طرح ہوں گے۔'' ساس کے اس طرح جتانے پر اسے یاد آیا کہ کل تک یہی تایا کی بہو تھیں جو اپنی دیورانی کے بارے میں کہہ رہی تھیں جو ماں کے بعد کسی رشتے دار کی شادی میں شریک ہوئی تھی تو تایا کی بہو نے حنا کے سامنے اس کی ساس سے کہا تھا۔

''کیسا اندھیر ہے، ماں کا چہلم بھی نہیں ہوا اور ہماری دیورانی صاحبہ اپنے کزن کی شادی میں شریک ہوئی تھیں، ان کو دیکھ کر تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ابھی چند دن پہلے ان کی ماں کا انتقال ہوا ہے۔'' واقعی دنیا کتنی عجیب ہو گئی ہے لوگ حد درجہ دوغلے ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

وقت کا دریا بہتا چلا گیا اور اپنے ساتھ بے شمار واقعات اور حادثات کو بھی بہالے گیا۔ حنا کے دو بچے ہو گئے اور دونوں جوانی کی سرحدوں کو چھو رہے تھے۔ اظفر کی ماں چند دن بیمار رہ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اظفر پر ماں کی موت کا بہت اثر تھا۔ وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔

کرم فرمائیاں

عالیہ ضیا بلگرامی

ٹیلی فون کی متواتر بجتی تیز گھنٹی نے بالآخر اس کو نیند کی حسین وادیوں سے باہر لا کھینچا۔ وہ جو اپنے سارے کام نپٹا کر اب آرام سے دیر تک سونے کا پروگرام بنا کر لیٹی تھی اور ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی سوئے ہوئے کہ اس تیز گھنٹی نے اس کو اٹھا دیا۔ اس نے نیند سے بھاری ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھول کر دیکھا۔ دوپہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے، فون کرنے والا بھی اپنے نام کا ایک ڈھیٹ تھا جو گھنٹیاں بجائے چلا جارہا تھا۔



انہی دنوں حنا کے بڑے بھائی کے بیٹے کی شادی تھی۔ بھائی کے گھر کی پہلی خوشی تھی ان کے بچوں کی وہ اکلوتی پھوپھی تھی۔ فارس نے بڑے مان سے کہا تھا۔

''جب تک پھوپو نہیں آئیں گی بارات روانہ نہیں ہوگی۔ پھوپو کو میرے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھنا ہوگا۔'' وہ مایوں، مہندی میں شریک نہیں ہوئی تھی لیکن بارات میں جانا بہت ضروری تھا۔ وہ شادی میں جانے کے لیے تیار ہورہی تھی تو اظفر نے حیرانی اور ناگواری سے اسے دیکھا۔

''تم کہاں جارہی ہو؟''

''آج فارس کی بارات ہے، آپ کو یاد نہیں۔''

''یاد تو ہے لیکن کیا تم شادی میں جاؤ گی؟'' اظفر حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ظاہر ہے، وہاں جانے کے لیے ہی تو تیار ہورہی ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟'' اظفر کا لہجہ بے حد تکلیف دہ تھا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے لپ اسٹک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''حیرت ہے ابھی کچھ دن پہلے میری ماں کا چہلم ہوا ہے اور تم شادی میں جانے کی تیاریاں کررہی ہو۔''

''آپ جانتے ہیں بھابی کے گھر والے کتنے تیز اور چالاک لوگ ہیں، میرے نہ جانے پر وہ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔'' اس نے کئی سالوں کے کہے ہوئے اسی کے الفاظ دہرائے۔

''تمہیں خاندان والوں کی باتوں کی فکر ہے اور میرے غم کا اندازہ نہیں۔'' وہ شدتِ غم سے کراہا۔

''مجھے تو آپ لوگوں نے یہی سکھایا ہے کہ ماں باپ کے غم سے زیادہ اہم خاندانی رسوم ورواج ہوتے ہیں۔''

''یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو ہمارے گھر میں تو آج تک اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''آپ بھول گئے جب پاپا کا انتقال ہوا تھا اور ان کا تو چہلم بھی نہیں ہوا تھا اور ذیشان کی شادی ہوئی تھی تو آپ اور آپ کے گھر والوں کے اصرار پر میں شادی میں شریک ہوئی تھی نہ صرف شادی میں بلکہ مایوں، مہندی، ڈھولکی ہر تقریب میں......'' اس کے لہجے کی کڑواہٹ انتہا پر تھی۔

''کمال ہے، مجھے تو ایسا کچھ بھی یاد نہیں اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے اور کس نے تم سے اصرار کیا تھا؟'' اظفر کو واقعی کچھ یاد نہیں تھا اور یہ ایسی یاد رکھنے والی بات بھی نہیں تھی لیکن پھر اسے کیوں یاد تھی۔ اس کے دل میں چبھی ہوئی یہ پھانس آج تک نہیں نکلی تھی۔ واقعی عورتیں بڑی جذباتی اور حساس ہوتی ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو دل پر لے لیتی ہیں اور یہ مرد...... اس نے اظفر کی طرف دیکھا اظفر کے چہرے پر ماں کی جدائی کا تازہ تازہ غم رقم تھا۔ اس کا دل پانی ہونے لگا اور چند لمحوں بعد وہ فون پر اپنی بھابی سے معذرت کررہی تھی۔

''بھابی اظفر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں شادی میں نہیں آسکوں گی۔ جی...... جی آپ تو جانتی ہیں اظفر کو اپنی ماں سے کتنی محبت تھی اب ایسی صورت میں مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ میں انہیں تنہا چھوڑ کر شادی میں شریک ہوجاؤں۔ ہاں...... ہاں آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اب تو چہلم بھی ہوچکا ہے مگر پھر بھی۔'' وہ فون رکھ کر پلٹی تو اظفر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ اسے لگا اس نے جو کچھ کیا صحیح کیا اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔



''کوئی ضروری فون نہ ہو......!'' فون اٹھایا تو دوسری طرف ربیعہ باجی تھیں اس کے شوہر سمیر کی کزن۔

''ارے ندا! کہاں غائب ہو بھئی؟ اتنی دیر سے گھنٹی بج رہی ہے تم فون ہی نہیں اٹھا رہیں، کہیں سو تو نہیں رہی تھیں......؟'' انہوں نے بھول پن سے پوچھا تو وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی...... گرمیوں کے موسم میں اور بھری دوپہر میں اکیلے گھر میں وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟ اس کو ویسے بھی دوپہر میں سونے کی عادت بچپن سے تھی۔ جس دن سو نہ پاتی اس کی طبیعت گری گری سی رہتی۔ لیکن شادی کے بعد اس کی دوپہر کی نیند اکثر اسی طرح خراب ہوتی کیونکہ اس کی سسرال میں سب ہی دوپہر کو فون... کرنے کے عادی تھے۔

ربیعہ باجی کا فون تھا۔ اس کی سسرالی رشتے دار' اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی خوش اخلاقی خود پر طاری کر کے ان سے بادلِ ناخواستہ باتوں میں مشغول ہو گئی۔ ان کو کوئی خاص ضروری بات نہیں کرنی تھی۔ بس ٹائم پاس کرنے کے لیے انہوں نے اس کا ٹائم خراب کر دیا۔ پورے بائیس منٹ تک اس کا دماغ خالی کرنے کے بعد بالآخر جب انہوں نے فون رکھا تو اس کی نیند غائب ہو چکی تھی سو وہ دل ہی دل میں غصے سے کھولتی اپنے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔

''مجھے موبائل فون اب لے ہی لینا چاہیے تاکہ۔ دوپہر کو سوتے وقت باہر والے فون کی بیل آف کر دوں گی۔ موبائل کا نمبر میرے اور سمیر کے بہن بھائیوں کے پاس ہوگا کوئی ضروری کال ہوگی تو موبائل پر اٹینڈ کر لوں گی۔ میں آج ضرور سمیر سے بات کروں گی کہ مجھے ایک موبائل فون لے کر دیں۔ حد ہو گئی آج کل تو بچے بچے کے پاس موبائل ہوتا ہے یہاں تک کہ ماسیاں، ڈرائیور، نائی وغیرہ بھی موبائل لیے پھرتے ہیں ایک میں ہوں جو اس نعمت سے محروم ہوں۔ سمیر کہتے ہیں تم گھر پر رہتی ہو تم کو کیا ضرورت ہے موبائل کی......؟ لیکن آج میں ان کو قائل کر کے ہی چھوڑوں گی۔'' وہ دل ہی دل میں ارادہ کر کے لیٹ گئی اور سمیر کو منانے کا طریقہ سوچنے لگی۔

❖❖❖

شام میں سمیر آیا تو اس نے پہلے سے چائے کے ساتھ پکوڑے اور سینڈوچز تیار کر رکھے تھے۔ وہ عام طور پر چائے کے ساتھ بسکٹ لیتا تھا اور کھانا جلدی کھا لیتا تھا لیکن آج یہ لوازمات دیکھ کر چونک گیا۔

''خیریت...... کوئی آ رہا ہے کیا؟''

''نہیں، کوئی نہیں... ویسے ہی موڈ ہو رہا تھا تو بنا لیا۔ آپ لیجیے نا بہت مزے کے ہیں۔'' اس نے پلیٹ میں پکوڑے اور کیچپ ڈال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''تم نے بنائے ہیں تو مزے کے تو ہوں گے، تمہارے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔'' سمیر نے ہمیشہ کی طرح کھلے دل سے تعریف کی۔

''یہ تو ہے......!'' وہ اِترائی۔ پھر دونوں چائے پینے کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد جب سمیر فریش ہو کر آرام سے بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے پاس جا بیٹھی۔

''سمیر آج ربیعہ باجی کا فون آیا تھا۔''

''اچھا...... خیریت ہے...؟''

''ہاں خیریت تو ہے۔ انہوں نے دوپہر کے ساڑھے تین بجے صرف گپ شپ کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ حالانکہ سب کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں دوپہر میں ضرور سوتی ہوں پھر بھی روزانہ کسی نہ کسی کا فون آ جاتا ہے اور میری نیند خراب ہو جاتی ہے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''بھئی اس کا تو بہت آسان حل ہے کہ تم فون نہ اٹھایا کرو۔'' سمیر نے آرام سے کہا۔

''لیکن فون کی گھنٹی سے آنکھ تو کھل ہی جاتی ہے۔''

''تو بھئی گھنٹی کی آواز بند کر دو۔ شام میں کھول دیا کرو۔''

''اُفوہ...... بھئی اگر کوئی ضروری کال ہو تو کیسے پتا چلے گا؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''تو پھر برداشت کرو بھئی' میں کیا کروں۔ اب میں دفتر چھوڑ کر فون اٹینڈ کرنے گھر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ گھر میں اور کوئی ہے بھی نہیں اس لیے ظاہر ہے تم ہی فون سنو

گی۔'' وہ عاجز آ کر بولا۔

''اس مسئلے کا ایک اور حل ہے۔'' ندا نے جلدی سے کہا۔

''وہ کیا......؟'' سمیر نے ابرو اچکائے۔

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ایک موبائل فون لے دیں۔ اس کا نمبر صرف گھر والوں کے پاس ہوگا اگر کوئی ضروری کال ہوگی تو اس پر آ جائے گی۔ میں آرام سے ریسیو کر لوں گی۔'' ندا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ارے بھئی موبائل لے کر تم اپنی مشکلات میں اور اضافہ کر لو گی۔''

''ایسا نہیں ہوگا، میں اس کا نمبر ہر ایک کو نہیں دوں گی۔'' ندا نے ضد کی۔

''اچھا میں سوچوں گا۔'' سمیر نے بات ختم کر دی تو وہ بھی چپ ہو گئی۔

❖❖❖

دن اپنے معمول کے مطابق گزرتے گئے۔ اس نے کئی دفعہ سمیر کو یاد دلایا' اس نے ٹال دیا پر منع بھی نہیں کیا اس لیے وہ چپ کر کے رہ جاتی۔ تقریباً روز ہی دوپہر میں کوئی نہ کوئی اس کو جگا دیتا۔ سسرالی رشتے داروں کو بار بار منع بھی نہیں کر سکتی تھی ویسے سب بہت اچھے مزاج کے پُرخلوص لوگ تھے...... لیکن کوئی بھی دوپہر میں سونے کا عادی نہیں تھا۔ سب کو اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد دوپہر کا وقت فون کرنے کے لیے مناسب لگتا اور بھگتنا اس کو پڑتا۔

ندا کی سالگرہ قریب آ رہی تھی، سمیر نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس کو سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا اور پھر سالگرہ سے دو روز قبل ہی وہ موبائل سیٹ اور سم لے آیا اور لا کر ندا کے ہاتھ میں رکھا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

''ارے......! یہ کیا اتنا خوب صورت موبائل...... تھینک یو سوچ سمیر، یو آر سو سوئٹ......!'' وہ مسرت سے بولی۔

''یہ تمہارا برتھ ڈے کا تحفہ ہے تم کو پسند آیا...؟'' سمیر

کنارہ

سنو تمہیں علم ہے
کہ تم میری
محبت کا کنارہ ہو
اور
کنارے ساتھ چلتے ہیں
کنارے مل نہیں پاتے

مرسلہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں بہت لیکن برتھ ڈے تو میری پرسوں ہے۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میں نے سوچا کہ تم کم از کم اپنی سالگرہ والے روز دوپہر کی نیند سکون سے سولو۔ آج میں نے تم کو گفٹ اس لیے دیا ہے کہ سالگرہ سے پہلے تمہیں جن کو موبائل نمبر دینا ہے دے دو۔ پرسوں فون کی بیل دوپہر میں بند کر کے سوجانا......!'' سمیر نے کہا تو وہ خوش ہوگئی۔

''تھینک یو سو مچ سمیر......آپ کو میرا کتنا خیال ہے۔'' وہ اسی وقت خوشی خوشی موبائل سے اپنے گھر والوں کو فون کرنے بیٹھ گئی۔

❖❖❖

اگلے دن اس نے سمیر کے بہن بھائیوں اور اپنی چند خاص دوستوں کو بھی اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ اگلے دن اس کی سالگرہ تھی۔ صبح صبح سمیر نے اس کو وش کیا اور شام میں تیار رہنے کا کہہ کر آفس چلا گیا۔ وہ بھی اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ ماسی سے کام کروایا، کھانا وغیرہ بنایا اسی دوران دو تین فون کالز بھی اٹینڈ کیں۔

دوپہر میں اس نے اپنے پلان کے مطابق باہر والے فون کی گھنٹی بند کر دی اور سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ اے سی کھول کر آرام سے سونے کے لیے لیٹ گئی آج وہ اچھی طرح سکون سے سو کر شام میں بالکل فریش ہو کر اٹھنا چاہتی تھی۔

❖❖❖

شام میں سمیر اس کے لیے کارڈ اور کیک بھی لایا تھا۔ خلافِ توقع وہ صبح والے حلیے ہی میں تھی اور خاصی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

''ارے یہ کیا ......!تم تیار نہیں ہوئیں......؟'' سمیر اس کے لیے لایا کارڈ اور کیک اس کو دیتے ہوئے حیرت سے پوچھنے لگا۔

''ہاں بس جا رہی تھی۔'' اس نے سستی سے کہا۔

''کیوں..کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری......؟'' سمیر نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں...... وہ بس سو نہیں سکی ناں دوپہر میں اس لیے...'' اس نے مری مری آواز میں کہا۔

''کیوں...... گھنٹی بند نہیں کی تھی؟'' سمیر نے چونک کر پوچھا۔

''کی تھی لیکن وہ...... سب یہی کہہ رہے تھے کہ موبائل کی وجہ سے آرام سے لیٹ کر بات کر رہی ہوں......اب انہیں پی ٹی سی ایل پر فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں موبائل پر اتنی کالز آ رہی تھیں۔ میری ساری دوستوں کی، آپ کی بہنوں، بھائیوں کی، میرے بھائی بہنوں کی، سب کے فون دوپہر میں آئے کسی نے باہر والے نمبر پر کال کی جب میں نے فون نہیں اٹھایا تو موبائل پر کال کی۔ پوری دوپہر میں، میں نے بارہ، تیرہ کالز اٹینڈ کی ہیں، سب مجھے وش کر رہے تھے۔ ان سے پوری دوپہر باتیں کر کر کے میرے تو سر میں درد ہوگیا، اب شدید تھکن ہو رہی ہے۔'' اس نے اپنی دکھ بھری داستان سناتے ہوئے سمیر کو دیکھا تو وہ بڑی مشکل سے ہنسی روک رہا تھا۔ ندا کو اپنی طرف دیکھتا پا کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بس خوش ہوگئیں اپنا موبائل کا شوق پورا کر کے......؟''

''سمیر......!'' وہ شرمندگی سے اسی قدر کہہ سکی تو بے اختیار سمیر نے اس کو اپنے ساتھ لگایا اور شرارت سے بولا۔

''اینی وے، ہیپی برتھ ڈے ڈارلنگ......!'' تو وہ بھی مسکرا دی۔



نصیباں کھول دے میرا

میمونہ خورشید

مسز سراج فون پر بڑے ہی تند و تیز لہجے میں بات کر رہی تھیں آواز اتنی اونچی تھی کہ گھر کے ملازمین اپنی اپنی جگہ پر کام کرتے ہوئے بہ آسانی سن سکتے تھے۔ بانو کی نگاہ تو کام سے زیادہ میڈم پر تھی...... وہ میڈم کے لباس اور انداز سے ہمیشہ ہی متاثر رہتی تھی......اور کیوں نہ رہے آخر میڈم کے پاس سبھی کچھ تو تھا...... دولت، عزت، شہرت، اولاد، چاہنے والا شوہر، اسٹیٹس......اور اب تو وہ حج پر بھی

جارہی تھیں۔

''واہ میرے مولا واہ......'' بانو...... گاہے گاہے برتن صاف کرنے لگتی اور دل ہی دل میں سوچتی جاتی۔ ''کہیں، کہیں تو واقعی اللہ چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔''

''مسز افتخار آپ میرے گھر آکر تو دیکھیں پورا گھر دلہن کی طرح سجوایا ہے سراج نے...... اتنی بڑی تقریب رکھی ہے، ہم لوگوں نے گھر پر کہ آپ آکر دیکھیں گی تو واقعی دنگ رہ جائیں گی...... ارے بس رہنے دیں...... وہ بھی کوئی تقریب تھی...... یہ کیا ٹینٹ، قناتیں گلی میں لگا کر عزیز و اقارب کو زردہ، پلاؤ پر ٹرخادو۔ بھئی سراج نے تو پوری چھ ڈشز کا اہتمام کروایا ہے...... ہاں، ہاں اپنے گھر کے لان میں ہی انتظام کیا ہے...... ارے وہ تو میں بتانا ہی بھول گئی مسز افتخار...... محفلِ نعت کا بھی انعقاد رکھا ہے ہم لوگوں نے، ملک کے مایہ ناز نعت خواں آرہے ہیں...... لاکھوں روپوں کا تو ان لوگوں کے آنے جانے کا خرچ ہے۔ ہاں، ہاں...... جہاز سے ہی تو آئیں گے وہ لوگ...... اب آپ کو تو معلوم ہی ہے آج کل کرائے کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ایک ساتھ پانچ چھ لوگوں کے...... پھر ان لوگوں کا معاوضہ علیحدہ...... لگ بھگ پانچ لاکھ تو اسی پر خرچ ہوجائیں گے۔''

بانو رشک سے میڈم کو دیکھنے لگی۔

''اماں پوچھ رہی تھیں مجھ سے حج پر جارہی ہو۔ کیا تحفہ لوگی...... میں نے تو کہہ دیا صاف اماں سے خدا کے واسطے ہزار پانچ سو کے ہار تو مت لائیے گا میرے لیے...... تو اماں ہنس کر بولیں۔ ''بے فکر رہو، وائٹ گولڈ کا نیکلس بنوایا ہے تمہارے لیے وہ لے کر آؤں گی......'' اچھا ہے ناں...... سراج کے بہن بھائیوں کو بھی معلوم پڑے کہ آخر میں کوئی چھوٹے خاندان کی نہیں ہوں...... پیچھے سے ہی رئیس زادی ہوں۔'' مسز سراج قہقہہ لگاتے ہوئے بولیں۔ ''اب کیا ساری باتیں فون پر ہی پوچھیں گی...... ہاں، ہاں سوٹ سب سے مہنگے ڈیزائنر سے بنوایا ہے میں نے۔'' انہوں نے مزید تفصیلات بتائیں۔

جنت بی بی کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی مگر کان اس کے اپنی میڈم کی باتوں پر ہی لگے رہے وہ دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی اور اپنی دُھن میں پڑھے جارہی تھی۔

''نصیباں کھول دے میرا...... میں دیکھاں روضہ تیرا''

مسز سراج نے تقریباً آدھے، پون گھنٹے کی گفتگو کے بعد ایک گہری سانس لے کر فون بند کیا اور اپنا سر پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگیں۔

''نہ جانے لوگوں کے پاس کتنا فالتو وقت ہوتا ہے، معلوم بھی ہے آج میرے گھر پر تقریب ہے پھر بھی پورا گھنٹا ضائع کرادیا۔''

ملازم قاسم جو انرجی سیور لگا رہا تھا۔ میڈم کے جملوں پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا کیونکہ ہونٹوں کو جنبش دینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

''میرے لیے ایک گلاس پانی لے کر آؤ...... توبہ حلق تو خشک ہوگیا۔'' مسز سراج بانو کو دیکھ کر فوراً بولیں۔ بانو دوڑ کر کچن میں رکھے ڈسپنسر میں سے پانی نکالنے لگی تھی، کچن میں جنت بی بی اپنی دُھن میں نعت پڑھے جارہی تھی۔

''نصیباں کھول دے میرا...... میں دیکھاں روضہ تیرا
بلالے مینوں وی در تے...... بلالے مینوں وی در تے
میں دیکھاں روضہ تیرا...... چومیاں روضے دی جالی
جالی کرماں والی......''

بانو سر جھٹکتے ہوئے باہر آئی اور میڈم کو پانی کا گلاس بڑی تیزی سے پکڑایا۔

مسز سراج وہیں کھڑے کھڑے پانی پینے لگیں۔ بانو کو دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا...... وہ میڈم کو

ٹوکنا چاہتی تھی، چند لمحوں کے بعد بولی۔

''میڈم! ایک بات کہوں آپ سے......؟''

قاسم جو سیڑھی پر چڑھا بلب لگا رہا تھا پلٹ کر بانو کو دیکھنے لگا...... میڈم ابھی بانو کی طرف متوجہ ہوئی تھیں کہ اتنے میں ڈرائیور ڈبوں کا ایک ڈھیر اٹھا کر لایا اور بولا۔

''میڈم...... یہ صاحب نے بھجوائے ہیں...... انہوں نے کہا ہے گن کر بتادیں...... پورے ہیں یا کچھ کم ہیں۔''

''ٹھیک ہے انہیں میرے کمرے میں رکھ دو۔ یہاں تو ابھی صفائیاں ہورہی ہیں۔ میں آکر وہیں دیکھ لیتی ہوں۔'' مسز سراج جلد بازی سے بولیں اور ڈرائیور کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں چل دیں۔

''کیا بات کہنا تھی تمہیں میڈم سے؟'' قاسم سیڑھی سے اتر کر بانو کے نزدیک آیا اور پوچھنے لگا۔

''میں...... وہ میڈم سے کہنا چاہتی تھی...... میڈم چار دن کے بعد آپ حج پر جارہی ہیں۔ کم سے کم دوپٹا تو لے لیا کریں...... اور پھر دیکھا تو نے قاسم...... میڈم کھڑے کھڑے ہی پانی پی رہی تھیں۔ کیا اللہ ایسے لوگوں کو بلاتا ہے جن کے نفس کی تربیت بھی نہیں ہے۔'' بانو بڑی معصومیت سے بولی۔

''دماغ ٹھیک ہے تیرا...... پاگل ہوگئی ہے، یہ باتیں تو میڈم کو بتائے گی...... میڈم تیری چھٹی کردیں گی۔ اپنی تربیت اپنے پاس رکھ۔ جب وہاں سے آئیں گی ناں میڈم تو دیکھنا...... بالکل بدل کر آئیں گی۔ وہ جگہ ہی ایسی ہے۔'' قاسم اس کی بات سن کر بولا۔

''اللہ نے کتنا کچھ دیا ہے میڈم کو صاحب کو...... کیا سب لوگ جب حج پر جاتے ہیں تو اتنی ہی بڑی دعوت اور اتنی ہی سجاوٹ کا اہتمام کرتے ہیں؟'' بانو حیرت سے قاسم کو دیکھنے لگی۔

''کیا تو میڈم سے جل رہی ہے......؟'' قاسم اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''توبہ توبہ...... میں کیوں جلنے لگی۔'' بانو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

مسز سراج اپنے کمرے میں رکھے سارے ڈبے کھول کر دیکھ رہی تھیں جن میں شیفون کے کامدار سوٹ تھے۔ جب سب ڈبے کھول کر دیکھ لیے تو جھٹ سراج صاحب کو فون کیا۔

''سراج یہ آپ نے تیرہ سوٹ بھجوائے ہیں۔ پانچ آپ کی بہنوں کے چھ میری بہنوں کے۔ باقی دو سوٹ کس کے لیے ہیں؟'' جنت بی بی میڈم کے کاندھے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی مگر ہونٹوں پر ہلکی ہلکی جنبش سے جیسے دل ہی دل میں نعت پڑھ رہی ہو۔

''اوہ...... اچھا، اچھا...... میں بھول گئی تھی...... ٹھیک ہے۔ عاصمہ کا اور اس کی ساس کا بھی سوٹ ہے اس میں...... ہاں، ہاں...... عاصمہ ضرور یہ سوٹ پسند کرے گی۔ آخر آپ کی بیٹی ہے۔ سونخرے ہیں اس کے بھی۔ جانتی ہوں، سارے ہی سوٹ کم سے کم پانچ پانچ ہزار کے تو ہوں گے پھر بھی...... عاصمہ جو پسند کرے گی میں اسے وہی دوں گی آخر میری اکلوتی بیٹی ہے وہ......''

میڈم سراج نے ہنستے ہوئے فون بند کیا اور جنت بی بی سے کہنے لگیں۔

''بہت تھک گئی ہوں جنت بی بی...... ذرا اچھی طرح سے دباؤ اور ذرا بانو کو بلا کر کہو کہ یہ سب سمیٹ لے، میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ شام پانچ بجے مجھے پارلر بھی جانا ہے۔ آخر تقریب کے لیے تیار ہونا ہے۔ ارے ہاں، قاسم...... قاسم اِدھر آؤ'' وہ جلدی سے ان کے کمرے میں آیا تو وہ بولیں۔

''میں تو مووی میکر کو کہنا ہی بھول گئی تم نے کہا تھا کہ نہیں؟''

"جی میڈم آپ بالکل فکر نہیں کریں۔ میں نے مووی میکر سے بھی کہہ دیا تھا اور ساؤنڈ کی سیٹنگ کے لیے بھی ابھی آدمی آرہے ہیں وہ اسپیکرز وغیرہ فٹ کردیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" قاسم یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا اور مسز سراج بیڈ پر لیٹ گئیں۔ جنت بی بی آہستہ آہستہ بازو دبا رہی تھی۔ اچانک انہیں کیا سوجھی مسز سراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"حمیرا باجی...... آپ نے نماز نہیں پڑھی؟"

"ارے یاد ہی نہیں رہا۔ کام ہی اتنے ہیں جنت بی بی دیکھ تو رہی ہو تم......؟" وہ خفیف سی ہو کر کہنے لگیں۔

"کام تو زندگی بھر چلتے رہیں گے...... کاموں کا کیا ہے۔ نماز نہیں چھوڑتے باجی۔" جنت بی بی ان کی کافی اچھی اور پرانی ملازمہ تھی۔ سو اس کا ٹوکنا مسز سراج کو زیادہ برا نہ لگتا۔

"جب حج کرنے جاؤں گی تو خود بخود نمازوں کی عادت پڑ جائے گی پھر دیکھیے گا آپ...... پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گی میں۔" وہ تھوڑا سا اکتا کر بولیں۔

"انشاء اللہ، انشاء اللہ کیوں نہیں، کیوں نہیں مگر اب بھی کوشش کریں، کوئی نماز قضا نہ ہو۔ اللہ نے آپ کو اتنی بڑی جگہ پر بلایا ہے، لوگ حسرت لیے بیٹھے رہتے ہیں مگر ان کا بلاوا ہی نہیں آتا۔ خوش نصیب ہیں آپ کہ آپ کا بلاوا آگیا۔" جنت بی بی مسکرا کر بولی۔ میڈم سراج کے چہرے پر ایک فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی...... بلکہ اس میں تکبر کا عنصر شامل تھا۔

"پیسہ جو ہوتا ہے ناں جنت بی بی...... دنیا میں جنت ہے، انسان چاہے تو اس سے ہر خواہش ہر خوشی خرید سکتا ہے۔"

"نہیں حمیرا باجی...... ایسا نہیں کہتے...... اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں حج، عمرے پر جانا آسان ہے؟ جاتا وہی ہے، جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے۔"

"یہ تو وسیلہ ہے باجی وسیلہ...... اور وسیلہ اللہ ہی بناتا ہے۔ بہت لوگ ہیں ایسے جن کے پاس پیسوں کا ڈھیر ہے لیکن ان کا بلاوا نہیں آتا...... اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہی وہاں بلاتا ہے۔" وہ جنت بی بی کی باتوں پر اکتا سی گئیں۔

"جانے کیسی باتیں کرتی ہو تم...... بالکل درویشوں والی...... ارے آج کل کے زمانے میں درویش ہوتے کہاں ہیں۔ سب ڈھونگی ہوتے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولیں۔

"حمیرا باجی ایک بات کہوں آپ سے؟" جنت کی آنکھوں میں حسرت اور پیاس سی چمکنے لگی۔ وہ بڑے جذب اور عقیدت سے کہہ رہی تھی۔ "مجھے بھی بڑی خواہش ہے روضۂ رسول ﷺ کو چومنے کی خانۂ کعبہ کی زیارت و طواف کرنے کی برسوں سے اس خواہش کو دل میں دبائے پھر رہی ہوں...... آپ وہاں جائیں تو میرے لیے بھی ضرور دعا کیجیے گا...... اللہ پاک مجھے بھی بلالے صرف ایک بار...... ایک بار...... مجھے خاکِ مدینہ چومنے کی جسارت دے دے۔ وہ رب سوہنا بہت بڑا ہے حمیرا باجی......" یہ کہتے ہوئے جنت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ جنت کو حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

"اتنے پیسے ہیں تمہارے پاس کہ تم حج پر جاسکو؟"

"ہاں حمیرا باجی...... میں نے تیس ہزار روپے جمع کیے ہوئے ہیں۔ میرا ہے ہی کون...... اللہ کے سوا۔ جو کچھ کماتی ہوں، اسے اکٹھا کرتی ہوں۔ آج تیس ہیں کل اور زیادہ ہوں گے پرسوں اور زیادہ اور آخر کار میں اس مقدس سر زمین پر چلی جاؤں

گی۔" جنت اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"تمہاری عمر کتنی ہے جنت بی بی؟" اس کی بات سن کر حمیرا ناگواری سے بولیں۔

"یہی کوئی ساٹھ ستر سال......" وہ فوراً بولی۔

"ارے قبر میں پاؤں لٹکے ہوئے ہیں تمہارے، تمہیں تو وہاں جانے کی تیاری کرنی چاہیے۔ جب تک تمہارے پیسے اکٹھا ہوں گے تب تک تمہارا وقت ختم ہو جائے گا۔" مسز سراج نے بڑے عجیب انداز میں کہا۔ جنت بی بی حسرت اور مایوسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"نہیں باجی، ایسے نہیں کہتے۔ اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ پیسوں سے نہیں نیتوں سے بلاتا ہے، انسان کو عمر سے نہیں...... حیلوں سے، وسیلوں سے بلاتا ہے اور میری لگن وہاں جانے کی سچی ہے اور مجھے پکا یقین ہے وہ مجھے ضرور بلائے گا۔" جنت کچھ دیر بعد بولی۔

"انسان کو خواہش اپنی اوقات کے مطابق کرنی چاہیے۔ تیس ہزار میں تم حج تو کیا...... عمرہ بھی نہیں کرسکتیں۔ اب جاؤ جا کر بانو کو بھیجو...... یہ تحفے پیک کروانے ہیں، جانے سے پہلے سراج اور میں سب کو یہ سوٹ دے کر جائیں گے۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہنے لگیں۔ جنت ایک آہِ سرد بھرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ مسز سراج کے چہرے پر ناگواری اور ہلکا ہلکا غصہ نمایاں تھا۔ دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔ ذرا دیکھو تو مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے اوقات ہے نہیں، حج پر جائے گی اور لگی میری برابری کرنے...... اسے کیا پتا آج پیسہ ہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔"

☆☆☆

محفلِ نعت سجی ہوئی تھی، ایک طرف پُرتکلف طعام کا اہتمام تھا۔ سب خواتین میں مسز سراج سفید دیدہ زیب ساڑی میں ملبوس سب سے نمایاں اور پُرکشش لگ رہی تھیں۔ وہ ظاہری طور پر ہر لحاظ سے ایک خوب صورت اور اسمارٹ خاتون تھیں۔ ان کی اپنی شادی بھی جلدی ہوگئی تھی اور اب اپنی بیٹی کی شادی بھی کم سنی میں کردی تھی۔ عاصمہ اپنی ماں کی خوب تصویریں بنا رہی تھی پھر ماں کو پیار کرتے ہوئے انہیں سراہنے لگی۔

"ممی آج آپ سب سے منفرد، سب سے پیاری لگ رہی ہیں۔ اپنی نظر ضرور اتروا لیجیے گا۔" بیٹی سے تعریف سن کر ان کی گردن غرور سے تن گئی۔ ویسے بھی آج سبھی ان کی تعریف کر رہے تھے اور ان کی قسمت پر رشک و حسد کے ملے جلے جذبات لیے ہوئے تھے۔

"مسز سراج یہ تو بتائیں۔ آپ لوگوں کی فلائٹ کب کی ہے؟" مسز افتخار نزدیک آکر پوچھنے لگیں۔

"بس کل صبح یہاں سے کراچی روانہ ہوں گے پھر اگلے دن کراچی سے جدہ۔" انہوں نے رعونت بھرے لہجے میں بتایا۔

"بہت بہت مبارک ہو آپ کو، اللہ پاک آپ کا جانا و عبادت کرنا قبول فرمائے۔"

"اللہ قبول کرتا ہے تو بلاتا ہے ورنہ وہ ایسے ہی تو نہیں بلاتا۔" مسز سراج بھویں چڑھا کر بولیں۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے اچھا یہ بتائیے بیٹے کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھی آپ نے۔" مسز افتخار نے کھلی ہنسی ہنس کر پوچھا۔

"ارے ابھی کہاں...... اور ابھی تو ویسے بھی میرا نومی...... پڑھ رہا ہے۔ اتنی جلدی نہیں ہے مجھے بہو لانے کی البتہ بیٹی بیاہنے کی جلدی ضرور تھی مجھے...... سیانے کہتے ہیں بیٹیوں کے فرض سے جلدی سبکدوش ہونا چاہیے ویسے بیٹے کو تو ہم حج پر لے کر جا رہے ہیں اپنے ساتھ۔"

"ارے واہ...... ماشاء اللہ...... یہ تو بہت ہی

اچھی بات ہے اور آپ نے بہت اعلیٰ تقریب منعقد کی ہے۔ ایک سماں سا بندھ گیا تھا۔'' مسز افتخار نے دل کھول کر ان کی اور ان کی تقریب کی تعریف کی بلکہ تقریباً تمام مہمان خواتین ہی انہیں سراہ رہی تھیں اور ان کا سر فخر سے تنا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''اتنا کھانا ضائع ہوگا جنت بی بی آپ پوچھ کر بتائیں ناں میڈم سے کیا کرنا ہے اس بچے ہوئے کھانے کا؟'' ملازم پوچھنے لگے۔

''میڈم سو رہی ہیں، تم لوگ ایسا کرو اس کھانے کو دارالامان میں یا کسی دربار پر تقسیم کرآؤ۔''

''رات گئے ہم کہاں لیے پھریں گے اس کھانے کو۔'' وہ بیزاری سے بولے۔

''جو بھوکا ہوگا وہ تمہیں مل ہی جائے گا اور وہ آدھی رات کو بھی کھالے گا ضرور اس رزق میں کسی نہ کسی کا تو حصہ ہے۔ ورنہ یہ بچتا ہی کیوں۔'' جنت بی بی نرمی سے مسکرا کر بولی۔

''رہنے دیں جنت بی بی...... اضافی کھانے بنوائیں گے تو بچے گا ہی...... اس میں حصے داروں کی کیا بات ہے اور ویسے بھی یہ امیر لوگ کھاتے کم اور بچاتے زیادہ ہیں۔ شاید یہ بھی ان کے اسٹیٹس کی شان ہے۔'' بانو نے کلس کر اس کی بات کاٹی۔

''تم کیوں جل کلس رہی ہو، یہ کھانا بندھواؤ اور میرے ساتھ چلو...... ورنہ سارا سڑ جائے گا۔'' قاسم کے کہنے پر بانو چڑ گئی۔

''میں نہیں جا رہی تمہارے ساتھ...... اکیلے ہی جاؤ، مجھے تو میڈم پر بہت غصہ آرہا ہے۔ اپنوں اپنوں کو کتنے اچھے اچھے سوٹ گفٹ کیے اور وہ بھی کون جن کے پاس پہلے ہی بہت کچھ ہے اور ہمیں ایک دوپٹا بھی نہیں دیا، کیا ہمارا حق نہیں تھا؟'' جنت مسکراتی رہی۔

''چلتی ہے میرے ساتھ یا دوں ایک ہاتھ کا۔'' قاسم جو بانو کا شوہر بھی تھا جھڑک کر بولا۔ بانو پاؤں پٹخ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

''جو انسان کے نصیب کا ہوتا ہے اسے ضرور ملتا ہے۔ دوسروں کو دیکھ کر جلنا کڑھنا نہیں چاہیے۔'' جنت نے نرمی سے دونوں کو سمجھایا۔

''ایک تو جنت بی بی بھی ناں...... نہ جانے نصیب پر اتنا بھروسا کیوں کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک نصیب ہی سب کچھ ہے۔'' وہ قاسم کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کم عقل جاہل عورت، نصیب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جنت بی بی ٹھیک کہتی ہے اور سن وہ یہ بھی کہتی ہے کہ نصیب سدا ایک جیسا نہیں رہتا، بدل بھی جاتا ہے۔''

پتا نہیں۔ ہمارا تو نصیب ہمیشہ سے ایک جیسا ہے۔ پہلے اماں ابا نوکر تھے پھر ہم نوکر بن گئے اور اب آئندہ ہماری اولادیں بھی امیروں کے جھوٹے برتن دھو کر ہی گزر بسر کریں گی۔'' بانو چڑ کر بولی۔

''شکر ادا کرو رزقِ حلال تو ہے ناں...... حرام تو نہیں کھاتے۔'' قاسم اسے سمجھانے لگا۔

''تجھے بھی ناں...... جنت بی بی کا اثر پڑ گیا ہے۔ میری تو کمر ویسے ہی جواب دے رہی ہے پا سے لگا کر آئیں اس کھانے کو...... اگر نہ سڑنے والی چیز ہوتی تو پورا مہینہ آرام سے گزر جاتا ہمارا اس کھانے میں......'' دونوں باتوں کرتے ہوئے ڈرائیور کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

جناح انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ان تینوں کو ریسیو کرنے کے لیے ان کے بزنس مین دوست نے گاڑی ڈرائیور بھیج دیا تھا جو انہیں ائرپورٹ کے قریب ایک شاندار ہوٹل میں ڈراپ کر گیا۔ جہاں دو ڈیلکس روم میں ان کا قیام ہونا تھا۔ کمروں میں جاتے ہی وہ لوگ فریش ہوئے۔

''بشیر تو بہت کہہ رہا تھا ہوٹل کے بجائے ہم اس کے بنگلے پر رکیں لیکن سچ پوچھو نا حمیرا...... اکتا گیا تھا میں تو گیدرنگ سے...... اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے انکار کیا انہیں۔'' سراج صاحب بولے۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، حد ہوگئی تھی پورا فیصل آباد ائرپورٹ پر چھوڑنے چلا آیا تھا۔ رشتے دار، عزیز و اقارب، دوست احباب نہ جانے کتنے لوگ تھے۔ کسی کسی سے تو میں مل بھی نہیں پائی۔'' مسز سراج بہت آرام سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

''میں تو کہہ رہا تھا تم سے تقریب چھوٹی ہی رکھو۔ ورنہ یہ رشتے دار جان سے چمٹ جائیں گے۔ اب حج سے واپسی پر پورا جہاز بھر کر لانا ہوگا ان لوگوں کے لیے۔'' انہوں نے ناگواری سے کہا تو مسز سراج مسکرانے لگیں۔

''اچھا اب اتنے بیزار تو مت ہوں آپ...... ہم یہاں آرام کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہاں ذرا نعمان سے فون کر کے پوچھیں کیا کر رہا ہے وہ۔'' ابھی وہ کہہ ہی رہی تھیں کہ اتنے میں دروازہ کھول کر نعمان اندر داخل ہوا اور ماں کے قریب آیا۔

''ممی میں نے آپ کے ذمے ایک کام لگایا تھا معلوم کیا اس بارے میں آپ نے؟''

''ارے چندا میں تو بھول ہی گئی۔'' ان کے کہنے پہ سراج صاحب چونک کر دونوں کو دیکھنے لگے۔

''بھئی میں آپ دونوں کی وجہ سے حج پر جا رہا ہوں ورنہ میری عمر نہیں تھی کہ میں حج پر جاؤں اور حج کے ارکان میں سے اہم بات یہ ہے کہ مرد سر منڈوائیں اور میں...... اپنے قیمتی بال نہیں اتروا سکتا...... میں گنجا نہیں ہونا چاہتا۔'' اس کی بات سن کر دونوں ہنسنے لگے۔

''ارے بیٹا! یہ تو گھر کی کھیتی ہے۔ چند دن کے بعد پھر آجائیں گے۔'' سراج صاحب بولے۔

''آپ جس عمر میں ہیں ناں ڈیڈی ایسا کہہ سکتے ہیں...... سوچ سکتے ہیں، ذرا میری پوزیشن پر آکر دیکھیں تو آپ کو پتا چلے۔ کالج میں سب دوست میرا مذاق اڑائیں گے۔'' نعمان نے بیزاری سے کہا۔

''نعمان اب یہ تو کرنا پڑے گا۔''

''نو ڈیڈ...... نو...... میں ایسا بالکل نہیں کروں گا۔ مجھے آپ معلوم کر کے بتائیں کیا ایسا ممکن ہے کہ میں ایک لٹ کاٹ لوں اور میرا رکن ادا ہو جائے۔''

''یہ تو کسی عالم دین سے ہی پوچھنا پڑے گا۔ ویسے تم جنت بی بی سے بھی تو کچھ پوچھ رہے تھے۔ اس نے کیا کہا تھا اس بارے میں؟''

''اوہ ممی! جنت بی بی کو تو چھوڑ ہی دیں آپ...... وہ تو مجھے اس زمین کی مخلوق لگتی ہی نہیں وہ کہہ رہی تھی۔ تم اللہ کی راہ میں اپنے یہ حقیر سے بال نہیں دے سکتے تو اور کیا قربانی دو گے...... اور یہ عبادت تو قربانی مانگتی ہے...... اپنے پیسے کی قربانی...... اپنے پیاروں سے دوری کی قربانی...... اور اس معبود کے سامنے اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کی قربانی۔''

''جنت بی بی ہے تو جاہل لیکن باتیں کتنی گہری کرتی ہے۔'' سراج اس کی بات سے کافی متاثر ہو کر بولے۔

''ڈیڈی! یہ میرے سوال کا جواب نہیں...... یہ نصیحت ہے...... اور نصیحت مجھے بالکل پسند نہیں۔ آپ پلیز کسی عالم دین سے معلوم کریں۔''

''اگر انہوں نے کہہ دیا مکمل ٹنڈ ہونے پر ہی رکن ادا ہوگا تو کیا کرو گے تم؟'' حمیرا لاڈ سے بیٹے کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولیں۔

''میں حج پر ہی نہیں جاؤں گا...... ہاں!'' سراج اور حمیرا ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو تم، بھلا اس طرح بھی ہوتا ہے۔ ہاں تم یوں کر لینا کچھ دن کے لیے فیصل آباد نہ آنا...... لاہور چلے جانا وہیں رہ لینا......'' نعمان یہ سن کر چپ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ لوگ حج ٹرمینل کے باہر دیگر مسافروں کے ساتھ آبیٹھے تھے مگر یہ تینوں اپنے ہی طور پر کسی کے ساتھ جا رہے تھے جو پرائیوٹ طور پر لے جاتے ہیں اور وہ بندہ ابھی تک نہیں آیا تھا...... ان لوگوں کے ساتھ ایک فیملی اور بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ باری باری مسافر اندر جا رہے تھے مگر انہیں طارق کا انتظار تھا۔ سراج پریشان ہو کر فون کرنے لگے مسز سراج اور نعمان منتظر کھڑے تھے۔ فون پر بات کرتے ہوئے سراج کے چہرے پر پریشانی تھی۔ فون بند کر کے بولے۔

''ابھی ابھی میری طارق سے بات ہوئی ہے وہ کہہ رہا ہے۔ ہمارے پاسپورٹ ایک دن پہلے ایکسپائر ہو چکے ہیں۔ اس لیے ویزا و ٹکٹیں کنفرم نہیں ہو سکیں۔'' مسز سراج کو شاک لگا۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے اس نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا دو مہینے سے پاسپورٹ اس کے پاس ہیں۔ بلاوجہ ہی ہمیں کراچی آنا پڑا۔ یہ بات پہلے بھی تو بتائی جا سکتی تھی۔''

''ممی آپ لوگوں نے بغیر دیکھے ہی اسے پاسپورٹ پکڑا دیے، چھ مہینے کی validity تو ہونی ہی چاہیے تھی اور اس نے پیسے لے لیے اور کچھ نہ بتایا۔'' نعمان شدید غصے میں تھا۔

''یہ تو ان لوگوں کی غلطی ہوئی ہماری نہیں۔'' مسز سراج بولیں۔ سراج خود پریشانی اور خفت میں مبتلا تھے۔

''تم نے پاسپورٹ دیتے وقت کچھ نہیں دیکھا۔ میں تو ان دنوں کام سے اسلام آباد گیا ہوا تھا اور طارق نے بھی نہیں بتایا اسے تو شاید پیسے لینے کی

پڑی تھی جب پاسپورٹ ہی valid نہیں تھا تو ویزے کے لیے بھی نہیں جا سکا ہوگا۔ یہ تو اس پاگل آدمی نے ہمیں نہیں بتایا۔'' سراج صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ طارق صاحب کا کیا حشر کر دیں۔

''چلو اب یہاں بحث مت کرو اور ہوٹل چلو۔''

تینوں پیر پٹختے ہوئے واپس ہوٹل چلے آئے۔ طارق بھی اسی لیے غائب تھا دوسری فیملی بھی کھڑی انتظار کرتی رہی۔

☆☆☆

''میں بالکل فیصل آباد نہیں جاؤں گی۔ کس قدر جگ ہنسائی ہو گی میری...... سارے معاملات کس قدر باریک بینی سے ادا کیے ہم نے اور اپنے پاسپورٹ کی ڈیٹس سے ہی غافل رہے ہم لوگ۔'' حمیرا روتے ہوئے بولیں۔

''آپ سے زیادہ تو ممی، ڈیڈی مجھے لوگوں کو فیس کرنا ہوگا۔ سوچیں ہم کس منہ سے واپس گھر جائیں گے۔'' نعمان بولا۔

''سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہاری ہی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ کل تم ہی کہہ رہے تھے ناں...... میں بال نہیں منڈواؤں گا...... آ گیا نتیجہ سامنے۔'' مسز سراج اس کے اوپر غصہ اتار رہی تھیں۔

''ممی! صرف اگر میری نیت خراب تھی تو میرا ہی پاسپورٹ فیل ہوتا...... معاف کیجیے گا نیت آپ لوگوں کی بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ورنہ ہم میں سے کوئی تو جاتا۔'' نعمان غصے سے کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ حمیرا اور سراج سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

''اس طرح منہ چھپا کر یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ سنو ڈر کس بات کا ہے۔ اس سال نہیں تو اگلے سال ہم چلے جائیں گے حج پر...... اور ایسا تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا اور تم فکر مت کرو۔ جب تک پاسپورٹ بنیں گے عمرہ کھل جائے گا۔ میں تمہیں عمرے پر لے کر جاؤں گا۔ حوصلہ کرو......'' مسز سراج واپس نہ جانے کی رٹ لگائے ہوئی تھیں جب سراج صاحب انہیں سمجھاتے ہوئے بولے۔

''وہ پاسپورٹ واپس کرے گا تبھی تو اپلائی کریں گے۔'' حمیرا روہانسے انداز میں بولیں۔

''ہاں، تم فکر نہ کرو اسے میں دیکھ لوں گا، رقم بھی تو واپس لینی ہے اور ہم لوگوں کے لیے حج پر نہیں جا رہے تھے، ہم اپنے اللہ کے لیے حج پر جا رہے تھے۔ اس کی جانب سے بلاوا نہیں تھا، ہمیں صبر کر لینا چاہیے۔'' حمیرا اُن کی بات سن کر چپ سی ہو گئیں۔

☆☆☆

''دو دن سے میڈم اور صاحب کمرے میں ہی بند ہیں۔ باہر نہیں نکلے...... اور نعمان بابا تو وہیں سے گھومنے پھرنے سوات چلے گئے ہیں۔ فیصل آباد آئے ہی نہیں۔ ویسے کتنی شرمندگی کی بات ہے۔ اتنا کچھ کیا اتنا پیسہ پانی کی طرح بہایا اور سواد کچھ بھی نہ آیا۔ ہونہہ، اسے کہتے ہیں غریبوں کا دل دکھا کر امیر بھی خوشیاں نہیں پا سکتے۔'' قاسم اور بانو دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے جبھی جنت بی بی قریب سے گزری اور ان کی باتوں کو سننے لگی۔

''ایسا نہیں کہتے بیٹا! اللہ ناراض ہوتا ہے۔ یہ حسد اور جلن ہے، اللہ کو صبر اور شکر پسند ہے...... اللہ جس حال میں رکھے انسان کو خوش رہنا چاہیے۔''

''جنت بی بی! ہم اپنے حال پر بہت خوش ہیں اور بلکہ اب تو ہم امیروں کے حال پر خوشیاں منا رہے ہیں۔''

''بری بات ہے بانو...... یہ اللہ کا بلاوا ہے...... اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہی بلاتا ہے۔ جس کی روح لبیک پکارتی ہے وہی وہاں جاتا ہے۔''

''تو کیا میڈم اور صاحب کی روح نے لبیک نہیں کہا تھا؟'' قاسم حیرت سے پوچھنے لگا۔

''یہ سب اللہ جانتا ہے۔ ضرور اس میں بھی کوئی

نہ کوئی اس کی حکمت چھپی ہوگی۔" اچانک تینوں کی نگاہ میڈم پر گئی جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں وہ غم و غصے کی کیفیت میں کھڑی انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

"تو تم یہ جتانا چاہتی ہو کہ ہماری کوئی خواہش اور نیت نہیں تھی۔ ہم صرف دنیا دکھاوے کے لیے حج پر جارہے تھے۔" وہ شاید جنت سے مخاطب تھیں۔

"میں نے ایسا کب کہا حمیرا باجی؟"

"بکواس بند کرو اپنی اور چلی جاؤ یہاں سے آئندہ تمہاری شکل نہ دیکھوں میں...... نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔ کہاں کی پیر ملانی ہے جو ہر جگہ کھڑے ہوکر وعظ دینے لگتی ہے۔" وہ شدید غصے میں بولے جارہی تھیں۔ جنت بڑے دکھ سے حمیرا کو دیکھتی رہی اور وہاں سے چلی گئی۔

"اگر آئندہ میں نے تم لوگوں کے منہ سے اپنے متعلق کوئی ذکر سنا تو تمہیں بھی نکال کر باہر کھڑا کردوں گی...... تم لوگوں کو یہاں کام کرنا ہے تو زبان بند اور آنکھیں صرف اپنے کام کے لیے کھلی رکھو، سمجھے تم لوگ۔" اب وہ قاسم اور بانو سے مخاطب تھی جو معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

"کیا ہوگیا ہے حمیرا تمہیں...... تم کیوں ان لوگوں کی باتوں کو دل پر لے رہی ہو؟"

"سراج آپ سمجھ نہیں رہے یہ دو دو ٹکے کے لوگ مجھ پر باتیں بنا رہے ہیں۔ میں گھر سے باہر نہیں نکلی...... صرف انہی باتوں کی وجہ سے اور میرے گھر کے ملازم مجھ پر ہنس رہے ہیں۔" وہ شدید غصے میں تھیں۔

"اچھا اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ چلو شام کو کھانے کہیں باہر چلتے ہیں۔ ابھی تو میں فیکٹری جارہا ہوں۔ پلیز سارا دن موڈ ٹھیک رکھنا۔" ان سے کہہ کر سراج صاحب چلے گئے اور حمیرا واپس اپنے کمرے میں آکر بستر پر پڑ گئیں۔

☆☆☆

عاصمہ کی ساس حمیرا سے ملنے آئی بیٹھی تھیں۔ حمیرا کی ایسی کیفیت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ خفت سے برا حال تھا اور دل ہی دل میں وہ برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

"عاصمہ نے جب مجھے بتایا کہ آپ لوگوں کا جانا نہیں ہوسکا تو سچ میں مجھے تو بہت دکھ ہوا۔ یقین مانو حمیرا مجھے ایسی تکلیف محسوس ہوئی جیسے یہ سب میرے ساتھ ہوا ہو...... ویسے دل تو تمہارا بھی بہت دکھا ہوگا۔" عاصمہ کی ساس ان کے پاس بیٹھی ان کے حج پر نہ جانے کا افسوس کررہی تھیں اور حمیرا مارے خفت کے ہونٹ دانت سے کاٹتی رہیں...... بیٹی پر الگ غصہ تھا کہ ساری تفصیل اتنی جلدی بتانے کی کیا ضرورت تھی۔

"بس اللہ کی مرضی......" حمیرا اتنا کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

☆☆☆

اس دوران نئے پاسپورٹ بن گئے اور رقم بھی کچھ کٹ کٹا کر واپس ہوئی۔ حمیرا نے تین مہینے گھر میں ہی گزارے، کہیں آتی جاتیں تو سوالات کی بوچھاڑ ہوجاتی۔ لوگ ہمدردی کی آڑ میں کافی کچھ کہہ جاتے...... اس روز وہ کافی اداس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب سراج صاحب نے عمرے پر جانے کے لیے کہا۔

"بس تم جلدی جلدی تیاری کرو، میں سارے انتظامات کررہا ہوں۔"

"کیا عمرے پر جانے سے میری وہ خفت دور ہوجائے گی۔ جس کا مجھے گزشتہ دو تین مہینے سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔" وہ نروٹھے انداز میں بولیں۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا تم سے حمیرا، ہم اللہ کے لیے اس کے در پر جارہے ہیں۔ ہمیں لوگوں سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے اگر تم میں سچا جذبہ ہے تو تم خوش ہوجاؤ کہ تم اس کے در پر حاضری دینے کسی نہ کسی طرح

جا تو رہی ہو۔" سراج ذرا طنزیہ انداز میں بولے۔

"اس بار ممی پلیز کوئی کروفرمت کیجیے گا۔ خاموشی سے بیگ اٹھائیں اور نکل جائیں۔ جب واپسی ہو تب لوگوں کو بتا دیجیے گا۔" نعمان نے بھی ماں کو سمجھایا۔

"اچھا یہ بتائیں، صرف آپ اور ڈیڈی ہی جارہے ہیں ناں؟"

"ہاں میں اور تمہاری ممی ہی جارہے ہیں۔" بیٹے کی بات کا سراج صاحب نے جواب دیا۔

"شکر ہے مجھے ٹنڈ نہیں کرانا پڑے گی۔" نعمان خوش ہوکر بولا۔ اس کی بات سن کر دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"آپ دونوں میرا مذاق مت اڑائیں۔ آپ لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں مجھے اپنے بالوں سے کس قدر پیار ہے۔ میں ان کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ بقول میرے سارے فرینڈز کے لڑکیاں میرے ہیئر اسٹائل پر ہی تو مرتی ہیں۔ جب بال ہی نہیں ہوں گے تو کیا رہ جائے گا میری لائف میں۔" نعمان معصومیت سے بولا۔ حمیرا اور سراج ہنستے رہے پھر بیوی کے ریلیکس چہرے کو دیکھ کر سراج صاحب بیٹے سے بولے۔

"کچھ بھی ہے۔ تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں سے کم از کم تمہاری ماں کا موڈ تو اچھا ہوجاتا ہے۔" حمیرا شوہر کو دیکھ کر بڑی ادا سے مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

"آج کل عمرے پر جانا بھی لگتا ہے ایک فیشن ہی بن گیا ہے۔ جسے دیکھو عمرے پر جارہا ہے، میری ساس بھی عمرے پر جارہی ہیں ممی...... حالانکہ کئی بار جاچکی ہیں لیکن جب سے انہیں یہ پتا چلا ہے کہ آپ لوگ عمرے پر جارہے ہیں تو انہوں نے نوید کا پیچھا پکڑلیا۔ اب نوید کے ساتھ جارہی ہیں وہ......" حمیرا نخوت سے منہ بنانے لگیں۔

"بھئی ہمیں اس سے کیا...... لوگ ہر سال ہی جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ہمیں دیر سے خیال آیا اس عظیم عبادت کا۔" سراج صاحب ہنس کر بولے۔

"وہ بھی مجھے ہی آیا خیال، آپ کو تو بس فیکٹری کا ہی پتا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" ان کی بات سن کر حمیرا فوراً بولیں۔

"اچھا رات کافی ہوگئی ہے سوجاؤ، صبح کی فلائٹ ہے ہماری...... کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں تھکن ہوجائے اور تم بیمار پڑ جاؤ اور اب کی بار واقعی تمہاری وجہ سے جانا کینسل کرنا پڑے۔" سراج صاحب نے کہا۔

"اللہ نہ کرے...... منہ سے اچھی بات نکالیں۔" حمیرا بولیں تو سراج بیوی کو غور سے دیکھنے لگے۔

☆☆☆

رات کے تین بجے کا وقت ہوگا جب سراج صاحب کا سیل فون بجا، وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ فون کی ہی مسلسل گھنٹی پر دونوں ہڑبڑا کر اٹھے..... حمیرا سمجھیں کہ الارم بجا ہے مگر گھنٹی کی آواز سراج کے فون سے آرہی تھی۔ سراج نے جلدی سے فون اٹھایا دوسری طرف سے ان کی فیکٹری کے گارڈ کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سر فیکٹری کے نزدیک بارود کا ٹرک پھٹا ہے۔ ہماری عمارت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ ڈیوٹی دینے والے بھی زخمی ہیں اور سامنے والے پھاٹک پر ہمارے دو گارڈ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے ہیں۔ میں تھوڑے فاصلے پر تھا آپ...... آپ ٹی وی کھولیں، نیوز چینل دیکھیں۔ بہت تباہی مچی ہوئی ہے۔ آپ جلدی سے آئیں۔" یہ سب کہتے ہوئے وہ بری طرح رو رہا تھا۔

پہلے سراج صاحب کو کچھ سمجھ نہیں آیا پھر انہوں نے جیسے تیسے ٹی وی آن کیا وہاں فیکٹری میں آگ لگی دکھا رہے تھے۔ نیوز کاسٹر تفصیلات بتا رہی تھی اور سراج غم واندوہ کی کیفیت میں مبتلا اپنا ہاتھ سینے پر

رکھے صوفے پر گر گئے۔

سراج اپنی آنکھوں سے عمارت کو جلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ حمیرا ابھی بدحواسی سے اپنی بربادی کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ یکدم سراج صاحب نے بڑے کرب کے عالم میں حمیرا کو بہ مشکل آواز دی اور صوفے سے زمین پر آرہے۔ حمیرا جو پہلے ہی صدمے کی کیفیت میں تھیں، شوہر کو گرتا دیکھ کر مزید حواس باختہ ہوگئیں۔

”سراج! سراج کیا ہوا آپ کو... نعمان، نعمان ......قاسم ارے کوئی تو آؤ۔“ حمیرا پاگلوں کی طرح چلاتی رہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ شدید ہارٹ اٹیک کی صورت میں سراج صاحب کی روح عالم بالا کو پرواز کرگئی تھی۔ حمیرا ننگے پاؤں کمرے سے باہر نکلیں۔ نعمان نے فوری ایمبولینس منگوائی، فیملی ڈاکٹر بھی فوراً آگیا مگر سراج صاحب تو جا چکے تھے۔ حمیرا دو دن سکتے کی کیفیت میں رہیں۔ سراج کے سوئم کے بعد اب لوگ حمیرا سے مل کر واپس جارہے تھے۔ رفتہ رفتہ تعزیت کرنے والوں سے گھر خالی ہوگیا۔ آناً فاناً کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ حمیرا صدمے کی حالت میں بت بنی بیٹھی تھیں۔ بچوں پر دُوہرا غم پڑا تھا۔ باپ چلا گیا تھا اور ماں بھی حواسوں میں نہ تھی۔ کاروبار کا صدمہ الگ تھا۔ حمیرا کے قریبی رشتے دار بھی چلے گئے تھے، بہن، بھائی ان کا کوئی تھا نہیں بس یہی ملازمین تھے جوان کو دلاسہ اور تسلی دینے کی کوشش کرتے مگر وہ تو مکمل سکتے کی کیفیت میں تھیں۔ الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے، سو جس طرح بہت سے حادثات کے بعد چینلز اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے نئے سے نئے اقدام کررہے ہیں وہیں متاثرہ افراد کے انٹرویوز لینے بھی ہر چینل کا نمائندہ جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ گھر والوں سے بات کی جاسکے اور ان کی کسمپرسی کو نشر کیا جاسکے قطع نظر اس سے کہ اس کے اثرات کیا ہورہے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ایک چینل کی ایک نیوز رپورٹر اس جان لیوا واقعے کی رپورٹ لائیو پیش کررہی تھی۔

”تو ناظرین ہم سیٹھ سراج کے گھر میں موجود ہیں جو اس فیکٹری کے مالک تھے جو شرپسندوں کے شر کا نشانہ بنی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عالیشان عمارت لاکھوں کروڑوں کی مشینیں کچرے کا ڈھیر بن گئیں اور خود سیٹھ صاحب اس بھاری نقصان کا صدمہ سہہ نہیں پائے اور ہارٹ اٹیک کی وجہ سے اس دنیا سے چل بسے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو بچے چھوڑے ہیں۔ آئیں ان سے ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہے، اس جان لیوا سانحے کے بعد...... اور وہ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں حکومت کو اور اس واقعے کا کس کو ذمے دار سمجھتے ہیں۔“ رپورٹر نے مائیک نعمان کے سامنے کیا، نعمان اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

”میرے ڈیڈی اور ممی کی اگلی صبح کی فلائٹ تھی۔ وہ لوگ عمرے پر جارہے تھے کہ رات کو یہ سانحہ ہوگیا اور کچھ بھی باقی نہ بچا۔“ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بلکنے لگا۔

”تو ناظرین آپ نے سنا بیگم سراج اور سراج صاحب کی ساری تیاریاں مکمل تھیں وہ لوگ عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہونے والے تھے لیکن نصیب کی سیاہی کہیے یا بدقسمتی کا کھیل ......موقع ہی نہ مل سکا...... اور سب کچھ تہس نہس ہوگیا۔ اُدھر بیگم سراج صدمے سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہیں۔ ناظرین عمرے پر تو شاید وہ زندگی میں کئی بار اپنے بیٹے کے ہمراہ چلی جائیں گی لیکن ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہ سعادت حاصل کرے۔ جس سے بیگم سراج زندگی بھر کے لیے محروم ہوگئی ہیں۔ ہم ان کے لیے دعا کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔ شبانہ مراد ستارہ نیوز فیصل آباد......“

اچانک حمیرا کے بے جان سے وجود میں کپکپاہٹ شروع ہوئی اور آنکھوں سے بھل بھل

آنسو بہنے لگے اور وہ زور زور سے چلّانے لگیں۔

”نکالو اسے......کون ہے یہ...... یہ سب دنیا کو بتارہی ہے، لوگوں کو ہماری کہانی سنارہی ہے۔ یہ سب کو بتادے گی ہم لوگ پھر اس سعادت سے محروم ہوگئے، سراج ...... یہ سب کو بتادے گی ایک بار پھر ہماری حاضری قبول نہیں ہوئی۔ ہمارا بُلاوا نہیں آیا...... نہیں ......نہیں مجھے کہیں چھپالو...... چھپالو...... مجھے۔“ حمیرا ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں اور بے دم ہوکر نعمان کے سنبھالتے سنبھالتے بھی فرش پر گر گئیں۔

☆☆☆

عدت کی جان لیوا مدت گزارنے کے ساتھ ہی حمیرا پر زندگی کی تلخ حقیقتیں آشکار ہونے لگیں۔ پہلی حقیقت تو یہ سراج نے بینک سے لون لے رکھا تھا۔ اور وہ بھی بنگلا بینک میں گروی رکھ کر۔ بینک نے حمیرا کی عدت کی مدت کا ہی انتظار کیا اور اس کے بعد نوٹس بھیجنا شروع کردیے۔ فیکٹری انشورڈ نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے حمیرا اور نعمان کو بنگلا بیچنا پڑا اور بینک کی ادائیگی کے بعد ایک گمنام علاقے میں کرایے کے ایک چھوٹے سے مکان میں دونوں ماں، بیٹا رہائش پذیر ہوگئے۔ نعمان نے اپنی مہنگی ایجوکیشن چھوڑ دی اور ایک میڈیکل اسٹور پر ملازمت کرنے لگا۔ گھر کا قیمتی سامان بھی اونے پونے بیچنا پڑا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ حمیرا کو جنت بی بی کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھی۔ ”پیسے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ دنیا میں سب سے بے وفا چیز زندگی اور دولت ہی ہے اور انہی دونوں چیزوں سے انسان سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں جانے کب دھوکا دے جائیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔“ جنت بی بی کتنی تلخ مگر سچی باتیں کرتی تھی۔ یہ حمیرا کو تب پتا چلا جب وہ آسمان سے زمین پر آگئیں۔ زمین پر چلنے میں بھی حمیرا اور ان کے بیٹے نعمان کو لگ بھگ تین چار سال لگے۔ نعمان نے اپنی ساری ایکٹی وٹیز چھوڑ دی تھیں۔ یا تو کام پر ہوتا...... یا پھر گھر میں پڑا رہتا۔ نعمان دوستوں میں



سب بدل جائے گا

مجھ کو معلوم ہے اب زندگی بدل جائے گی......
میرا بچپن! میری سکھیاں! میری گڑیاں!
سب کہیں گم ہوجائیں گی......
بابل کا آنگن اب چھُوٹ جائے گا
ماں کا ہر آنسو! دعا میں بدل جائے گا
بھائی چھُپ کر روتے ہیں کہ ستائیں گے کسے؟
میں تو آنسو بھی چھپاتی ہوں کہ بھید کھُل جائے گا
اِک نیا دیس بسانا ہے مجھے اب......
جس میں ہر انداز، ہر روپ بدل جائے گا......
دل میں اپنا غم چھپائے!
آہوں! سسکیوں کو دبائے......
پیا ملن کی آس لگائے......
میرا شہزادہ مجھے لے جائے گا

شاعرہ: فائزہ شہزاد

انتخاب: ڈاکٹر سعدیہ شہزاد، حیات آباد پشاور

بھی نہیں آتا جاتا تھا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نعمان باپ کے غم اور مفلسی سے نڈھال تھا...... بلکہ اس کے سر کے بال آہستہ آہستہ نامعلوم اسباب کی بنا پر جھڑنا شروع ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نعمان کے سارے سر پر گنج ہوگیا۔ گنج اتنا پھیلا کہ بال صرف کنپٹیوں پر مجھو دیکھنے لائق اور گدّی پر رہ گئے جن کی وجہ سے وہ عجیب سا لگتا۔ ایک روز اس نے وہ جھالر بھی صاف کرادی۔

نعمان نے ہر ممکن کوشش کرلی تھی کہ تیزی سے گرتے بالوں کا کچھ علاج ہوسکے .... مگر کچھ نہ

ہوسکا۔ گنج نے نعمان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا تھا۔ شاید وہ باپ کی موت اور فیکٹری کے حادثے کے بعد اپنی تعلیم کے بل بوتے پر سنبھل جاتا...... لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ گھر کا ہی ہو کر رہ گیا بس پیٹ بھرنے کی خاطر ملازمت تو بہر حال کرنا تھی۔ حمیرا ہر وقت بیٹے کو سمجھاتیں۔ ان سب ناکامیوں اور پریشانیوں سے یہ ہوا کہ وہ اُس ذات کے نزدیک ہوگئیں جس سے وہ ہمیشہ غافل رہیں۔ اب وہ نہ صرف پانچوں وقت کی باقاعدگی سے نماز پڑھتیں بلکہ تہجد اور اشراق کی بھی پابند ہوگئیں لیکن حمیرا کے دل کو پھر بھی ایک پل سکون و قرار نہیں آتا تھا۔ انہوں نے ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ کھو دیا تھا۔ شوہر، مال، اسباب، بیٹے کا کیریئر، اسٹیٹس، اب انہیں صرف سکون کی تلاش تھی۔

''ہر چیز اللہ کی امانت ہے۔ ہماری سانس سے لے کر ہمارے وجود کی ہر چیز...... تمہارے بال بھی اللہ کی دی ہوئی چیز تھے۔ جسے تم اللہ کی راہ میں دینے سے گھبراتے تھے، ڈرتے تھے، بھاگتے تھے...... اور آخر کار یہ بھی تمہارے پاس نہ رہے۔''

حمیرا بیٹے سے کہتیں نعمان جو جوان تھا...... اور ان کا ہی بیٹا تھا...... روز بروز ماں کی نصیحتوں سے چڑنے لگا تھا۔ حمیرا روتیں اور بیٹے کے لیے بھی دعائیں کرتیں اور پھر ان دعاؤں نے عجیب سمت اختیار کی...... ان کی بس ایک ہی تمنا اور ایک ہی آرزو رہ گئی تھی کہ وہ اس مقدس سرزمین کی خاک کو چومیں اور اپنے تکبر، اپنے گناہوں کی معافی اس کالی کملی والے کے دربار میں جا کر مانگیں مگر اب ان کے پاس اسباب نہیں تھے لیکن اب لگن اتنی سچی تھی کہ دن رات حمیرا کی زبان سے نعتِ رسول مقبول ﷺ جاری رہا کرتی اور وہ وقت بھی آیا کہ حمیرا اس خواہش کے پورا ہونے کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگیں۔ میلاد و درس کی محفلوں میں جانے لگیں۔ لوگوں سے دعائیں کراتیں۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھیں کہ ان کے شوہر کی تو حق حلال کی کمائی تھی پھر ان کا بلاوا کیوں نہیں آیا...... حمیرا کو خود ہی اپنے اندر سے جواب ملتا تب جذبہ سچا اور لگن میں اخلاص نہیں تھا۔ صرف دکھاوا اور دنیا داری تھی...... حمیرا اپنی اس عبادت کا رعب اپنے حلقۂ احباب پر ڈالنا چاہتی تھیں مگر...... اب حمیرا کی لگن سچی تھی تو اسباب نہیں تھے۔ انہیں جنت بی بی کی باتیں یاد آتیں۔ وہ کہا کرتی تھی۔ ''جب وہ ربِ کریم اپنے در پر کسی کو بلاتا ہے تو خود بخود وسیلے پیدا کردیتا ہے۔'' مگر وہ کون سا وسیلہ تھا حمیرا اس سے ناآشنا تھیں۔ ایک روز اچانک جنت بی بی کو اپنے چھوٹے سے گھر میں دیکھ کر حمیرا دنگ رہ گئیں۔ جنت بی بی کے ہاتھ میں کھجور اور آبِ زم زم کی چھوٹی سی بوتل تھی۔

''حمیرا باجی! بہت دکھ ہوا مجھے آپ کے بارے میں جان کر لیکن اس مصیبت پر صبر کرنا۔ اللہ آپ کے دن ضرور پھیرے گا۔'' جنت بی بی نے بڑی ملائمت سے تسلی دی۔ حمیرا رونے لگیں۔ وہ انہیں دلاسہ دیتی رہی پھر کچھ دیر بعد حمیرا سے بولی۔

''میں یہ آپ کے لیے آبِ زم زم اور کھجور لائی تھی۔'' حمیرا دنگ ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ جنت بی بی کے جُھرّیوں زدہ چہرے پر ایک گونہ اطمینان، سکون اور نور کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑی انکساری سے بولی۔

''باجی اس کالی کملی والے نے مجھ خاکسار کو اپنے در پر بلایا تھا۔ حج کی سعادت حاصل کر کے آئی ہوں میں، دو ماہ سے آپ کو تلاش کر رہی تھی۔ اب کہیں جا کر آپ کا اتا پتا ملا... تو یہ تحفہ دینے آگئی۔ بس یہ دو کھجوریں اور دو بوند پانی ہے۔ بالکل خالص آبِ زم زم اور عجوہ کھجور ہے حمیرا باجی۔'' حمیرا نے تڑپ کر جنت بی بی کے ہاتھ پکڑ لیے اور رقت آمیز انداز

میں جنت بی بی کا چہرہ دیکھنے لگیں اور روتے ہوئے جنت بی بی کی آنکھیں چومنے لگیں۔

''یہ آنکھیں...... میرے نبی ﷺ کا روضہ دیکھ کر آئی ہیں، میرے رب کا گھر دیکھ کر آئی ہیں۔ ان پیروں نے وہاں کی خاک چومی ہے۔ مجھے انہیں چومنا ہے۔'' وہ جنت بی بی کو دیوانہ وار چوم رہی تھیں۔ جنت بی بی ان کی تڑپ اور دیوانگی کو کچھ دیر دیکھتی رہی پھر بولی۔

''حمیرا باجی میں آپ کو جتانے نہیں آئی...... اللہ نہ کرے مجھ میں کبھی یہ احساس جاگے کہ میں برتر اور آپ حقیر ہیں...... توبہ توبہ......'' جنت بی بی... اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کرتی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حمیرا نے جنت کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور اپنے کیے پر معافی مانگنے لگیں۔

''مجھے معاف کردو جنت بی بی...... میں نے تمہارے ساتھ بہت بد سلوکی کی...... دل دُکھایا تمہارا...... شاید اسی وجہ سے یہ سب ہوا میرے ساتھ۔''

''ایسا نہ کہیں...... ایسا سوچیں بھی مت...... حمیرا باجی...... ہم بہت گناہ گار لوگ ہیں۔ زندگی میں بہت بار ہم ایک دوسرے کا دل دُکھاتے ہیں، برا سلوک کرتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھی تو کیا سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے جو آپ کے ساتھ ہوا۔ اگر ایسا سب کے ساتھ ہونے لگے اور لوگوں کو اپنے کیے پر شرمندگی ہونے لگے تو یہ دنیا تو جنت بن جائے۔ سب ایک دوسرے سے عبرت حاصل کرلیں...... اور کوئی کسی کا دل نہ دُکھائے...... یہ تو اللہ کی آزمائش تھی آپ پڑ اللہ ہر کسی کو آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ اسے ہی ڈالتا ہے جس کے درجات بلند کرنا چاہتا ہے بس صبر اور استقامت کا دامن بندے کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' جنت بی بی بولی تو حمیرا اس کی باتیں سن کر رونے لگیں۔

''آپ اس کالی کملی والے کے در پر کیسے چلی گئیں...... آپ کا وسیلہ کیسے بنا۔ کیا آپ نے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے؟'' بڑی عاجزی اور رشک سے اس سے پوچھا۔

''بہت لوگ ہیں دنیا میں .... ایسے حمیرا باجی...... جنہیں اللہ نے دولت بھی دی ہے اور انکساری بھی...... آپ کے پاس سے جانے کے بعد میں جس بنگلے میں کام کرنے لگی تھی وہ بیگم صاحبہ نعت محمد ﷺ کی عاشق تھیں...... پتا نہیں کیوں میں جب نعت پڑھتی وہ دل لگا کر سنتی اور روتی جاتیں۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ حمیرا باجی میری آواز اتنی اچھی لگے گی انہیں کہ وہ اپنی ماں کے ایصالِ ثواب کا حج مجھ سے کرائیں گی۔ حالانکہ وہ بیگم صاحبہ خود تین بار یہ سعادت حاصل کر کے آچکی تھیں۔ خود بھی ماں نے کئی عمرے کیے ہوئے تھے۔ لیکن مجھ سے درخواست کی کہ ان کی ماں کا حج کروں تو یہ احسان ہوگا ان پر...... میں بتا نہیں سکتی حمیرا باجی میں ساری رات سجدے میں ہی گری رہی...... میرا رب کتنی اونچی شان والا ہے۔'' جنت یہ سب بتا کر خود بھی رونے لگی۔ ادھر حمیرا بھی رو رہی تھیں۔

''اسے کہتے ہیں وسیلہ...... اور وسیلہ تبھی بنتا ہے جب نیت پاک ہو۔'' وہ جنت بی بی کا ہاتھ پکڑ کر تڑپ کر بولیں۔ ''میرے لیے بھی دعا کرنا جنت بی بی...... اللہ میری تڑپ بھی دیکھ لے میری فریاد بھی سن لے۔ اب تو بس میری ایک ہی خواہش ہے...... میرے آقا کے در پر میری حاضری ہو جائے اور میں وہاں جا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگوں۔'' اتنے میں نعمان اندر آیا اور جنت بی بی کو ماں کے پاس بیٹھا دیکھا تو کترا کر گزرنا چاہا۔ جنت بی بی بڑے والہانہ پن سے نعمان کو دیکھنے لگی۔

''نعمان بابا! حمیرا باجی کتنا سوہنا ہو گیا ہے نعمان...... کبھی لمبے لمبے بالوں میں اچھا نہیں لگا جتنا

آج اچھا لگ رہا ہے مجھے۔'' جنت بی بی بولی۔ نعمان کنفیوزڈ ہوگیا اسے لگا کہ جنت بی بی اس کے گنجے پن کا مذاق اڑا رہی ہیں لیکن جنت بی بی کے چہرے پر محبت بھری سادہ سی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں نعمان کے لیے خلوص اور پیار تھا۔ وہ کافی عرصہ ان لوگوں کے ساتھ رہی تھی۔

''کب کٹوائے نعمان بابا آپ نے یہ بال...... کیسے سوہنے لگ رہے ہیں آپ۔ جیسے حج کر کے آئے ہوں۔'' نعمان کو یقین نہیں آیا کہ واقعی وہ گنجا ہوکر اچھا لگ سکتا ہے۔

''کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں جنت بی بی؟'' وہ بے یقینی سے جنت بی بی کو دیکھنے لگا۔

''بالکل سچ...... اور میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟'' نعمان نے بے یقینی سے کبھی ماں کو اور کبھی اسے دیکھا اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے اوپر ہی خوب ہنسا مگر یہ ہنسی خوداعتمادی کی تھی۔

''کوئی گنجا ہو کر بھی پیارا لگ سکتا ہے؟'' نعمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے پھر وہ جنت بی بی سے بولا۔ ''آپ مجھے بے وقوف بنا رہی ہیں کیا......؟ میرا سارا کیریئر تباہ ہوگیا صرف ان بالوں کی وجہ سے...... سارے دوست مجھے چھوڑ گئے زندگی سے دوست اور رشتے تو گئے ہی تھے۔ جوانی میں حُسن بھی ختم ہوگیا میرا۔''

''بیٹا اگر اوپر والا آپ کی دونوں آنکھیں لے لیتا...... یا دونوں پیروں سے محتاج کر دیتا...... یا...... یہ ہاتھ بھی نہ رہتے...... تو کیا کرتے آپ نعمان بابا؟'' جنت بی بی نعمان کو جذباتی پن سے بولتے ہوئے دیکھ کر بڑے رسان سے بولی۔ نعمان حیرت سے جنت بی بی کو دیکھنے لگا۔

''یہ سب اللہ کا مال ہے، شکر ادا کیا کرو۔ اگر وہ کچھ اور لے لیتا تو آپ کیا کرتے۔'' نعمان خوفزدہ ہوکر ماں کو دیکھنے لگا۔ جنت بی بی نے اسے ہی نہیں بلکہ حمیرا کو بھی کافی تسلی دی اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ نعمان دیر تک جنت بی بی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

قمیص شلوار پہنے بڑا ساد وپٹا اوڑھے حمیرا جیسے کہیں جانے کی تیاری میں تھیں۔

''بہت عرصے بعد آپ کو دیکھا ہے خود پر توجہ دیتے ہوئے، برسوں بعد ایسا لگا ہے مجھے میری ممی جو کھو چکی تھیں واپس مل گئیں۔'' نعمان نے ماں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''زندگی بھر کھوئی رہی ہوں بیٹا، اپنے اصل کی طرف تو اب لوٹی ہوں اور تم بھی تو زندگی کی طرف لوٹ آئے ہو۔'' حمیرا ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

''زندگی کی طرف نہیں سچائی کی طرف لوٹ آیا ہوں ممی...... یقین کیجیے اتنا سکون ملتا ہے مجھے جب عالمِ دین کی قربت میں بیٹھتا ہوں، اپنے رب کی بارگاہ میں پانچ وقت سجدہ کرتا ہوں، ساری بے چینی ختم ہوگئی میرے اندر کی۔ اب مجھے کوئی خوف، کوئی گھبراہٹ نہیں رہی۔'' حمیرا نے نم آنکھوں سے بیٹے کو دیکھا۔

''آپ کہیں جا رہی تھیں ممی؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''ہاں...... درس کی محفل میں جا رہی تھی......''

''وہ تو آپ کافی عرصے سے جا رہی ہیں لیکن آج مجھے کوئی خاص بات لگ رہی ہے آپ کی تیاری سے۔''

''وہ دراصل مدرسے کی معلمہ صاحبہ چاہتی ہیں میں طالبات کو اردو اور انگریزی کی تعلیم دوں۔ اس لیے آج سے میں مدرسے میں سامعہ نہیں بلکہ معلمہ بن کر جا رہی ہوں۔'' انہوں نے مسکرا کر بیٹے کو بتایا۔

''لیکن ممی...... آپ نوکری کریں گی...... مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''ارے بیٹا...... میں یہ نوکری دنیا بنانے کے لیے نہیں اللہ کو منانے کے لیے کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھے مت روکنا ورنہ

دکھوں کا سمندر میرا سینہ پھاڑ ڈالے گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' وہ ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے دنیا اور دنیا والوں کی کوئی پروا نہیں۔ دیکھا تم نے نعمان...... جب سے ہم اس چھوٹے سے گھر میں آکر رہنے لگے ہیں سب نے منہ موڑ لیا ہم سے...... یہاں تک کہ میری سگی بیٹی بھی کھڑے کھڑے ملنے آتی ہے مجھ سے۔ انسان بھی کتنا بے وقوف ہے ساری عمر دنیا داری اور مادی رشتوں کے چکر میں ہی گھومتا رہتا ہے اور اپنے لیے خسارے کا سامان کرتا ہے۔''

''یہ دنیا چیز ہی ایسی ہے ممی...... چاہ کر بھی انسان اس بھنور سے نکل نہیں پاتا۔ خیر...... یہ سب چھوڑیں آپ کو دیر ہو رہی ہوگی میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔'' وہ دونوں ساتھ ساتھ گھر سے نکلے۔ حمیرا بیٹے کے چہرے کو دیکھتی جاتیں اور دل ہی دل میں سوچتی جاتیں۔ ''نعمان کے چہرے پر داڑھی کا چھوٹا سا خط کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے نعمان کا دل بھی میرے دل کے ساتھ ہی پلٹا...... اگر اس کا دل نہ پلٹتا تو میری تو بچی کھچی پونجی بھی فنا ہو جاتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے جنت بی بی کی دعا لگی ہے مجھے...... وہ پُرسکون سانس لے کر مدرسے کے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔



''جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں آج مدرسے میں نعتیہ مقابلے کا انعقاد ہے۔ پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والی بچیوں کو انعامات سے نوازا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس محفل میں سب شرکا کے لیے بھی ایک خوشخبری ہے اور وہ یہ کہ جن کرسیوں پر آپ سب لوگ تشریف فرما ہیں ان سب کے نمبرز یہاں ہمارے پاس اس ڈبے میں موجود ہیں اور کسی ایک نمبر پر عمرے کا ٹکٹ انعام میں رکھا گیا ہے۔ اب معلوم نہیں کون ہے وہ خوش نصیب جسے آج عمرے کا ٹکٹ ملے گا...... ہمارے معزز مہمان یا ہماری کوئی طالبہ یا ہمارے مدرسے کی کوئی معلمہ یا مدرسے میں کام کرنے والی کوئی ملازمہ...... آپ میں سے کوئی بھی خوش نصیب آج یہ انعام لے جا سکتی ہے۔'' حمیرا نے کھڑے ہوکر کھلے میدان میں بچھی تمام کرسیوں پر ایک نظر کی وہ انہی میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

''ایسا لگتا ہے جیسے خواتین اور بچیوں کا سیلاب امنڈ آیا ہو۔'' حمیرا مایوسی سے اِک آہ بھر کر رہ گئیں۔ ''میں کہاں اتنی خوش نصیب......''

متبرک تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا پھر طالبات حمد و نعت کے لیے بار بار آتی رہیں اور محفل میں ایک سماں سا بندھ گیا۔ حمیرا اس خوب صورت محفل میں پڑھی جانے والی نعتوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھیں کہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب محفلِ نعت اختتام پذیر ہوئی اور کب انعامات بھی تقسیم ہوگئے۔ وہ تو ایک وجد و سرور کی کیفیت میں خود ہی نعت پڑھ رہی تھیں۔

''نصیباں کھول دے میرا...... میں دیکھاں روضہ تیرا''

حمیرا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے تبھی مدرسے کی ایک استانی حمیرا کو جھنجوڑ کر خوشخبری دینے لگیں۔

''ٹیچر حمیرا مبارک ہو آپ کو عمرے کا ٹکٹ آپ کو ملا ہے۔'' حمیرا دنگ رہ گئیں، بے یقینی سے اس استانی کو دیکھا اب وہ حمیرا کا نام پکار رہی تھیں۔ سب مہمان تالیاں بجا رہے تھے۔ حمیرا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ اوپر آسمان کی طرف تشکر بھرے جذبات لیے دیکھنے لگیں اور پھر وہیں فرش پر سجدے میں گر گئیں۔ پروردگار نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی۔



دِلِ غم سے بوجھل ہے



انجم انصار

گزشتہ ماہ ہم نے اپنی مایہ ناز مصنفہ لبنیٰ عروج کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے لبنیٰ عروج نمبر نکالا...... تو ان کے چاہنے والوں نے ہم سے اس طرح تعزیت کی جیسے لبنیٰ عروج ان کی قریبی رشتے دار ہوں...... اور جن کے جانے سے ان کی زندگی میں کوئی خلا پیدا ہوگیا ہو۔ دراصل قلم کے رشتے روح کے تاروں تک سے گندھے جاتے ہیں تو دکھ اور سکھ سانجھے ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں وہ کسی طرح بھی خون کے رشتوں سے کم نہیں ہوا کرتے۔ اس ماہ...... تاخیر سے ملنے والی چند تحریریں ہم شامل کررہے ہیں۔ جن کو پڑھ کر آپ کو یقیناً اندازہ ہوجائے گا...... کہ جو احساسات ان کی بہن بیلا کے ہیں ویسے ہی ساجدہ حبیب کے بھی ہیں، نگہت سیما کے بھی ہیں اور وہی دکھ ہمارے تبصرہ نگاروں اور قارئین نے بھی محسوس کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ دکھ جھیلنے کی طاقت اور حوصلہ عطا فرمائے، آمین۔

لبنیٰ عروج میری بہن

لبنیٰ سے جدا ہوئے اتنے دن بیت گئے مگر کوئی پل، کوئی لمحہ اس کی یاد سے خالی نہیں۔ اشکوں کا سیلِ رواں ہے کہ تھمتا ہی نہیں۔ 2 اگست 2012ء نے مجھ سے میری لبنیٰ چھین لی۔ غم کا یہ پہاڑ میری قوتِ برداشت سے باہر ہے... گو کہ میں اس سے بڑی تھی مگر وہ میری ہمدم و ہم راز تھی۔ کوئی معاملہ ہو کوئی موقع کوئی مرحلہ کوئی خوشی کی خبر یا کوئی الجھن ہو وہ سب سے پہلے مجھے بتاتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی پہلا فون اس کا ہوتا تھا۔ مجھے بتانے اور ڈسکس کرلینے کے بعد وہ گویا پُرسکون ہوجایا کرتی تھی۔ تمام رائٹرز کا مجھ سے ذکر کیا کرتی تھی۔ کیا کیا بتاؤں! لبنیٰ بے پناہ خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک دردمند دل رکھنے والی دوسروں کو جلد منا لینے والی وہ کسی سے ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔ اسلام آباد سے آتی یا کراچی سے میرا گھر اس کا مسکن ہوتا تھا۔ وہ میرے ہاں بہت خوش رہتی



لبنیٰ اپنے بچوں کے ساتھ

تھی۔ پوری رات ہم دونوں جاگتے تھے۔ باتیں تھیں کہ ختم نہ ہوتی تھیں۔ صبح کو ظفر بھائی اور میرے میاں دونوں ہی کہتے کہ رات کتنے بجے سوئی تھیں لگتا ہے اذانیں سن کر سوئی ہوں گی۔ لبنیٰ کا قیام میرے لیے انمول مسرت کا حامل ہوتا۔

لبنیٰ اور میں بہت ہنستے تھے۔ ہمارے قہقہے مشہور تھے۔ وہ محفلوں کی جان لبنیٰ ہائے میری لبنیٰ وہ ہم سب کو روتا چھوڑ کر یوں اچانک چلی جائے گی منوں مٹی تلے چھُپ جائے گی کبھی سوچا بھی نہ تھا اس کا نہ ہمیں ادراک تھا نہ احساس...... میں کمروں میں بولائی بولائی سی پھرتی ہوں، روتی ہوں اور کہتی ہوں لبنیٰ تم مجھے تنہا کرگئی ہو۔ اپنی بیلا باجی کو اکیلا کرگئی ہو۔ لوگ مجھے صبر کرنے کا کہتے ہیں، لبنیٰ بتاؤ، تمہارے بغیر صبر کرلوں یہ کیسے ممکن ہے۔ ظفر بھائی سے اور بچوں سے بات کرتی ہوں تو دکھ مزید بڑھتا ہے۔ بچے شدتِ غم سے روتے ہیں تو مجھے فون کرکے کہتے ہیں بیلا آنٹی ماما بہت یاد آرہی ہیں۔ پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور دونوں طرف سے سسکیوں، آہوں اور آنسوؤں کا سیلاب امڈ اچلا آتا ہے۔ ہم دونوں میں بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ امن کی پیامبر تھی۔ محبتوں کی سفیر تھی۔ میرے بچوں کو اپنی لبنیٰ آنٹی سے بے پناہ محبت تھی۔

وہ دوستی رکھتی تھی، نبھاتی تھی۔ سچی اور کھری تھی۔ بہت جلد ہار گئی۔ کاش...... اپنے بچوں کی خوشیاں تو دیکھ جاتی۔

مسز نبیلہ اسلم
وائس پرنسپل ایف جی پبلک اسکول
سرگودھا کینٹ

یادیں رلاتی ہیں

شومئی قسمت کہ دنیا کے اس بھرے میلے میں میری لبنیٰ عروج سے کہیں بھی، کوئی ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود...... وہ میرے لیے قطعی طور پر اجنبی نہیں تھی۔ بس اِک تعلق تھا کسی انجانے رشتے

اور احساس کا کہ وہ اپنی تھی اور اپنی ہی لگتی تھی۔ یہ غالباً 1983ء کے موسمِ بہار کا آغاز تھا۔ جب مجھے اقبال بانو کا اِک طویل خط موصول ہوا۔ جس میں حرفِ آخر کے طور پر لکھا گیا تھا۔

”ارے ہاں یاد آیا...... ایک بہت ہی پیاری سی لڑکی ہے لبنیٰ عروج جس کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ اس نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے۔ تمہاری زبردست فین ہے اور تم سے خط و کتابت کرنا چاہتی ہے۔ کیا تم اس ضمن میں میری سفارش قبول کرسکتی ہو۔“ ان دنوں میرے ادبی کیریئر کا تقریباً آغاز تھا۔ ڈائجسٹوں کی دنیا سے شناسائی کو فقط چار سال ہوئے تھے۔ میں اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے یہ سفارش قبول کرلی اور پھر چند دن کے بعد ہی مجھے لبنیٰ عروج کا پہلا خط ملا۔ بے حد خوب صورت لکھائی میں الگ الگ لفظوں کے ساتھ اِک منفرد اور جامع طرزِ تحریر میرے سامنے تھی۔ ہر بات، ہر فقرہ، چچا تلا، کہیں کوئی جھول کوئی بھی لفظ اور جملہ تسلسل سے ہٹ کر نہیں تھا۔ میں بہت متاثر ہوئی۔

خیر یہ سلسلہ چل نکلا...اور خطوط کی اس دنیا میں ہم ایک دوسرے کے سنگی ساتھی اور خیر خواہ بن گئے۔ لبنیٰ عروج وطن پرست خاتون تھیں۔ افواجِ پاکستان پر تحریر کردہ میری ہر تحریر اسے بے حد بھاتی تھی اور ایسی ہر تحریر پڑھنے کے بعد وہ اپنے خطوط میں کچھ اس طرح تبصرہ کرتی کہ اس تبصرے میں تنقید کا کوئی بھی پہلو نہ پایا جاتا جبھی تو میں اسے لکھتی تھی۔

”لبنیٰ عروج تم واقعی بہت بہترین نقّاد ہو۔“

اس کی اسی چاہت اور فرمائش پر جب ظفر بھائی نے نیوی جوائن کی تو اس کی خوشی پھر ایک تحریر کی صورت میں سامنے آئی۔ شاید وہ دن اس کی زندگی کا اہم ترین دن ہوگا۔ جب اس نے اپنے جیون ساتھی کو یونیفارم میں دیکھا اور پھر اپنے بیٹے کے لیے اس کی یہی خواہش تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا تھا۔

”شاید...... وہ دن بھی میری زندگی کا ایک اہم ترین دن ہوگا جب میرا بیٹا اطیب تینوں فورسز میں سے کسی ایک کے یونیفارم میں ملبوس میرے سامنے آئے گا۔“ قدرت نے لبنیٰ عروج کی یہ خواہش بھی پوری کردی کہ بلاشبہ قدرت مہربان ہے۔

ظفر بھائی کی پوسٹنگ کے بعد جب وہ کراچی شفٹ ہوئی تو اقبال بانو سے اس کی میل ملاقات رہی۔ بانو نے مجھے لکھا۔

”کل ہم لبنیٰ عروج کے ہاں کلفٹن گئے۔ اس کی زبردست مہمانداری اور پذیرائی کا حال کیا سناؤں؟ ایسے دوست خوش نصیب انسانوں کا مقدر ہوتے ہیں۔“

ایک اہلِ قلم کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ جس میں بڑے لوگ اور بڑے ناموں نے شرکت کی۔ وہاں پر اسی سماں کی اجارہ داری تھی۔ جس کے تحت ڈائجسٹوں میں لکھنے والوں کو تو ادیب تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ بولنے والے بول رہے تھے۔ بہت کچھ کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر ہمیں اہلِ قلم تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تو پھر بھلا مدعو کیوں کیا گیا تھا۔ جبھی مجھے لبنیٰ عروج کی بات یاد آئی۔

”یہ ڈائجسٹ تو ہمارا میکا ہیں۔ اور دنیا کی ہر خاتون کو اپنا میکا بے حد عزیز اور پیارا لگتا ہے۔“

ہماری زندگی کا ہر آنے والا سال...... جب ہمارے لیے امیدوں اور آرزوؤں کا نیا پیغام لاتا ہے... تو اپنے جلو میں ان برسیوں کا رنج و دکھ بھی لاتا ہے۔ جن میں ہمارے پیارے رحلت کے مراحل طے کرنے کے بعد ربِ کریم کے حضور پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ میں ہر سال اپنی ڈائری میں ان تاریخوں کے گرد گول دائرے لگا دیتی ہوں۔ ان میں سے سب سے دکھی دائرہ خالدہ اسد کی برسی کا ہے۔ مورخہ 23 ستمبر 1999ء حالانکہ برسوں ہی پیاری انجم

انصار نے فون پر گفتگو کے دوران کہا۔

”خالدہ اسد تو آج بھی پاکیزہ میں زندہ ہے۔“ اور اب ایک نیا دائرہ میرے سامنے ہے۔ لبنیٰ عروج مورخہ 2 اگست 2012ء جی ہاں محترم قارئین یہ وہی لبنیٰ عروج ہے۔ جس سے زندگی میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ خطوط لفظوں اور تحریر کی دنیا میں ہی ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ہمیں دنیا کی نہایت اہم اور معتبر حقیقت ”قلم“ کے ذریعے ہی ایک دوسرے سے آگہی رہی... اور جب...... میں نے اس کی رحلت پر تعزیت کے لیے محترم بھائی ظفر اقبال کو فون کیا تو انہوں نے بتایا۔ اس کی ذاتی فائل میں آپ کے تمام خطوط محفوظ ہیں۔“ شرمندگی کا اِک احاطہ میرے چاروں طرف پھیل گیا۔ میں ہی بے پروا تھی۔ ..یا پھر شاید کسی دائمی زندگی پر یقین رکھتی تھی کہ آج اس کی کوئی بھی تحریر میرے پاس موجود نہیں۔ یہ نایاب دولت میں نے دل میں تو ضرور محفوظ کرلی لیکن دنیاوی طور پر کھو بیٹھی اور اس کوتاہی کے لیے شاید میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کرسکوں۔

وہ میرے اتنے قریب تھی۔ ایک دو برس کی تو بات ہی کیا۔ وہ بفضلِ تعالیٰ تیرہ برس تک اسلام آباد میں مقیم رہی لیکن خطوط کی دنیا سے رابطہ ٹوٹنے کے بعد ہم اپنے اپنے جہان کے باسی ہوگئے۔ لبنیٰ عروج نے مورخہ 2 اگست بروز جمعرات رمضان المبارک کے مقدس ماہ میں دن ساڑھے بارہ بجے سی ایم ایچ راول پنڈی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ میرے لیے یہ انکشاف کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ تو کیا......؟ وہ اپنی طویل بیماری کو اپنے اندر چھپائے ہوئے اپنے ریزہ ریزہ وجود کے ساتھ...... میرے اتنے قریب رہ کر اتنی دور چلی گئی اور میں بے خبر رہی۔

بلاشبہ وہ نہایت خوش قسمت خاتون تھی۔ جسے اپنے ربّ کے حضور پیش ہونے کے لیے رمضان المبارک کی پاک، ساعتیں نصیب ہوئیں۔ مولائے کُل اس کی روح کو غریقِ رحمت فرمائے۔ اس کے درجات بلند ہوں اور ہم سب کو ربِّ کریم صبرِ جمیل سے نوازے۔

(آمین ثم آمین)

تحریر...... ساجدہ حبیب

سردیوں کا انمول تحفہ کاجو

کاجو انتہائی خوش ذائقہ میوہ ہے، جسے فرائی بھی کر کے کھایا جاتا ہے۔ اس میں زنک کی کافی مقدار پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے استعمال سے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کینیڈا میں کی گئی ایک حالیہ طبی تحقیق کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کاجو کا استعمال ذیابیطس کے علاج میں انتہائی اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کاجو کے بیج میں ایسے قدرتی اجزا پائے جاتے ہیں جو خون میں موجود انسولین کو عضلات کے خلیوں میں جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق کاجو میں ایسے ایکٹو کمپاؤنڈز پائے جاتے ہیں جو ذیابیطس کو بڑھنے سے روکنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا ذیابیطس کے مریضوں کے لیے کاجو کا باقاعدہ استعمال انتہائی مفید ہے مگر کولیسٹرول کے مریض احتیاط کریں۔

فریدہ خانم، لاہور

قلم کا رشتہ

لبنیٰ عروج کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتی لیکن

میں نے ان کی کہانیوں کو پڑھا ہے۔ جب انجم نے ان کی وفات کی خبر سنائی تو مجھے شاک سا لگا۔ لکھنے والے ایک دوسرے سے ملیں یا نہ ملیں ایک دوسرے کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں لیکن سب جیسے ایک زنجیر میں پروئے ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب شازیہ چودھری کا انتقال ہوا جب پروین شاکر کا حادثہ ہوا تو میری کزنز، میری دوستوں نے مجھ سے یوں افسوس کا اظہار کیا جیسے کہ وہ میری کوئی بہت اپنی ہوں۔ قلم کا یہ رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ اپنے دکھ سکھ لگتے ہیں۔ لبنیٰ سے بھی قلم کا یہی رشتہ تھا جس نے بہت دیر تک ملول رکھا...... اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

نگہت سیما...... چکوال

ماہر کاریگر

مجھے ذاتی طور پر لبنیٰ عروج کی تحریریں بہت پسند تھیں وہ بے شک کم لکھتی تھیں مگر جب بھی لکھا لاجواب لکھا۔ افسانے پر ان کا قلم کسی ماہر کاریگر کی طرح کام کرتا تھا۔ بہت اچھے موضوعات پر اور بہت اچھے افسانے انہوں نے لکھے۔ لبنیٰ سے گو میں کبھی نہیں ملی مگر مجھے ان کی وفات کی خبر پڑھ کر ایسا ہی لگ رہا ہے کہ جیسے میری کوئی قریبی عزیزہ مجھ سے جدا ہوگئی ہو۔ اللہ تعالیٰ لبنیٰ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

رضوانہ پرنس، کراچی

ہمیں پیار ہے

میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں...... انجم باجی کی تحریروں کی زبردست فین ہوں۔ کبھی پاکیزہ میں خط نہیں لکھا۔ کبھی فون نہیں کیا مگر جب لبنیٰ عروج کے انتقال کا پڑھا اور دل غم سے بوجھل پڑھا تو میرا بھی دل غم سے بوجھل ہوگیا۔ رائٹرز کو شاید یہ بات معلوم بھی نہ ہو کہ ان کے قارئین ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں لبنیٰ عروج کے لیے ایک ہزار مرتبہ کلمہ پڑھ چکی ہوں اور بھی بہت کچھ پڑھ رہی ہوں ان کے ایصالِ ثواب کے لیے کہ ہمیں اپنی رائٹرز سے بہت پیار ہے۔

زاہدہ نور...... لاہور

ایک اچھی رائٹر

لبنیٰ عروج اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے (ثم آمین) ان کا اور میرا لکھنے لکھانے کا سفر اقبال بانو، مہناز عرفان، لبنیٰ غزل وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہی شروع ہوا۔ ہم دونوں ماہنامہ حور زیب النسا اور اسی طرح کراچی سے نکلنے والے کئی نامور جرائد میں تقریباً ہر ماہ باقاعدگی سے حاضر ہوتے تھے چونکہ وہ نوعمری کا دور تھا اس لیے ذاتی طور پر مجھے لبنیٰ عروج کی تحریریں اچھی لگتی تھیں اور وہ میری فیورٹ رائٹرز میں شامل تھیں۔

مجھے یقین ہے ادب کی دنیا میں یہ خلا کبھی پُر نہیں ہوگا۔

(نجمہ جبیں علیزئی، ڈی آئی خان)

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا

ہنستی کھلکھلاتی، ہر طرف قہقہے اور خوشیاں بکھیرتی لبنیٰ ہم سے اتنی دور چلی گئیں کہ جتنی مرضی صدائیں دے لیں وہ واپس نہیں آئیں گی جب کچھ عرصہ وہ پاکیزہ سے غیر حاضر ہوتی تھیں تو ہم انہیں صدائیں دے کر بلا لیتے تھے اور وہ فوراً حاضر ہو جاتی تھیں مگر اب کس کو صدا دیں کیسے بلائیں رواں اشکوں کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک لبنیٰ جی...... کی قبر کو ایمان کی روشنی سے منور کرے۔ اللہ پاک ان کے تینوں بچوں اور شوہر کو اتنا بڑا صدمہ سہنے کا حوصلہ وہمت عطا کرے۔ آمین!

فائزہ شہزاد، حیات آباد



اردو ادب کے ستارے

نزہت اصغر

گزشتہ دنوں اردو ادب کے دو...... درخشاں ستارے اس جہانِ فانی سے معدوم ہوئے مگر ان کے ادبی کارناموں کی تابانیاں آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا کام انجام دیتی رہیں گی۔

چند سال قبل برصغیر کی نامور ادیبہ قرۃ العین حیدر کی ملکِ عدم کو رخصت ابھی اہلِ ذوق کو نہ بھولی تھی کہ حاجرہ مسرور اور رضیہ بٹ کی جدائی کی خبر آگئی...... جو اہلِ ادب کو سوگوار کرگئی۔

حاجرہ مسرور

حاجرہ مسرور نے اس زمانے میں آنکھ کھولی جب اردو افسانہ ارتقائی منازل طے کر رہا تھا لیکن جب حاجرہ مسرور نے لکھنا شروع کیا تو ان کے ارد گرد نہایت قد آور شخصیات اس میدان میں سرگرمِ عمل تھیں۔ حاجرہ مسرور اپنے قلم کے جادو کے زور پر نہایت مختصر مدت میں اپنے ہم عصروں کے مقابل آن پہنچیں۔ اس نامور قلمکار کا تعلق ہندوستان کے مرکزِ علم وادب لکھنؤ سے تھا۔ حاجرہ نے نہایت علم و ادب دوست ماحول میں پرورش پائی ان کی تربیت میں والدہ کا دخل زیادہ رہا کیونکہ ان کے والد ڈاکٹر تہوّر احمد خان حاجرہ کے بچپن ہی میں انتقال فرما گئے انہیں خدیجہ مستور جیسی بڑی بہن کی ادبی سنگت نصیب ہوئی۔

افسانے کے ضمن میں اردو ادب کی تاریخ میں ان دونوں بہنوں کی کاوشوں کو سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ حاجرہ کی نوعمری اور جوانی کا زمانہ برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی الگ وطن کے لیے جہدِ مسلسل اور قربانیاں دیکھتے ہوئے گزرا۔

حاجرہ نے متنوع کرداروں کے ذریعے اپنے عصر اور معاشرتی حالات کو خوب صورتی سے پیش کیا۔ اگرچہ وہ اپنے سینئرز سے بھی متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کے زمانے میں ادب برائے زندگی اور ادب اور انقلاب کی آواز اٹھی جس میں حاجرہ کے افسانوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ ان کی تحریریں سماجی قدروں اور پابندیوں اور ان سے مسخ سماج کی گری ہوئی جنسی حالت پر بھرپور طنز تھیں۔ انہوں نے غیر محسوس طریقے سے نفسیاتی تجزیے پیش کیے کہ معاشرتی حقیقت نگاری کے دیگر پہلوؤں کی بھی اپنے افسانوں میں ترجمانی کی یوں اپنے موضوعات کو وسعت دیتے ہوئے عصری تقاضوں کو پورا کیا۔

یکسانیت کسی بھی قلمکار کی تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ لگا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے مگر حاجرہ کے افسانے اس سے پاک ہیں۔ افسانہ ''بھالو'' سمیت کئی افسانوں میں انہوں نے اس قدر خوب صورت نشتر چلائے ہیں کہ پڑھنے والا چبھن ولذت ایک ساتھ محسوس کرتا ہے۔

غرض یہ کہ حاجرہ مسرور کی تحریریں کسی ایک حقیقت یا زمانے کے لیے نہیں بلکہ رمزیت لیے ہوئے آج کے زمانے پر بھی پوری اترتی ہیں۔ آج کی ادبی ذوق رکھنے والی جواں نسل کو ان کے مایہ ناز قلمکاروں کی کاوشیں اچھی طرح پڑھ کر طبع آزمائی کرنا چاہیے کیونکہ یہ ایک مکتب ہیں...... رہنمائی کا ذریعہ ہیں اور مکمل استاد ہیں۔ حاجرہ نے اپنے قبیل کے سینئرز کا ہمیشہ احترام کیا اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے افسانے کو اساسی حیثیت بخشی...... مقصدیت، حقیقت نگاری، رومانیت اور فنی لطافت کا احساس

آنے والے ہر دور میں افسانے کی روایت رہی سو حاجرہ مسرور جیسے لکھاریوں نے اسے نہ صرف قائم رکھا بلکہ آگے بڑھایا تاکہ افسانہ نگار محض تذکرہ کرنے یا ناصح کا کام نہ دے۔ حاجرہ کی تحریروں میں کہیں... بھی غیر فطری اور خواہ مخواہ کی سنسنی خیزی دکھائی نہیں دیتی اور یہی انداز آج کے قلمکاروں کو سیکھنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حاجرہ مسرور کو حقوقِ نسواں کی علمبردار کہا جاتا ہے۔

حاجرہ مسرور کے اعزازات

1۔ پرائڈ آف پرفارمنس...... 1995ء
2۔ نگار ایوارڈ (بہترین فلمی اسکرپٹ رائٹر)
3۔ عالمی فروغِ ادب ایوارڈ۔ (چند مشہور افسانے) چاند کے دوسری طرف۔ میری منزل، اندھیرے اجالے، چوری چھپے، ہائے اللہ، چرکے، وہ لوگ، بھالو وغیرہ۔
5۔ افسانوں کے کم از کم سات مجموعے شائع ہوئے۔

رضیہ بٹ

اردو افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا دور کوئی بہت قدیم نہیں یہ شاید بیسوی صدی کے آغاز کی بات ہے کہ جب مختصر کہانی اور نثری داستان کا آغاز ہوا جس میں تراجم بھی شامل تھے۔ مرد افسانہ نگاروں کی کاوشیں خالص ادبی پرچوں میں چھپا کرتیں اگرچہ وہی روایت آج بھی چلی آرہی ہے۔ اردو ناول نگاری و افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، صدیقہ بیگم، جیلانی بانو، قرۃ العین۔ حجاب امتیاز علی، زبیدہ خاتون، بشریٰ رحمٰن، بانو قدسیہ و دیگر سب نام سامنے آئے یوں خواتین کسی بھی طرح ادبی میدان میں مردوں سے پیچھے نہ رہیں۔

وہ دور خالص مطالعے کا دور تھا۔ ادب کے عروج کا زمانہ تھا۔ یوں ایک کے بعد ایک کاوشیں سامنے آتی رہیں۔ یہ وہ دور تھا کہ جب اور کسی قسم کی دلچسپیاں خواتین کے لیے علاقۂ ممنوعہ ..... کا درجہ رکھتی تھیں ایسے میں یہ ناولز ان خواتین کو روزن کا کام دیتے جو ادبی ذوق کی حامل تھیں۔ بے انتہا روشن فکر بڑوں کی موجودگی میں بھی عصمت چغتائی کے قبیل کی کاوشیں پڑھنا ممنوع تھا تو بے چاری گھریلو خواتین ذوقِ آگہی رکھنے کے باوجود کچھ نہ کر پاتیں ایسے میں خالص خاندانی رشتوں کی بابت لکھنے والی رضیہ بٹ کی تحریریں ان پُرشوق ذہنوں کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوئیں، اے آر خاتون، نادرہ خاتون، زبیدہ خاتون، رضیہ بٹ جیسی لکھاریوں کی کاوشیں کتابی شکل میں آتے ہی قارئین کے ذاتی کتب خانوں میں سج جاتیں۔ رومانوی ناولوں... اور پُراثر افسانوں کی ملکۂ عالیہ رضیہ بٹ 1940ء کے عشرے میں منظرِ عام پر آئیں اور چھا گئیں جو باذوق ذہن چند قدآور لکھاریوں کی کتب کو پڑھنے پر پابندی کی زد میں تھے۔ وہ نہال ہوگئے' رضیہ بٹ کی تحریریں اپنے عصری ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ عورت کی خالص فکر اور ذہنیت کو بھی بیان کرتی ہیں۔

ناول نگاری میں چونکہ بیانیہ انداز اور منظر نگاری کی وسیع گنجائش ہوتی ہے جس کے باعث قاری بڑے آرام سے اس عصر کی ثقافت، روایات ...... اور طرزِ معاشرت سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ معاشرے میں عورت کے کردار کو مرکزی اہمیت دیتی رہیں جبھی اپنے تمام ناولز کے نام ان کے مرکزی کرداروں پر ہی رکھے گئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے تناظر میں لکھا گیا ان کا ناول ''بانو'' بے انتہا شہرت کا حامل ہوا جس کی بدولت نئی نسل تک تقسیمِ ہند کے حالات و واقعات پہنچے۔ مطالعے کے رجحان میں کمی کے باوجود رضیہ بٹ جیسی اعلیٰ قلمکاروں کی کاوشیں آج بھی اسی ذوق شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ پاکیزہ میں انہوں نے ایک عرصے تک لکھا اور یہ ہمارے لیے نہایت قابلِ فخر مقام ہے۔

رضیہ بٹ اگرچہ کم آمیز سہی مگر کم مشاہدہ ہرگز نہ تھیں ان کا مشن لکھنا تھا۔ ہر موضوع پر اس کی جزئیات کے ساتھ لکھنا...... انسانی رشتوں کی نفسیات جاننا اور تجزیہ کرنا صرف بیانیہ انداز میں نہیں بلکہ کرداروں کے ذریعے ان کے اپنے خیالات مترشح ہوتے اور یہ ایک ناول نگار کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ اتنی مضبوط کردار نگاری ہو کہ شروع سے آخر تک ایک ہی انداز...... رضیہ بٹ کے لکھے کردار اسی آب و تاب کے ساتھ آج بھی معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں وہ بلاشبہ ایک دلعزیز ناول نگار تھیں...... انہوں نے نوجوان نسل کو ہر اعتبار سے ایک صاف ستھرا ادب فراہم کیا وہ انسانی رشتوں کی زنجیر کو یوں بُنتی ہیں کہ کڑیاں اُلجھتی نہیں' وہ ایک خلوت پسند، پُرسکون اور سیر چشم شخصیت کی مالک تھیں جبھی انہیں خود نمائی کے لیے مادی وسیلوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ اہلِ قلم بلاشبہ بہت حساس ہوتے ہیں بلکہ حساس ترین...... جبھی وہ ہر ذہنی سطح تک اپنی تحریر کے ذریعے بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں اور ان کی تحریریں کبھی مرہم تو کبھی نشتر کا کام کرتی ہیں مگر نشتر بھی وہ نشتر جو ناسور کو جسم سے نکال پھینکے اور جسم کو ایک نئی زندگی عطا کرے۔

ادیب معاشرے اور وقت کا نبّاض ہوتا ہے گویا طبیب...... اور ایسے ادیب کبھی مرا نہیں کرتے بلکہ حیاتِ جاوداں پاتے ہیں۔ آج ہماری دو نامور قلمکار ملکِ عدم سدھاریں مگر ان کی قلمی کاوشیں سدا ہمارے ساتھ رہیں گی۔

وقت بیتا ہے نہ بیتے گا کبھی
بیت جانے والی شے ہے زندگی

رضیہ بٹ کی کاوشیں

1۔ ناولوں کی تعداد...... ترپّن سے زائد۔
2۔ مشہور کاوشیں...... صاعقہ، نائلہ، انیلا، عاشی، ناجیہ، شبو، بانو، شائنہ بین، رابی، بینا وغیرہ۔
3۔ کئی ناولوں پر فلمیں اور ڈرامے بھی بنے اور بہت کامیاب ہوئے۔

☆☆☆

مجھ سے ملیے

مجھے فرح زیبا کہتے ہیں، میں چار جون کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ میرا اسٹار جوزا ہے، پاکیزہ ڈائجسٹ سے مجھے میری دوست فریدہ خانم نے متعارف کروایا ہے۔ اتنے اچھے ڈائجسٹ میں لانے کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ میں گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین رائے ونڈ، لاہور کی پرنسپل ہوں۔ میں نے ایم اے ایجوکیشن اور پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ ان ویمن اسٹڈیز کیا ہے۔ ان دنوں میں اسپیشل ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ میرے مشاغل میں انسانیت کی خدمت، کتب بینی، باغبانی اور کوکنگ ہیں۔ قائدِ اعظمؒ، علامہ اقبال اور محترمہ فاطمہ جناح کے حوالے سے بہت سے پروگرام منعقد کروائے۔ مجھے ان خدمات پر 2011ء میں فروغِ تعلیم فاؤنڈیشن نے گولڈ میڈل ایوارڈ سے نوازا۔ سکھ چین ویلنس (wellness) کلب کی طرف سے ایکسیلینس ویمن آف دی ایئر 2011ء میں ایوارڈ ملا۔ خانۂ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران کی طرف سے 2012ء میں سلور میڈل اور رائٹرز گلڈ کی طرف سے ڈینگی کی خدمات اور فلاحی کام پر گولڈ میڈل ملا۔ میرے پسندیدہ رنگوں میں کالا، شہر مدینہ شریف موسم بہار اور بہار میں بارش ہو تو مزہ آجائے۔ قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ پسند ہے۔ پسندیدہ دوست فوزیہ باجی اور ممتاز ہیں۔ مجھے زندگی میں سب سے زیادہ اپنی ماں سے پیار ملا۔ اپنے والد صاحب کو کم عمری میں گنوانے کا دکھ ختم ہی نہیں ہوتا۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی جب میری کارکردگی پر مجھے ایوارڈ ملے۔ آپ کو مجھ سے مل کر کیسا لگا؟ بتایئے گا ضرور۔ اللہ حافظ

قربانی کا گوشت اور پکوان کے لازمی اغذیہ

شائستہ زریں

ہماری اور ادارہ پاکیزہ کی جانب سے بقر عید کی دلی مبارک باد۔ ہماری انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ تہواروں، خاص مواقع اور خصوصی شماروں کی مناسبت سے آپ کو ایسی تحریروں کی سوغات دیں جو دلچسپ اور آپ کے لیے رہنما ثابت ہوں۔ اس مرتبہ عیدِ قرباں کی مناسبت سے ہمارا موضوع قربانی کا گوشت ہے۔ قربانی کا کچا گوشت محفوظ کرنے کے طریقوں کے لیے مائیکرو بائیلوجسٹ ڈاکٹر نجیحہ طلعت کے ماہرانہ مشورے نذرِ قارئین ہیں۔ آپ نے حال ہی میں پوسٹ ڈاکٹر ریسرچ کے سلسلے میں کیلیفورنیا کے کینسر انسٹیٹیوٹ میں کام کیا ہے۔

ڈاکٹر نجیحہ طلعت

مائیکرو بائیلوجسٹ

"گوشت ائر ٹائٹ بیگز یا سیلرز میں رکھیں، اس کا مقصد گوشت کو ہوا سے بچانا ہے کیونکہ جراثیم ہوا اور نمی میں پرورش پاتے ہیں اس لیے اس عمل سے گوشت کو جراثیم سے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ فریزر پیپر بھی گوشت کو فریزر برننگ سے بچاتا ہے۔ فریزر پیپر کی ایک جانب wax کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جلد محفوظ نہ کرنے کی صورت میں گوشت خراب ہوجاتا ہے کیونکہ زیادہ درجۂ حرارت میں جراثیم کی نشوونما شروع ہوجاتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ گوشت کو جلد محفوظ کرلیا جائے اس کے کئی ایک مؤثر طریقے ہیں مثلاً نمک لگا کر گوشت خشک کرنے کا عمل salting کہلاتا ہے جو بہت ہی پرانا طریقہ ہے بنیادی طور پر نمک، بیکٹیریا اور فنجائے کو خشک کر



ڈاکٹر نجیحہ طلعت

دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے یا تو وہ مرجاتے ہیں یا غیر متحرک ہوجاتے ہیں اس لیے نمک لگا کر گوشت محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ دھوپ میں گوشت خشک کرنے کا طریقہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ سورج میں موجود u v کی شعاعیں جراثیم کو ختم کرتی ہیں اور گوشت کو زیادہ عرصے تک استعمال کے قابل بناتی ہیں۔ دھول مٹی سے بچانے کے لیے ہلکی سی جالی سے گوشت کو ڈھانپ دیں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گوشت ابال کر فریج میں رکھ لیں تو کچھ... عرصہ تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گوشت دھو کر اور خشک کر کے فریزر میں رکھنا زیادہ بہتر عمل ہے۔ اس طرح جراثیم بھی صاف ہوجائیں گے اور جب پکانا ہو تو گوشت دھونے میں وقت بھی برباد نہیں ہوگا۔ خیال رہے کہ ایک مرتبہ گوشت فریزر میں رکھنے کے بعد بار بار نہ نکالیں کیونکہ بار بار گوشت پگھلانے کے عمل سے گوشت خراب ہوجاتا ہے۔

مناسب یہی ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق گوشت کے چھوٹے پیکٹ بنا کر رکھیں۔ ایک اور بات کا خیال رکھیں جہاں آپ نے گوشت اسٹور کیا ہے۔ وہاں پینے کا پانی یا استعمال کی کوئی ایسی چیز نہ رکھیں جسے نکالنے کی وجہ سے فریزر بار بار کھولنا پڑے اس سے گوشت زیادہ عرصے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ فریزڈ کیا ہوا گوشت خراب ہونے کی بنیادی وجہ بجلی کا وولٹیج کم اور زیادہ ہونا بھی ہے۔ اسے چیک کرنے کے لیے فریج میں تھرمامیٹر رکھ کر چیک کریں کہ فریج کا ٹیمپریچر صحیح ہے کہ نہیں 4 ڈگری سینٹی گریڈ ٹمپریچر ضرور ہونا چاہیے۔ وولٹیج کنٹرول کرنے کے لیے Stabilizer ضرور لگائیں۔

☆☆☆

قارئین! کچا گوشت محفوظ کرنے کے طریقوں سے تو آپ آگاہ ہوگئے۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زیادتی ہر شے کی بری ہوتی ہے۔ بعض لوگ محض عید کے تین دن ہی ڈٹ کر گوشت نہیں کھاتے بلکہ عشرے دو عشرے تک یہ سلسلہ اسی شدومد کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ گوشت کے مختلف النوع پکوان سے لطف اندوز ہونے والوں کے ساتھ اصل مسئلہ تو اس وقت ہوتا ہے جب مسلسل گوشت خوری کے منفی نتائج سامنے آتے ہیں تب تندرست بیمار اور بیمار مزید بیمار ہو جاتے ہیں۔ گوشت کے استعمال میں احتیاط کی جائے تو یہ نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ احتیاط کیسے کی جائے؟ جاننے کے لیے ہم نے ماہرِ غذائیت پروفیسر ڈاکٹر رومینہ اقبال سے رابطہ کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر رومینہ اقبال

اسسٹنٹ پروفیسر آغا خان یونیورسٹی

شعبہ کمیونٹی ہیلتھ سائنسز اینڈ میڈیسن

تندرست ہوں یا بیمار قربانی کا گوشت ضرور کھائیں لیکن اعتدال سے، دن بھر میں دو بوٹیوں سے زیادہ گوشت کھانے سے گریز کریں۔ سبزیوں میں گوشت پکانے سے معتدل رہے گا۔ روزانہ



پروفیسر ڈاکٹر رومینہ اقبال

گوشت کے استعمال سے بچیں، سبزیوں اور دالوں کا استعمال بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پھل بھی بے حد مفید ہیں۔ ہر ممکن کوشش کریں کہ حد سے زیادہ چکنائی سے بچیں کیونکہ قربانی کے گوشت میں اچھی خاصی چکنائی ہوتی ہے۔ اس لیے خوراک بہت زیادہ مرغن نہیں ہونی چاہیے۔ کھانا پکانے میں بہت تیز مسالوں اور نمک کے استعمال میں خاص احتیاط

کریں۔ بالخصوص دل کے امراض اور ذیابیطس میں مبتلا افراد کو گوشت کم کھانا چاہیے، ایسا گوشت کھائیں جس میں چربی بالکل نہ ہو۔ اچھے قسم کے تیل میں گوشت پکا ہوا ہو اور اگر ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے تو نمک کا استعمال کم کریں، معدے اور السر کے مریض گوشت کو اچھی طرح پکا کر کھائیں۔

☆☆☆

قربانی کے جانوروں کے گوشت کی غذائی افادیت۔

قربانی کے تمام جانوروں کے گوشت کی خصوصیات یکساں نہیں ہیں بلکہ ہر جانور کے گوشت کی الگ پہچان اور صفات ہیں۔ گوشت کی پہچان گوشت کے رنگ اور چربی کی رنگت سے بہ آسانی کی جاسکتی ہے مثلاً

جانور	گوشت کا رنگ	چربی کا رنگ
گائے، بیل	سرخ	زرد اور خشک
بکری	ہلکا سرخ	سفید
بھیڑ، دنبہ	ہلکا سرخ	(سفید، دنبے کے گوشت کے اندر بھی چربی کے ریشے نکلتے ہیں)
اونٹ	سرخ	ہلکا زرد

گوشت کے خواص

بھیڑ اور بکرے کا گوشت تقریباً یکساں خواص کا حامل ہے۔ گائے کے گوشت میں اونٹ کے گوشت سے کم گرمی و خشکی ہوتی ہے مگر بکری کے گوشت سے زیادہ ہوتی ہے۔ زرد یا ہلکے براؤن رنگ کی گائے کا گوشت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اونٹ کا گوشت ایک عمدہ قسم کی متوازن خوراک ہے۔

جالینوس کے مطابق بہترین گوشت جوان اور دُبلے جانور کا ہے جبکہ موٹے اور چربی والے جانور کا گوشت دیر میں ہضم ہوتا ہے، غذائیت میں کمتر ہوتا ہے جانور کے جسم کا دایاں حصہ بائیں سے زیادہ مفید ہے۔

غذائی و طبی افادیت

کلیجی غذائیت سے بھرپور غذا ہے کیونکہ یہ اعلیٰ درجے کی پروٹین ہے اس لیے جنہیں پروٹین کی شدید ضرورت ہے ان کے لیے کلیجی بے حد عمدہ اور مفید غذا ہے اس میں موجود غذائی اجزا شدید محنت اور تناؤ میں بھی تندرست رکھتے ہیں خون کی کمی کے امراض میں کلیجی اور گوشت دونوں بہت مفید ہیں۔ معظم جاوید کے مطابق بچھڑے کا گوشت گائے کے گوشت کی بہ نسبت لذت وغذائیت میں زیادہ بہتر ہوتا ہے یہ اکثر اوقات بکرے کے گوشت کا ذائقے اور تاثیر میں مقابلہ کرتا ہے۔ کمزور اور لاغر افراد کے لیے گوشت مفید اور گوشت کا شوربہ اکسیر ہے، سری بہت غذائیت بخش ہے، تخلیق کے مراحل طے کرنے والی خواتین کے لیے گوشت بے حد ضروری ہے کہ یہ جسم کو پروٹین مہیا کرتا ہے لیکن مذکورہ خواتین کو چکنائی والے گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس کا استعمال فشار خون کے عدم توازن کا باعث بنتا ہے۔ ہاں گوشت کی یخنی اور بوٹیاں ان خواتین کے لیے غذائیت بخش ہیں۔ غذائی اعتبار سے بکرے کا گوشت دیگر تمام جانوروں کے گوشت کا سردار کہلاتا ہے۔ یہ طبعی افسردگی دور کرتا ہے۔ اعصاب کو قوت بخشتا ہے، قوتِ ارادی مضبوط بناتا ہے، انسانی جسم کے لیے بکری کا گوشت سب سے زیادہ مفید ہے۔ حکیم درس محمد اکبر کے مطابق بکری کے جتنے بھی اعضا ہیں وہ انسانی اعضا کے لیے مفید قرار دیے گئے ہیں مثلاً طبی اعتبار سے دماغ کی کمزوری کے لیے بکری کے مغز کا استعمال اور جگر کی کمزوری کے لیے کچی پکی کلیجی مفید ہے۔

ڈاکٹر خالد غزنوی کے مطابق پشت کے گوشت میں اہم فوقیت اس کی ہڈیوں کا گودا ہے، گوشت کاٹنے کے دوران جب ریڑھ کی ہڈی کے مہرے

کٹتے ہیں تو ان کے اندر کی جالی دار ہڈی جس میں اسفنج کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے ہیں ظاہر ہوجاتی ہے۔ ہڈیوں کے ایسے مقامات پر خون کے سرخ دانے تیار ہوتے ہیں اور ان کی تیاری میں کام آنے والے اجزا از قسم فولاد وغیرہ یہاں جمع ہوتے ہیں جب یہ گوشت پکایا جاتا ہے تو ابلنے کی بدولت متعدد کارآمد اجزا شوربے میں آجاتے ہیں اس طرح پشت کا گوشت لحمیات مہیا کرنے کے ساتھ خون کی کمی کا علاج بن جاتا ہے۔

خشکی سے پیدا ہونے والے تمام امراض میں ہڈی کا گودا مفید ہے۔ سینہ، حلق کے خشک امراض اور کھانسی میں کلہ فائدہ مند ہے۔ اگر گوشت چھوٹی بکری کا ہو تو کیا بات ہے! بکری کی کلیجی بھون کر کھانے سے اسہال بند ہو جاتے ہیں۔ کلیجی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اس پر نمک اور گوند ببول کا سفوف چھڑک کر بھون کر کھانے سے آنتوں کے زخم اور اسہال دور ہوتے ہیں، مرگی کے مریضوں کے لیے بکری کی کلیجی مفید ہے۔ جگر کے درد میں بھیڑ کی کلیجی فائدہ دیتی ہے، خون کی کمی کے مرض میں مبتلا افراد کے لیے کلیجی اکسیر ہے۔

بیماری سے پیدا ہونے والی کمزوری اور ضعف اور سگریٹ نوشی کے باعث کھانسی میں مبتلا ہونے والوں کے لیے بکرے کے گوشت کی یخنی مفید ہے۔ اس سے گلے اور سینے کی خشکی دور ہوتی ہے، کھانسی ختم ہوتی ہے۔ اطبا کا بھی یہی کہنا ہے کہ بکری کے گوشت میں گردن پہلو اور دستی کا گوشت لطیف، زود ہضم اور لذیذ ہوتا ہے۔ بکری کا بہترین گوشت وہ ہے جو ہڈیوں سے چپکا ہوتا ہے۔ دائیں جانب اور اگلے حصے کا گوشت عمدہ ہوتا ہے۔

نظامِ ہضم

بکری کا شوربہ تین گھنٹے میں ہضم ہوتا ہے۔

بکری کا گوشتِ بریاں سوا تین گھنٹے میں ہضم ہوتا ہے۔

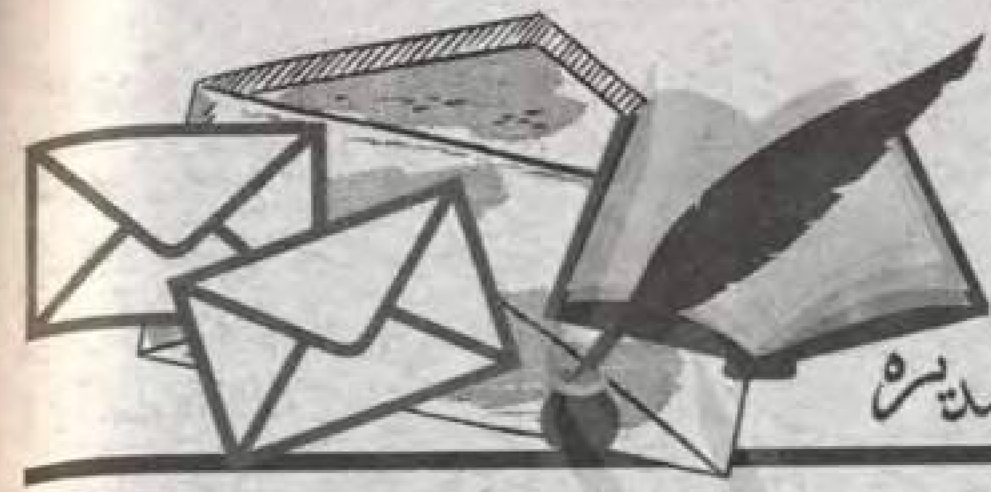
بکری اور بھیڑ کے گوشت کے کباب چار گھنٹے میں ہضم ہوتے ہیں۔ بھیڑ، بکری کا بُھنا ہوا گوشت تین گھنٹے میں ہضم ہوتا ہے۔

مُضرات و احتیاط

کثرت سے بھیڑ کا بھیجا کھانا کند ذہنی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ گردہ، شوگر، پتے کی پتھری کے مریضوں کو گوشت کم کھانا چاہیے، دل کے مریضوں کو بغیر چربی والا گوشت استعمال کرنا چاہیے، دھوپ کی حرارت میں بُھنا ہوا گوشت مضر ہے۔ جنہیں خون کی کمی کی شکایت ہو انہیں گوشت زیادہ بھون کر نہیں کھانا چاہیے۔ بخار کی حالت میں گوشت کھانے سے احتیاط کرنی چاہیے، بیمار جانور کا یا باسی گوشت نہیں کھانا چاہیے، بھیڑ کے گوشت کے سالن میں دار چینی، سیاہ زیرہ اور بڑی الائچی ڈالنے سے اس کی افادیت بڑھ جاتی ہے، کلیجی کو زیادہ تیز آنچ پر دیر تک نہیں پکانا چاہیے، کلیجی کو زود ہضم بنانے کے لیے ادرک باریک کتری ہوئی پیاز، لہسن، لیموں کا رس، سلاد یا گاجر اور تھوڑی سی ہری مرچوں کے ساتھ کھائیں، گائے کے گوشت کا بکثرت استعمال مضر ہے، گائے کے گوشت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں پکایا جائے یا اسے چاولوں کے ساتھ ملا لیا جائے تو یہ نقصان دہ نہیں رہتا، گائے کے گوشت کے مسلسل استعمال سے ہونٹ بھدے ہو جاتے ہیں، عرق النسا اور گنٹھیا میں گائے کا گوشت مضر ہے زیادہ مقدار میں گوشت کھانے سے کینسر کا خدشہ رہتا ہے۔ گائے کا ہڈی والا گوشت چقندر اور پالک کے ساتھ نہایت مفید ہے۔

نبی کریم ﷺ نے گوشت زیادہ مقدار میں اور روزانہ کھانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ بقرعید کا بھرپور لطف اٹھاتے وقت مندرجہ ذیل معلومات ضرور پیشِ نظر رکھیے گا اس طرح آپ بہت سی پریشانیوں اور بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔ بے شک اعتدال اچھی عادت ہی نہیں نعمت بھی ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ،

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ آپ سب کو عیدالضحیٰ مبارک ہو۔ ہمیں پوری امید ہے کہ آپ قربانی کا گوشت اپنے ڈیپ فریزر کے خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے مستحق لوگوں میں بھی تقسیم کریں گی اور ضرور کریں گی کہ ہمارے قارئین ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے ہیں اور یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ بقرعید کا ہی موقع ہوتا ہے جب غریب لوگوں کو بھی گوشت کھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس لیے ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے قرب و جوار میں کوئی ایسا خاندان رہ جائے جسے گوشت کی ایک بوٹی تک نہ پہنچے اور ہمارے ہاں رانیں روسٹ ہو رہی ہوں...... کیا خیال ہے؟

آج مجھے بظاہر ایک غیر اہم یا بچکانہ موضوع پر کچھ کہنا ہے جو کل کو گمبھیر بھی ہو سکتا ہے اور اس کی جانب مجھے چند قارئین بہنوں نے ہی متوجہ کیا ہے کہ آج کل جو نام نہاد محبت وبا کی صورت میں نوجوان نسل میں پھیلی ہوئی ہے کہ لڑکے، لڑکیوں کا ایک ساتھ گھومنا پھرنا اور ایک دوسرے کو پسند کرنا کوئی بری بات نہیں سمجھی جا رہی اب اسی کے اثرات چھوٹے بچوں پر بھی آچکے ہیں۔ مجھے کئی معلمات نے یہ بتایا کہ اب دس، دس سال کے معصوم لڑکے لڑکیاں اپنا مستقبل کا پارٹنر بنا رہے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح باتیں کرتے دکھائی دے رہے ہیں کہ جیسے مستقبل کی زندگی انہیں ان کے ساتھ ہی بتانی ہو۔ پیاری بہنو! آپ اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر...... ٹیوشن سینٹر بھیج کر بری الذمہ مت ہو جایا کریں بلکہ ان کا خیال رکھیں اور کوشش کریں اپنے گھر کا ماحول ایسا رکھیں کہ بچے، بچے ہی رہیں کیونکہ وقت سے پہلے کھلنے والے پھول جلد مرجھا جایا کرتے ہیں۔

اور اب آئیے سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درودِ ابراہیمیؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا کریں۔ (ابھی پڑھیں آیت کریمہ) لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مشہور و معروف اور مقبول ناول و افسانہ نگار رضیہ بٹ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ رضیہ بٹ کا نام نہ صرف پاکستان، ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے...... جانا پہچانا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے اپنے چاہنے والوں کو مسحور کیا۔ ان کے ناولوں پر متعدد فلمیں بھی بنائی گئیں جنہوں نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے۔ ادارۂ پاکیزہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ رضیہ بٹ جیسی معروف اور کہنہ مشق مصنفہ نے پاکیزہ کے لیے ایک طویل عرصے تک لکھا اور اپنے قارئین کے دلوں پر راج کیا۔ وہ کافی عرصے سے بیمار تھیں اور لکھنا چھوڑ رکھا تھا مگر ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان کے ناول روزِ اول کی طرح آج بھی مقبول ہیں اور رہیں گے۔ ان کی رحلت کی خبر ٹی وی پر نشر ہونے کے بعد خواتین کے روتے ہوئے فون ہمارے پاس بھی آئے جو اُن کے چلے جانے سے غم زدہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ رضیہ بٹ کو غریقِ رحمت کرے اور ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ ان کے چاہنے والوں کو بھی صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

☆ مرحوم سید محمد حسین شہریار اور مرحوم شیخ مبارک علی ایاز کی شاعری کے تناظر میں فارسی اور سندھی جدید شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا۔ عصرِ حاضر کے ان نمائندہ شعرا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے خانۂ فرہنگ ایران اور اکادمی ادبیات پاکستان کے باہمی تعاون سے ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں ممتاز ادیب، دانشور اور شعرا کرام نے شرکت

کی۔ ہم جناب آغا نور محمد پٹھان ریذیڈنٹ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان (سندھ) کو اس طرح کی تقاریب منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

☆ انڈیا میں اردو کے معروف و مقبول ادیب اور افسانہ نگار جناب رضا جعفری کے افسانوں کا مجموعہ راستے کھول دو پاکستان میں شائع ہوا ہے۔ جس میں شائع ہر افسانہ دل پر دستک سی دیتا ہے۔ رضا جعفری کا نہ صرف طرزِ تحریر بے حد فطری سا ہے بلکہ موضوعات بھی حقیقی ہیں۔ منظر نگاری میں تو انہیں کمال حاصل ہے۔ اس خوب صورت کتاب کی قیمت صرف 300 روپے ہے۔ جسے الحمد پبلی کیشنز کراچی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فون نمبر 021-35342516

☆ اپنی باجی انجم انصار کی نئی کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ وظائف اور ٹوٹکے حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-36981952

☆ تیسری جنگ عظیم اور دجال جدید تحقیق و اضافہ شدہ ایڈیشن ہے جسے مولانا عاصم عمر نے لکھا ہے اور جس کو پڑھ کر ایمانی احساسات میں ایک حرارت سی ہوتی ہے۔ کتاب کی رعایتی قیمت صرف 115 روپے ہے۔ جس کے ناشر الحجرہ پبلی کیشن کراچی ہیں۔ رابطے کے لیے 0312-2117879۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار سمیرا مجاہد، صادق آباد کے پیارا سا بیٹا ہوا ہے جس کا نام محمد عبیر رکھا گیا ہے۔ سمیرا مجاہد ماہ دسمبر میں کراچی آئیں گی۔ (خوش آمدید)

☆ ہم اپنی بے حد سینئر اور بے حد پیاری مصنفات...... ساجدہ حبیب، شوکت رانا الطاف، صبیحہ شاہ اور غزالہ رشید کے ایک بہت طویل عرصے کے بعد پاکیزہ سے رابطہ کرنے پر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ ناہید بنتِ نور، واہ سیمنٹ ورکس کی بھتیجی وردہ کی گزشتہ دنوں منگنی ہوگئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ اقبال بانو کا ڈراما سوپ مر جائیں بھی تو کیا ایک نجی چینل پر ہر پیر سے جمعرات تک شام ساڑھے سات بجے دکھایا جا رہا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں اپنے اسکول سے متعلقہ ایک ورکشاپ میں مصروف ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار رخسانہ امجد، پنجاب کی ان دنوں صحت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری بہت پیاری مصنفہ عتیقہ محمد بیگ، سیالکوٹ کا لکھا ہوا ٹی وی ڈراما ایک ٹی وی چینل سے جلد دکھایا جانے والا ہے۔ (مبارک باد)

☆ رفعت مبین رفی، کراچی پاکیزہ کی معروف تبصرہ اور مراسلہ نگار ان دنوں اپنے بیٹے کے پاس امریکا گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ نے اپنے گھر میں روٹی پکا کر رکھی تو کچھ دیر بعد روٹی پر پھولوں سے اسم محمدؐ یوں لکھا نظر آیا جیسے اس پر کسی نے چھاپ دیا ہو۔ پورے گاؤں والوں نے اس روٹی کا دیدار کیا۔ (سبحان اللہ)

☆ معروف شاعرہ پروین عذرا تشنہ کا مجموعۂ کلام کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ طائرِ خیال میں پروین کی نظمیں اور غزلیں دل پر دستک سی دیتی ہیں۔ اس کتاب کو منگوانے کے لیے اس ایڈریس پر رابطہ کریں۔ قیمت بے حد کم ہے۔ ایس اے بک کارنر گراؤنڈ فلور۔ مکی بلڈنگ، فیئر کورٹ روڈ بالمقابل ویمن کالج کراچی، فون نمبر 021-3272496۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار شیریں سلیم، لاہور کے نواسے عنیب عادل کے گھر آٹھ سال بعد بہن آئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ مولانا عبدالستار عاصم، لاہور ایک مطالعاتی دورے پر کئی ممالک جائیں گے۔ (ماشاءاللہ)

☆ معروف شاعرہ اور مصنفہ شگفتہ شفیق، کینیڈا سے واپس کراچی آگئی ہیں۔ ہمارے لیے یہ بڑی پُرمسرت بات ہے کہ ٹورنٹو میں ہماری شاعرہ شگفتہ شفیق کی بے حد پذیرائی ہوئی اور ان کے اعزاز میں بہت سی تقاریب بھی ہوئیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار روحی صبا، لانڈھی کراچی کی پیاری بیٹی فائزہ فیروز کی شادی گزشتہ دنوں سید صلاح الدین سے ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی اور ہماری مایہ ناز مصنفہ زاہدہ پروین گزشتہ دنوں میر پور خاص سے اپنے شوہر محمد حلیم کے ہمراہ کراچی تشریف لائیں تو معراج رسول صاحب اور محترمہ عذرا رسول کی خیروعافیت دریافت کرنے پاکیزہ کے دفتر خاص طور پر حاضر ہوئیں اور ادارے سے اپنی دلی وابستگی کا اظہار کیا۔ محمد حلیم صاحب کا گزشتہ برس بائی پاس آپریشن ہوا تھا جس کے میڈیکل چیک اپ کے لیے وہ ہر دو ماہ بعد آتی ہیں۔ زاہدہ پروین کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی بیٹی کی ماہِ دسمبر میں شادی ہے (مبارک ہو) قارئین پاکیزہ سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں زاہدہ پروین اور ان کے اہلِ خانہ کو بھی شامل رکھیں۔

☆ عالمی یومِ حجاب کے موقع پر پاکیزہ کی قاری بہن افشاں ناصر، کراچی نے حجاب کا اسٹال لگایا اور جسے خواتین کی ایک بڑی تعداد نے پسند کیا اور اپنے لیے حجاب خریدے۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار فائزہ شہزاد، پشاور کا بیٹا محمد عمر بن شہزاد نے ایف ایس سی فرسٹ ائیر میں پری میڈیکل گروپ میں اے گریڈ کے ساتھ اپنے کالج میں دوسری پوزیشن لی ہے اور دوسری نیوز یہ ہے کہ اس ماہ ان کے چھوٹے بیٹے محمد عمیر کی سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کے قاری محمد حبیب، کراچی کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

* * *

انتقالِ پُرملال

☆ معروف ناول نگار رضیہ بٹ چل بسیں۔

☆ معروف مصنفہ حاجرہ مسرور انتقال کر گئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔

* * *

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی سے۔ ”پاکیزہ ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور معلوماتی باتوں سے سجا ہوا ہوتا ہے۔ میں زیادہ پڑھ نہیں پاتی ہوں پھر بھی اداریہ، بہنوں کی محفل اور جلترنگ ضرور پڑھتی ہوں۔ افسانہ نگار بہنیں اچھا لکھتی ہیں اگر افسانہ مختصر ہو تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آج میں زکوٰۃ کے حوالے سے ضروری گفتگو کرنا چاہ رہی ہوں۔ یوں تو زکوٰۃ کا موضوع بہت وسیع ہے مگر اس وقت میں صرف سونے پر زکوٰۃ کے حوالے سے بات کروں گی۔ وجہ یہ ہے کہ خواتین کے پاس کچھ ہو نہ ہو زیور ضرور ہوتا ہے۔ وہ خواتین جن کی عمریں پچاس سال یا زیادہ ہیں ان کے پاس کافی سونا ہوتا ہے کیونکہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تب سونا سستا تھا اور زیورات بھاری بنائے جاتے تھے۔ بات زکوٰۃ کی ہو رہی ہے آپ کے پاس جس قدر مالیت کا سونا ہے اس کی قیمت جو اس وقت ہے اس کا چالیسواں حصہ سال گزر جانے کے بعد دینا ہے۔ اگر سونے کے علاوہ کسی خاتون کے پاس رقم نہیں ہے تو اسے اسی سونے کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا ہوگا۔ اکثر خواتین کے ذہنوں میں یہ غلط خیال جاں گزیں ہوتا ہے کہ سونے میں سے زکوٰۃ نکالیں گے تو سونا ختم ہو جائے گا۔ آپ حیران ہوں گی کہ جتنا بھی سونا آپ کے پاس ہے اس کا چالیسواں حصہ آپ ہر سال خیرات کرتی رہیں تو بھی سونا کبھی ختم نہیں ہوگا بلکہ خاتون کی عمر ختم ہو جائے گی۔ میں ایک چھوٹی سی مثال دے رہی ہوں۔ فرض کریں آپ کے پاس بیس تولے سونا ہے ایک سال کے بعد آپ اس کا چالیسواں حصہ یعنی آدھا تولہ خیرات کریں گی دوسرے سال چونکہ سونا 19.5 تولہ رہ گیا ہے اس پر زکوٰۃ بھی کم ہوگی۔ جوں جوں سال گزریں گے زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی جائے گی۔ اس کا آسان فارمولا ہے۔

19.5=20x39/40 پہلے سال کے بعد سونے کی مقدار

19.012=19.5x39/40 دوسرے سال

18.53=19.012x39/40 تیسرے سال (بچا ہوا سونا) اس طرح آپ کیلکولیٹ کرتی جائیں۔ 43 سال کے بعد آپ کے پاس 10.09 تولہ سونا بچا ہوا ہوگا۔ اس طرح آپ ساری عمر سونا پہنیں گی زکوٰۃ بھی دیں گی اور اب بڑھاپے میں آدھا سونا جو بچا ہوا ہے اسے فروخت کر کے اسلامی بینک میں انویسٹ کر کے خرچہ نکال سکتی ہیں۔ اگر آپ نے اپنے زیور پر کبھی زکوٰۃ نہیں دی تو یاد رکھیں اس کا حساب سونے کی زکوٰۃ سونے سے ہی ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ چالیس، پینتالیس سال قبل آپ نے بیس تولہ سونا تین ہزار کا خریدا تھا اس وقت ایک سو پچاس روپے تولہ سونا تھا تو آپ

ایک تولہ پر چار روپے دے کر فارغ نہیں ہو سکتیں پھر آپ کو حساب لگا کر اوپر کے فارمولے سے جاننا ہوگا کہ کتنا سونا اب تک نکل جانا چاہیے تھا جو آج بھی آپ کے پاس موجود ہے چنانچہ اتنا سونا یا آپ کے پاس دولت ہے اس کی رقم خیرات کرنی ہوگی۔ آج کل سونا 60000 فی تولہ ہے۔ بیس تولے سونے کی قیمت 1200000 بنتی ہے۔ آپ کو ہر سال تیس ہزار زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ گھر میں زکوٰۃ کا لفافہ بنا لیں اور ہر ماہ اس میں رقم رکھتی جائیں (2500 روپے) اس طرح سال بعد تیس ہزار جمع ہو جائیں گے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جب سال گزر جائے تب ہی آپ تیس ہزار دیں۔ آپ اپنے زکوٰۃ لفافے سے پورے سال غریبوں کی مدد کر سکتی ہیں۔ شیریں حیدر نے اپنے افسانے میں سونے پر زکوٰۃ ادا کرنے کی بات کر کے خواتین کو احساس دلایا ہے کہ یہ اچھی بات ہوتی ہے۔ ان ہی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ خط تحریر کر رہی ہوں ورنہ میرے اندر لکھنے کی طاقت ہے نہ ہمت۔“ (معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے جزاک اللہ)

نگہت سیما کی رائے چکوال سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ پڑھا۔ لبنیٰ عروج کے متعلق ان کے بچوں کے تاثرات پڑھے۔ دل ابھی تک اس دکھ کے حصار سے باہر نہیں نکلا جس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ اب اپنے ناولٹ کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ جنہوں نے میرا ناولٹ پڑھا پسند کیا اور رائے دی ان کا بہت شکریہ اور جنہوں نے میسج، فیس بک پر اور ای میل کے ذریعے اپنے تاثرات بھیجے ان کا بھی بہت شکریہ۔ اکتوبر کے پاکیزہ میں ایک بہن نے میرے ایک جملے پر اعتراض کیا اور میں حیران ہوئی کہ کیا میں نے یہ جملہ لکھا تھا۔ قسط نکال کر پڑھی تو یہ جملہ موجود تھا۔ آپ نے اس طرف میری توجہ دلائی اس کے لیے میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ شاید میں نے روانی میں لکھ دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس کے لیے معاف کرے۔ میں نے زارا احسن کے کمنٹس پڑھے پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ نے لکھا کہ مجھے قومی ہیرو کا نام صحیح لکھنا چاہیے تھا تو عرض ہے کہ میں نے تو صحیح لکھا تھا کیپٹن کرنل شیر خان مجھے علم ہے کہ کیپٹن رینک ہے اور کرنل ان کے نام کا حصہ تھا لیکن شاید کمپوزر نے اسے میری کم علمی سمجھ کر کرنل کاٹ دیا۔ آپ نے لکھا کہ آپ کی عمر اس وقت چھ سات سال تھی اور آپ کو کارگل جنگ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن آپ کو کارگل کے حوالے سے میری تحریر مطمئن نہیں کر سکی تو زارا بی بی میں نے حقیقتاً کارگل اور ڈرونز حملوں کے پس منظر میں یہ کہانی لکھی تھی اور مجھ سے پہلے بہت لوگوں نے کارگل کی حقیقت لکھی ہے۔ مختصراً میں نے کہانی میں بتانے کی کوشش کی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ کارگل اور ڈرونز کے حوالے سے کافی کچھ چھپنے سے رہ گیا ہے تو جب یہ ناولٹ کتابی شکل میں آئے گا آپ پڑھ لینا۔ انشاءاللہ آپ کو آپ کے تمام سوالوں کے جواب بھی مل جائیں گے۔“ (نگہت آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ سے جو غلطی انجانے میں ہوئی وہ ہم سے بھی ہوئی مگر ہماری ایک قاری بہن نے ہماری توجہ دلائی جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلب گار بھی ہیں اور وہ جانے انجانے میں کی گئی ہماری ہر غلطی کو معاف فرمائے، آمین)

تسنیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”لبنیٰ عروج کی وفات نے دہلا کر رکھ دیا۔ اس کی بیماری کا پتا ہی نہیں چلا۔ خدا اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی فیملی کو یہ عظیم دکھ سہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ پاکیزہ پر تبصرہ حاضر ہے جلترنگ سب سے پہلے پڑھا۔ جلتی ہے نا اور میں نہ ہاروں گی بہت پسند آئے۔ شیریں حیدر کا افسانہ عید کہتے ہیں جسے زبردست تھا۔ اس میں اتنی انفارمیشن تھی کہ کسی نے اس کے مطابق چلنے کی کوشش کی تو شیریں حیدر کو بہت ثواب ملے گا اور اس دور میں ہمیں ایسے ہی مذہبی افسانوں کی ضرورت ہے عظمیٰ افتخار کا میری عید تم سے ہے بھی اچھا تھا۔ سرپرائز مختصر افسانہ تھا لیکن بھرپور تھا۔ زندگی کی یہ قسط بھی اچھی تھی۔ حجاب کی امی کا رول تھوڑا سا ان نیچرل لگا کہ مائیں ایسی کب ہوتی ہیں۔ خود آگہی بہترین افسانہ تھا آخر دم تک اینڈ کا پتا نہیں چلا۔ عکس میں شہر بانو اور شیر دل کی گفتگو نے مزہ دیا یہ بات اچھی لگی کہ شیر دل نے عکس کا دفاع کیا اور بیوی کے سامنے وہ عکس کے سلسلے میں نہیں جھکے۔ کیا کہنے عمیرہ احمد کے۔“ (نوازش)

سدرۃ المنتہیٰ، ٹنڈو محمد خان سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ پڑھا اور دل بہت دکھی سا ہو گیا۔ میری دلی دعا ہے کہ ہماری مصنفات کی خوب لمبی عمریں ہوں، آمین اور سب مصنفات کم از کم ننانوے برس تک تو خوب لکھیں اس کے بعد وہ اپنے مشاغل میں مشغول ہو جائیں۔ کوئی لندن امریکا کی سیر کو نکل جائے، کوئی شاپنگ میں لگ جائے، کوئی ٹی وی میں کام

کرنے کا شوق پورے کرے، کوئی کوکنگ میں ایکسپرٹ ہونے کی کوشش کرے۔ میں تو ننانوے سال تو لکھوں گی اس کے بعد اپنے مرشد کے مزار پر جا بیٹھوں گی۔ انجم باجی، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں ایسا ہی ہونا چاہیے ناں۔'' (سدرۃ المنتہیٰ میں تمہاری آواز کے ساتھ آواز ملا رہی ہوں اور میرے ساتھ تمام قارئین بھی آواز شامل کرلیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مصنفات، شاعرات، تبصرہ نگاروں اور پڑھنے والوں کو طویل عمر عطا فرمائے۔ جسمانی و ذہنی صحت کے ساتھ، آمین...... ثم آمین۔ ہاں تمہارا پیارا سا تبصرہ گدگدا سا گیا جیتی رہو اور خوشیاں بانٹتی رہو)

رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ''انجم میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر لکھنا چھوڑ دیتی ہوں تو بور ہو جاتی ہوں۔ بہت جلد میرا دوسرا ناول آنے والا ہے اور ان دنوں تیسری کتاب پر کام کر رہی ہوں مگر پاکیزہ سے غافل نہیں ہوں۔ اس کی تمام تحریریں مجھے بے حد پسند آتی ہیں۔ اس ماہ رضوانہ پرنس کا کیا گیا انٹرویو تصاویر کی کمی کے باوجود اور مختصر ہونے کے باوجود ٹاپ پر رہا۔ میں لبنیٰ عروج کو نہیں جانتی تھی نگران کے بارے میں بھرپور کوریج پڑھ کر آگاہی ہوئی۔ اس ماہ نئی مصنفات کی تحریریں زیادہ تھیں ان میں مجھے رابعہ نیازی، نورالعین ساحرہ اور شاہدہ ملک نے زیادہ متاثر کیا۔ میری اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بقیہ افسانے اچھے نہیں تھے۔ وہ بھی بہت اچھے تھے اس ماہ تین ناول پڑھنے کو ملے اور سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ پاکیزہ کے ٹائٹل پر اکثر و بیشتر دلہنوں کی تصاویر ہوتی ہیں مگر اس ماہ دلہن نمبر میں دلہن کے بجائے سمپل لڑکی کی تصویر تھی۔'' (ہاں دلہن کے ابٹن سے ایک دن پہلے جو محفلِ میلاد تھی اس دن کی سمجھو دیگر تحریروں کی پسندیدگی کا شکریہ)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''اداریے میں ساس اور بہو دونوں کو بہت اچھی باتیں بتائی ہیں۔ لبنیٰ عروج کے بارے میں تاثرات پڑھ کر دل دکھ سے بھر آیا۔ اللہ ان سب کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ رضوانہ پرنس نے انٹرویو بہت شاندار کیا مگر آمنہ بھی شامل ہوتی تو بہت اچھا لگتا ہے۔ شائستہ زریں کا سروے بہت معلوماتی رہا مگر ڈاکٹر فریدہ احمد کے جواب سب سے اچھے رہے۔ بہنوں کی محفل میں فرزانہ سلیم کی رحلت اور ثروت کی بیٹی کے انتقال کا پڑھ کر از حد افسوس ہوا مگر دلہن نمبر کے حوالے سے تم نے جو لڑکیوں کو نصیحت کی ہے وہ بہت عمدہ ہے۔ خاص طور پر دو آنکھیں، دو کان مگر زبان ایک ہے۔ واقعی زبان ہی تخت پر بٹھاتی ہے اور زبان ہی گرا دیتی ہے۔ عقیلہ حق تمہاری محبت کا شکریہ۔ جلترنگ میں نکلے تیری تلاش میں پڑھ کر ہنسی آئی۔ جلترنگ پڑھ کر اپنی پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔ جلترنگ واقعی ہمارے لیے ٹانک کا کام دیتا ہے۔ نگہت سیما کا ناول بہت پسند آیا مجھے ایسے ناول پسند ہیں جو چار یا پانچ قسطوں میں ختم ہو جائیں۔ قیصرہ حیات کے ناول کی پہلی قسط اچھی لگی جب کہ غزالہ عزیز کا مکمل ناول پڑھ کر دل دکھی سا ہو گیا۔ نورالعین ساحرہ نے اچھا لکھا مختصر اور با اثر۔ عقیلہ حق کا آئیڈیل تو بہت بری طرح ٹوٹا۔ اختتام نے چونکا دیا۔ بقیہ افسانے بھی ٹھیک تھے۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ اے دن رہا۔ اب دوبارہ کب ایسی تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ پروفیسر عابدہ خان کہاں ہیں؟ دونوں ناول شاندار رہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

شہناز صدیقی، لاہور سے۔ ''فون پر مشفق سا لہجہ جیسے ہی سماعتوں سے ٹکرایا۔ دل نے دوستی کا رشتہ قائم کرنے میں لمحہ نہ لگایا۔ عمروں کے فرق کے باوجود میں نہ آپ کو خالہ جانی نہ آپی اور نہ پھپھو کہوں گی۔ آپ میرے لیے بس انجم جی ہیں۔ پتا نہیں کیوں مگر جب اس نام کو ہونٹوں سے ادا کرتی ہوں تو دل میں مانوسیت بھرا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ویسے آپ سے ایک بات پوچھوں۔ دوستی کے لیے ہم عمر ہونا ضروری ہے کیا؟ (نہیں) مجھے پہلے ہی پتا تھا جناب۔ اب مابدولت کا تھوڑا سا تعارف ہو جائے۔ میرا پورا نام شہناز صدیقی ہے۔ چھ بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن ہوں۔ ابو پیار سے شانی، بھائی شانی اور فرینڈز شانوں پکارتی ہیں اور آپ تو جناب کچھ بھی کہہ سکتی ہیں، اجازت ہے مگر پیار سے۔'' (گڑیا اس محفل میں خوش آمدید)

نجمہ جبیں علیزئی، ڈی آئی خان سے۔ ''اتنی محبت اور خلوص سے ایک پرانی لکھاری ساتھی کو ویلکم کرنے کا بہت شکریہ۔ انجم جی آپ کی ان اضافی خوبیوں نے تو ہمیں آپ کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت کچھ سوچنے اور اپنے گریبانوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ عکس میں چڑیا یعنی عکس کی ظلم و ناانصافی کے خلاف جدوجہد بہت سکون دے رہی ہے۔ ریئلی عمیرہ آج کی عورت اگر کمزور نہ پڑے تو کبھی معاشرے کا کوئی بے حس مرد اسے روندتا ہوا نہ گزر پائے۔ زندگی کا ہر کردار قابلِ غور ہے۔ عجیب سے رنگ پھیلے ہوئے ہیں یقیناً ناہید سلطانہ اختر ان سارے کرداروں سے بہ آسانی نمٹ لیں گی۔ افسانوں میں فریب محبت نے آنکھیں بھگو دیں اسی طرح شیریں حیدر نے عید کہتے ہیں جسے لکھ کر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مذہب کے معاملے میں ہم نے بعض اہم باتوں کو یکسر اگنور کر رکھا ہے تھینک یو شیریں حیدر۔ اس کے علاوہ خود

آگہی، کوئی شہر ایسا بساؤں میں، سرپرائز، میری عید تم سے ہے اور مجھے حکم ہے اذان جاندار تحریریں تھیں۔'' (شکریہ)

صائمہ سلیم، فیصل آباد سے۔ ''انجم باجی اس دفعہ پاکیزہ کی قیمت آپ نے بڑھائی ہے کہ اس کا تذکرہ آپ نے اپنے اداریے میں کیا اور ہمیں آپ کا یہ مان تو رکھنا ہی ہے کہ قیمت زیادہ ہونے کے باوجود اس کو لینا نہیں چھوڑیں گے۔ سکینہ فرخ کا افسانہ حاصلِ پاکیزہ تھا۔ میری جانب سے بہت مبارک باد۔ ہاں لبنیٰ عروج کو آپ نے بہت خوب صورت انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کی سطر سطر رُلا گئی اور آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ دل غم سے بوجھل ہے۔ اللہ آپ کو صحت اور زندگی عطا فرمائے، آمین۔'' (دعاؤں کے لیے ممنون ہوں)

شبنم امجد، مورو سے۔ ''لبنیٰ عروج نمبر آپ نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ نکالا ہے۔ ہر پڑھنے والی کی آنکھیں بھر آئی ہوں گی۔ میری امی بھی ان کے افسانے بہت شوق سے پڑھتی تھیں اور وہ ان کی بہت بڑی فین تھیں اور ان کا انتقال 17 مئی کو ہوا ہے۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین اور آپ کو صبر کی طاقت)

صبا نور، لیہ سے۔ ''انجم آنٹی، میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے لبنیٰ عروج نمبر بہت اچھا نکالا ہے۔ میری ڈھیر ساری دعائیں آپ کے لیے ہیں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں لبنیٰ عروج پہلے خواتین ڈائجسٹ میں بھی لکھا کرتی تھیں؟'' (جی ہاں پاکیزہ میں لکھنے سے پہلے وہ کئی موقر جریدوں میں لکھتی رہیں مگر پاکیزہ میں زندگی کی آخری سانسوں تک کہ اپنا آخری افسانہ انہوں نے پاکیزہ میں دیکھا اپنی صحت یابی کی دعا پڑھ کر صبیحہ شاہ سے کہا تم نے انجم کو میری اصل بیماری کے بارے میں تو نہیں بتایا ہے۔ صبیحہ نے کہا نہیں، میں نے تو بس یہ بتایا ہے کہ تم بیمار ہو اس لیے اس نے صحت یابی کے لیے دعا کے لیے لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس پیاری مصنفہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین)

سمیرا حمید فاروقی، کراچی سے۔ ''اس ماہ لبنیٰ عروج کے بارے میں مضامین پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند ماہ پہلے میری ان سے اچانک فون پر ملاقات ہو گئی تھی جس کے بارے میں، میں نے انجم باجی آپ کو بتایا بھی تھا۔ اس وقت بھی ان کی طبیعت یقیناً خراب ہی ہو گی مگر انہوں نے مجھ سے بڑی خوش مزاجی سے بات کی تھی۔ میں عمیرہ احمد کی فین ہوں مگر عکس کی کہانی پڑھتے ہوئے بعض مرتبہ مجھے کچھ کنفیوژن سا ہو جاتا ہے۔ زندگی بھی اچھا ناول جا رہا ہے۔ ایک بار پھر آپ کی محبت کو سلام کہ آپ نے لبنیٰ عروج نمبر بہت ہی اچھا نکالا۔'' (شکریہ)

فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''لبنیٰ عروج کی یاد میں ہر تحریر بے حد مؤثر تھی اور آپ نے اسے بڑے ماہرانہ انداز میں ترتیب بھی دیا تھا جس سے ان کی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔ قیصرہ حیات کے ناول کی پہلی قسط اچھی لگی۔ بس ایک بات سے اختلاف ہے انہوں نے لکھا ہے اللہ طاق اعداد میں پڑھنا چاہیے جبکہ بہت سی مستند کتابوں میں درج ہے لفظ اللہ جفت اعداد میں پڑھنا چاہیے۔ کتاب بکھرے موتی میں بھی جفت اعداد میں لکھا ہے۔ رضوانہ پرنس کی تحریریں مجھے اچھی لگتی ہیں محبت مرزا کی ان واہیات تصاویر کے بجائے فیملی فوٹوز ہونے چاہیے تھے۔ جیسے عذرا رسول کی کتنی اچھی اور کتنی شائستہ تصاویر شائع ہوئی تھیں اور ایک توجہ اور دلانا چاہوں گی کہ چوٹیوں سے بلند لوگوں والا جملہ بزرگوں کے لیے کہا جاتا ہے نہ کہ شوبز کے یا عام لوگوں کے لیے۔'' (پیاری فیروزہ، یہ تصاویر رضوانہ پرنس نے نہیں بنائی تھیں محبت مرزا نے دی تھیں... خیال رہے یہ ایکٹرز اور ماڈلز ہیں..... ان کی فیملی فوٹوز پھر کبھی لگا دیں گے۔ لفظ اللہ جفت اعداد میں پڑھنا چاہیے یا طاق اعداد میں اس بارے میں تو میں نہیں جانتی ہاں بس یہ معلوم ہے کہ ہماری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے اور کوئی محفل کوئی گفتگو ایسی نہیں ہونی چاہیے جس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے اور اللہ کا ذکر ہی سب سے بڑا ذکر ہے۔)

نور افشاں شیخ، شکار پور سے۔ ''باجی انجم جب پاکیزہ میں ہمیں آپ کا افسانہ یا ناول نظر نہیں آتا تو بہت بوریت ہوتی ہے۔ آپ وقت نکال کر ضرور دیا کریں۔ قیصرہ حیات کا ناولٹ اچھا لگا مگر ان سے کہیے گا کہ زیادہ طویل نہ ہو۔ ناولٹ چھ سات قسطوں سے زیادہ کے نہیں ہونے چاہیے۔ اس ماہ کے شمارے کو میں شاندار نمبر بھی کہوں گی۔ لبنیٰ عروج کے بارے میں مضامین اچھے لگے ہیں اور میں روئی بھی بہت ہاں آپ سے استدعا ہے کہ ضرور کچھ لکھیں۔'' (نور افشاں اس ماہ میرا افسانہ شاملِ اشاعت ہے، پسندیدگی کا شکریہ)

مہوش مشعل، پنجاب سے۔ ''میں اور میری بہن پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ انجم باجی ہمیں آپ کی

باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ کے ناول کا شدت سے انتظار کررہے ہیں پلیز پلیز جلدی سے اپنا ناول شروع کریں۔ ہاں اس ماہ میری لاڈلی اور پیاری بھانجی انعمٰث کی سالگرہ ہے۔ آپ نے اس کو اپنی طرف سے ضرور مبارک باد دینی ہے۔'' (پیاری مشعل آپ کی بھانجی کو سالگرہ کی مبارک باد اور میری جانب سے اس کے لیے بہت ساری میٹھی میٹھی دعائیں بھی۔ ہاں اس ماہ میرا افسانہ شاملِ اشاعت ہے۔ ناول بھی جلد دوں گی، ٹھیک ہے ناں۔ فی الحال آپ ہماری مایہ ناز مصنفات کے ناول پڑھیں اور اپنی رائے سے ہمیں ہر ماہ آگاہ کیجیے)

☒ ایس، ایف، پی، پنجاب سے۔ ایک طویل عرصے بعد تمہارا خط ملا ہے اور مجھے تمہاری بے حد خوب صورت سی تصویر یاد آگئی۔ تمہارے لیے دعا خود بھی کی اور آگے کہہ بھی دیا ہے۔ جس لڑکے کے بارے میں تم نے مشورہ مانگا ہے اس کے بارے میں وسوسوں کا شکار مت ہو۔ اگر اس کا رشتہ آتا ہے تو منع مت کرنا مگر میرا اپنا خیال ہے کہ وہاں سے رشتہ آنا شاید مشکل ہو مگر تمہیں ناامید ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری شادی کے لیے ہماری سب بہنیں خلوصِ دل سے دعا کریں گی اور تم دیکھنا انشاءاللہ تمہاری شادی چند ماہ کے اندر ہوجائے گی۔ ہاں فون بھی کرلینا۔

☒ رومینہ جبیں، میانوالی۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ اور آپ کی تمام کزنز پاکیزہ میں شرکت کریں۔ بہنوں کی محفل میں بھی اپنے دلچسپ تبصرے بھیجیں اور دیگر مستقل سلسلوں میں بھی۔ اپنی کزن امن بلوچ سے بھی کہیں کہ اگر وہ کہانیاں لکھنا چاہتی ہیں تو ہمیں ضرور بھیجیں۔ آپ سب بہنیں اور سہیلیاں اپنی تمام تر تحریریں اس ایڈریس پر بھیج سکتی ہیں۔ آپ نوٹ کرلیجیے۔ مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ ڈائجسٹ۔ C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500۔

✍ فریدہ بیگم، کراچی سے۔ ''پاکیزہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس کی ہر تحریر پڑھ کر میں بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ باجی آپ سے ایک بات کہنی تھی مجھے ڈرامے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ اگر آپ مجھے اس سلسلے میں لکھنے میں گائیڈ کرسکیں تو بہت مہربانی ہوگی۔'' (اس محفل میں خوش آمدید۔ گڑیا بے شک آپ مجھے ایک عمر رسیدہ خاتون تو ضرور کہہ سکتی ہیں مگر ڈراما لکھنے میں، میں طفلِ مکتب ہوں۔ یوں بھی میرے صرف دو ٹی وی سوپ ان آئر گئے ہیں اور جو کچھ بھی میں نے سیکھا ہے وہ میں نے ان پروڈکشن ہاؤسز سے سیکھا ہے جنہوں نے میرے ڈرامے بنائے ہیں اور اب بھی میں سیکھ رہی ہوں۔ میری یہ پوزیشن کہاں ہے کہ میں کسی کو ڈراما لکھنا سکھاؤں گی۔ ویسے مذاق اچھا کرلیتی ہو)

☒ منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ آپ کے خطوط اور مراسلات تاخیر سے ملنے کے سبب شاملِ اشاعت نہیں ہو پاتے ہیں۔ آپ اپنی تحریریں ہمیں ایک ساتھ بھی بھیج سکتی ہیں مگر تبصرہ تو ہر ماہ ہی بھیجنا ہوگا۔ آپ نے میرے بارے میں پوچھا ہے تو عرض ہے کہ میں ہمہ وقت ہنسنے والی، قہقہے لگانے والی خاتون ہرگز نہیں ہوں بلکہ ایک سنجیدہ عورت ہوں اور یوں بھی آپ نے کسی کی نانی اور دادی کو تالیاں بجا بجا کر ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ ہاں مگر مجھے لڑکیاں اور خواتین مسکراتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔

✍ اے، ایس، خان، لاہور سے۔ ''باجی آپ سے میں سخت ناراض ہوں۔ میں نے آپ کو فون کرکے دو مرتبہ اپنے مس کیرج کا بتایا مگر آپ نے پاکیزہ میں نیوز تک نہیں لگائی۔ اب مجھے پتا لگ گیا ہے پاکیزہ میں آپ صرف اپنے جاننے والوں کی خبریں لگاتی ہیں۔'' (پیاری بیٹی، عورت ایک درخت کے مانند ہوتی ہے۔ جس کے کچھ کچے پکے پھل گر بھی جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحت مند و توانا اور زندگی والا بچہ عطا فرمائے۔ میں اس کی نیوز ضرور لگاؤں گی۔ ہاں آپ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ آپ کا پورا خط اور پورا نام میں نے اس لیے شائع نہیں کیا کہ یہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہوتا۔ ہاں آپ اور دیگر بہنیں اپنی خوشی کی خبریں مجھے الگ صفحے پر لکھ کر ارسال کیا کریں تاکہ میں انہیں بہ آسانی ترتیب دے سکوں)

✍ کشور سلطانہ، کراچی سے۔ ''باجی آپ رضوانہ سے کہیں ہمیں ان کے انٹرویو بہت پسند آتے ہیں۔ وہ پاکیزہ کے لیے لازمی انٹرویو کیا کریں۔ محبّ مرزا کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ بہت شاندار پرسنالٹی ہے۔ ان کی بیوی تو ان کے آگے کچھ بھی نہیں۔'' (ارے بیوی بے چاری کی اہمیت ہوتی کہاں ہے۔ چاہے وہ کچھ بھی کرلے)

☒ شبینہ زہرہ، کراچی سے۔ خوش آمدید گڑیا۔ تم نے پھیکی سی پنسل سے طویل خط بھیجا۔ جو مجھ سے پڑھا ہی نہیں

گیا پلیز اپنا خط اور تحریریں قلم سے لکھ کر بھیجو۔ جو چند جملے پڑھ سکی ہوں تو عرض ہے ہمارے ہاں ہر کہانی کا اعزازیہ ادا کیا جاتا ہے۔ جسے ہم شائع کرتے ہیں براہِ راست خط لکھنے کا میرے پاس بالکل وقت نہیں ہوتا ہے۔ ہاں آپ فون پر بات کرسکتی ہیں۔

☒ ڈاکٹر کومل ستار، لیاقت پور سے۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول خصوصی طور پر پسند کرنے کا شکریہ۔ ہاں میں رضوانہ پرنس کو بھی بتادوں گی کہ محبّ مرزا کا انٹرویو آپ کو بہت اچھا لگا۔

☒ ثریا ریاض، کراچی سے۔ خوش آمدید۔ مجھے آپ کی اس بات سے اختلاف ہے کہ ہمارے ہاں پُرمزاح افسانے لکھنے والی رائٹرز ہیں ہی نہیں۔ گڑیا آپ بغور مطالعہ کریں تو آپ کو پتا چلے گا ہماری صائمہ اکرم بہت اچھے بلکہ بے حد پُرمزاح افسانے لکھا کرتی ہیں۔ رُخ چوہدری کو تو شگفتہ افسانے لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ ہماری نٹ کھٹ سی فرحانہ ناز ملک بھی مزاحیہ افسانے بہت اچھے لکھتی ہیں جو مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ رضوانہ پرنس جیسی ہستی مسکراتی رہتی ہیں ویسے ہی افسانے لکھنا بھی جانتی ہیں۔ عروسہ عالم، زہرہ جنید، شیریں حیدر، عقیقہ محمد بیگ اور قیصرہ حیات نے بھی بہت سے دلچسپ افسانے لکھے ہیں بلکہ قیصرہ حیات سے تو میں نے کئی افسانے فرمائش کرکے لکھوائے تھے۔ مرحومہ لبنیٰ عروج نے بھی دلچسپ افسانے لکھے ہیں۔ رفاقت جاوید نے گزشتہ سال بکرے سے متعلق افسانہ خاصا دلچسپ لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی رائٹرز ہیں جو پُرمزاح تحریریں لکھنے میں کمال رکھتی ہیں اور ان کے نام اس وقت میرے قلم کے ذہن میں نہیں آرہے۔

☒ منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ آپ کی پُرمحبت مبارک باد۔ ناہید سلطانہ اختر، عمیرہ احمد، قیصرہ حیات کو پہنچائی جارہی ہے۔ غزالہ عزیز کا مکمل ناول آپ کو بہت پیارا لگا ہے یہ بات میں ان کو بتارہی ہوں۔ رضوانہ پرنس، شائستہ زریں کے انٹرویو اور سروے پسند کرنے کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔

☒ شبانہ پروین، کراچی سے۔ خوش آمدید، آپ اپنا افسانہ ضرور بھیجیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس رکھیں۔ پنسل سے لکھے ہوئے مسودے قبول نہیں کیے جاتے۔ اپنا انٹرویو شائع کروانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے بلکہ اب تو تصویریں لگوانے سے بھی دل بھر چکا ہے۔ دیگر باتوں کے لیے گیارہ بجے سے چار بجے کے دوران آپ مجھے دن میں فون کرسکتی ہیں۔ میرا فون نمبر نوٹ کرلیں۔ 021-36981952۔

✍ انیقہ انا، چکوال سے۔ ''پہلا خط ہے سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں کہاں پر ختم ...... اتنے ڈھیر سارے سوالیہ نشان ہیں۔ عمیرہ احمد، عنیزہ سید، نگہت سیما، نمرہ احمد اور نبیلہ ابر راجا الغرض پورا شمارہ ہی میری پسندیدہ مصنفین کی فہرست سے مزین ہوتا ہے کس کی تعریف کروں اور کسے رہنے دوں؟ عکس میں عمیرہ احمد مخصوص طرزِ تحریر کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں ...... حال اور ماضی کا یکساں امتزاج لیے پل پل چونکاتا ہوا۔ بہرحال عمیرہ احمد کی ہر گزشتہ تحریر کی طرح یہ تحریر بھی میرے دل پر نقش ہوگئی ہے۔ ہر ماہ شدت سے شمارے کا انتظار رہتا ہے تو صرف عکس کی وجہ سے۔ میرا پہلا خط مزید پیش رفت کا باعث بھی بنے گا۔ بس اتنا بتائیں کہ اگر میں کوئی تحریر بھجواؤں تو کیا پذیرائی ملے گی۔ یقینِ واثق ہے کہ آپ کی جانب سے امید افزا جواب ملے گا۔'' (پیاری انیقہ اس محفل میں خوش آمدید۔ اپنی تحریریں ضرور بھجواؤ اور ہاں میں تمہارے نام سے پہلے ہی سے واقف ہوں۔ تم اپنے آپ کو اجنبی مت سمجھو اور نہ ہی مجھے)

✍ نجمہ بخاری، مظفر گڑھ سے۔ ''پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ یہ پوسٹ بھی ہوجائے اور آپ تک پہنچ کر شائع بھی ہوجائے۔ عمیرہ احمد چھائی ہوئی ہیں عکس نمبر ون پر جارہا ہے۔ زندگی کی کہانی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ حجاب کافی ہارڈ ثابت ہوئی لگتا ہی نہیں تھا وہ ایسا رویہ اپنائے گی۔ صائمہ اکرم کی موسمِ گل شاندار رہی۔ نگہت سیما جی نے بہت خوب صورت تحریر لکھی۔ کوئی شہر ایسا بساؤں میں بہت حساس موضوع کو بہت خوب صورتی سے احاطۂ تحریر میں لائی ہیں۔ آپی جی لکھنے کا شوق ہے شاعری بھی کرتی ہوں کیا میں اپنی کاوشیں آپ کو ارسال کرسکتی ہوں؟'' (بالکل فوراً بھیجو گڑیا)

✍ نادیہ یاسر، لاہور سے۔ ''ماہِ ستمبر کے پاکیزہ میں شیریں حیدر کی کہانی عید کہتے ہیں جسے پڑھی۔ زکوٰۃ کے

بارے میں مصنفہ نے بہت خوب صورتی کے ساتھ کہانی کے پیرائے میں شرعی تفصیلات بیان کی ہیں۔ بس ایک چیز کی وضاحت کرنا چاہوں گی کہ قرآن وحدیث کی رو سے کیونکہ میں اس کی طالب علم ہوں۔ کہانی میں مصنفہ نے کامل کی والدہ کو وراثت تقسیم کرتے دکھایا ہے۔ حدیثِ رسولؐ کی رو سے اگر صاحبِ جائداد اپنی زندگی میں اپنی جائداد تقسیم کرنا چاہے تو اسے تمام اولاد خواہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں یا دونوں میں برابر تقسیم کرنی ہوگی یعنی ہر اولاد کو برابر کا حصہ ملے گا۔ قرآن پاک میں وراثت کے جو طریقے بتائے گئے ہیں وہ صاحبِ جائداد کی وفات کے بعد لاگو ہوں گے کیونکہ وراثت ہوتی ہی وفات کے بعد ہے۔ زندگی میں وراثت نہیں ہدیہ ہوتا ہے جو تمام اولاد میں برابر تقسیم ہوگا۔ اس سلسلے میں حدیث بیان کرتی چلوں کہ صحابی نعمان بن بشیرؓ کو ان کے والد نے اونٹ ہدیہ دیے اور حضرت محمدؐ کو اس تحفے پر گواہ بنانا چاہا تو آپؐ نے سوال کیا کہ ”کیا تم نے اپنی باقی اولاد کو بھی اونٹ دیے ہیں؟“ نعمان بن بشیرؓ کے والد نے کہا۔ ”نہیں۔“ اس پر نبیؐ نے فرمایا۔ ”میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا۔“ امید کرتی ہوں کہ تمام قارئین وراثت اور ہدیہ کے فرق کو سمجھ گئے ہوں گے۔ شرعی اصولوں پر عمل کرنے میں ہمارے لیے بہتری ہے۔“ (ہم سب کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے جزاک اللہ)

✍ نجمہ، نیویارک سے۔ ”برسوں سے آپ کے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔ جب سے پاکیزہ شائع ہوا ہے شاید ہی اس کا کوئی شمارہ مس ہوا ہو۔ کئی دفعہ دل چاہا کہ آپ کو خط لکھوں پھر سوچا کہ میرا خط شاید آپ کے شایانِ شان نہ ہو۔ آپ کا پاکیزہ اور آپ خود مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ خصوصی طور پر بہنوں کی محفل اور جلترنگ اور مجھے کچھ کہنا ہے۔ پاکیزہ نہ صرف ہم بہنوں کو تفریح مہیا کرتا ہے بلکہ ہماری دینی اور دنیاوی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی کے ساتھ اپنی فیملی کی خوشیاں دکھائے، آمین۔ اپریل کے شمارے میں عظمیٰ آفاق سعید کی تحریر شادی میرے شہزادے کی پڑھی پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی دور ہوتے ہوئے بھی ہم اس شادی میں شریک ہوئے اور دل سے ڈھیروں دعائیں اس پیارے کپل کے لیے نکلیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیروں خوشیاں عطا کرے اور نظرِ بد سے بچائے، آمین۔ سرورق پر ثمینہ کی تصویر دیکھ کر بہت پسند آئی ماشاءاللہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی لیکن اس دن سے ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے جو میں آپ سے شیئر کرنا چاہتی ہوں اور یہی بات آپ کو خط لکھنے کا باعث بنی ہے۔ پیاری بہن انجم میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں آپ پلیز میری بات کا برا نہیں مانیے گا میں آپ سے معافی کی بھی طلب گار ہوں کہ آپ سے یہ بات کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ میرے ذہن میں یہ بات آرہی ہے کہ ہمارا پاکیزہ اللہ کے فضل سے پوری دنیا میں جاتا ہے اور پاکستان کے تقریباً ہر علاقے میں جاتا ہے تو بک اسٹال پر ڈائجسٹ لگے ہوتے ہیں اور راہ چلتے کتنے لوگوں کی نگاہیں اس پر پڑتی ہوں گی اب ہر نظر پاکیزہ نہیں ہوتی کچھ نظریں گندی اور ناپسندیدہ بھی ہوتی ہے پتا نہیں کون کس رخ اور زاویے اور سوچ سے ہماری بہو بیٹیوں کو دیکھے۔ (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) تو کیوں نہ ہم سرورق پر کوئی نیچرل پکچر ڈالیں مثلاً کوئی آبشار، کوئی پہاڑ، پھول اللہ کے بنائے ہوئے بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو دیکھ کر روحانی مسرت محسوس ہوتی ہے اور جو نگاہوں کو بھی بھلے لگتے ہیں۔“ (پیاری بہن اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی رائے سے ذاتی طور پر میں سو فی صد متفق ہوں۔ اپنی بہو کی تصویر بھی میں نے بہنوں کے اصرار اور فرمائش پر دی تھی۔ ہوسکتا ہے مستقل قریب میں آپ خوب صورت مناظر بھی دیکھیں فی الوقت تو سر پر دوپٹا لیے ہماری ماڈل کو دیکھے اور اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیے)

✍ سامعہ تبسم، ملتان سے۔ ”پیاری آپی، بہنوں کی محفل میں آپ ہر بہن کے دکھ درد میں ایسے شریک ہوتی ہیں کہ ہم تو آپ کے گرویدہ ہوگئے ہیں۔ اپنا ہر دکھ سکھ آپ کے ساتھ شیئر کرتے ہیں اور کافی تسلی ہوتی ہے۔ اس کے ہر ہر سلسلے سے آپ کے خلوص کی خوشبو آتی ہے۔ اس ماہ کا سرورق بہت اچھا تھا۔ تمام سلسلے اے ون اور سپر ہیں جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میری طرف سے پاکیزہ کی تمام بہنوں کو بہت بہت سلام۔“ (آپ کی رائے پہنچاتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوا کرتی۔ میری پاکیزہ بہنیں مجھ سے واقعی ایسی ہی محبت کرتی ہیں جیسے کوئی اپنی سگی بہن سے کرتی ہوں۔ ایسے لوگوں کو میں کسی صورت غیر نہیں کہہ سکتی جو صبح شام مجھ پر اور میرے بچوں پر منزل پڑھ کر دم تک کیا کرتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ محبت کرنے والوں کو خوشیوں کے ساتھ سلامت رکھے اور میرے دشمنوں اور حاسدوں کے دل میں

بھی میری محبت ڈال دے، آمین)

نصرت جبیں ملک، خوشاب سے۔ ”میں پاکیزہ کی وہ مریضِ محبت نہیں کہ جو اس کی خوراک ہاتھ پڑتے ہی ساری کی ساری دو دن میں ختم کر لے اور باقی مہینہ نئے شمارے کے انتظار میں گزار دے بلکہ میرا مرض ذرا مختلف ہے میں تھوڑی تھوڑی مقدار لے کر پورے مہینے تک کھینچ تان کر لے جاتی ہوں تاکہ اس سے دوری کا احساس مجھے لمحہ بھر کے لیے نہ ہو سو اب تک جتنا پڑھا ہے اس پر تبصرہ حاضرِ خدمت ہے۔ ناول عکس میں عمیرہ احمد جس خوب صورت انداز سے لکھ رہی ہیں بلاشبہ یہ انہی کا خاصہ ہے۔ عنیزہ سید کی روشن جگنو اور جل پریاں ابھی آدھا پڑھا ہے لیکن مزہ دے رہا ہے۔ نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں کے لیے شاباش۔ اس ناولٹ میں یمل کی والدہ کے خاموش اور نیم ساکت کردار کی منظر کشی وہ جس خوب صورت انداز سے کر رہی ہیں، واہ جی واہ۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ”اکتوبر کے پاکیزہ میں آپ کی بیماری کا پڑھ کر تشویش سی ہوگئی آپ کو یقیناً لبنیٰ عروج کی وفات کا گہرا صدمہ ہوا ہے۔ مجھے بھی بہت دکھ ہوا تھا ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر اور اکتوبر کے پاکیزہ میں ان کے سب متعلقین کے تاثرات پڑھ کر مزید دکھ ہوا اور دل بوجھل سا ہوگیا۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے، آمین حالانکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے اور سب ہی کو بالآخر ایک روز اپنی منزل تک پہنچنا ہوتا ہے لیکن سب ان حقیقتوں سے نظر چُرا کر دنیاداری میں مگن ہو کر بہت ساری چھوٹی بڑی برائیوں میں لگے رہتے ہیں اور وہ سب باتیں جنہیں وہ چھوٹا سمجھتے ہیں دراصل بڑی برائی کا سبب بن رہی ہوتی ہیں۔ صرف ایک مثال جھوٹ ہی کی لے لیں۔ لوگ دھڑلے سے جھوٹ بولتے ہیں یہ جانے بغیر کہ جھوٹ بولنا گناہِ کبیرہ ہے۔ مطلب پرستی سے ملتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں خیر یہ تو بات برائے بات تھی۔ ہم اور آپ پہلے اپنی ہی غلطیوں کو سدھار لیں تو بہت بہتر ہے کہ فی زمانہ اب تو یہ فیشن بھی ہوگیا ہے کہ خود کو بھول کر دوسروں پر تنقید اور انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ دنیا میں سب انسان مسافر ہیں اور سفرِ آخرت پر رواں دواں ہیں۔ ان کی اصل منزل وہی ہے جو ابدی ہے ہاں اس کے کام اور اچھے کارنامے ضرور اس دنیا میں زندہ رہتے ہیں۔ ایک مصنف تو ویسے بھی اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہتا ہے۔ اس کے قلم کا اس کے دل اور روح سے ناتا ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ جو وہ درد کی صورت محسوس کرتا ہے بالآخر صفحات پر منتقل کر دیتا ہے۔“ (بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر برائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین)

ڈاکٹر نوید عفرا، لاہور سے۔ ”بارشوں کے موسم میں اتنا خوش رنگ شمارہ دیکھ کر دل واقعی باغ باغ ہوگیا۔ غیر نصابی کتب، رسائل اور اخبارات سے رشتہ اس عمر میں استوار ہوا جب میری ہم جولیاں گڑیاؤں سے کھیلتی تھیں لیکن کسی بھی رسالے میں خط لکھنے کی جسارت آج پہلی بار کی ہے۔ (خوش آمدید) پاکیزہ سے رشتہ میڈیکل کالج میں کمزور پڑ گیا تھا لیکن عمیرہ احمد نے پورا رسالہ پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ نگہت سیما اور سکینہ فرخ کی تحریریں بے مثال تھیں۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے پر تعریف کرنے کے لیے صبر نہ کر سکی اس لیے ابھی سے خط لکھ ڈالا۔“ (نوازش)

صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ”انجم باجی لبنیٰ عروج کا ناول ماسیاں بھی پھر ضرور لگایئے گا۔ انسان چلا جاتا ہے اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ جاتا ہے۔ وقت ٹھہرتا نہیں گزر ہی جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبر و ہمت عطا کرے، آمین۔ اصفا فیصل نے اچھے موضوع پر لکھا۔ نگہت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں کا ہیپی اینڈ اچھا تھا۔ کاش ایسا کوئی سکھ والا شہر ہم بسا سکتے۔ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن و سکون ہو۔ ساری دنیا کے مسلمان سراپا احتجاج ہیں توہینِ رسالت والے واقعے پر۔ مسلمان اگر متحد ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ نور العین ساحرہ کی لو میرج کی گرہیں سبق آموز تھیں۔ غلطی کا احساس دلانا اور وہ بھی فراست سے ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو جذبات مفلوج کر دیتے ہیں لیکن یہ شطرنج کی گیم کہہ لیں بڑی پھونک پھونک کر چلنا پڑتی ہے تبھی تو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔“ (مجھے آپ کی رائے سے سو فیصد اتفاق ہے)

تمثیلہ زاہد، کراچی سے۔ ”کیسی ہیں انجم آنٹی۔ پورے دو ماہ بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میں ہمیشہ آپ کے لیے دعا گو رہتی ہوں پتا ہے کیوں...... کیونکہ آپ بہت اچھی ہیں۔ ایک حساس

دل کی مالک ہیں ایسا دل جو ہر دکھ، غم کو ویسے ہی محسوس کرتا ہے جیسے ہم کسی اپنے کے دکھ کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ جو ہمارے بہت قریب ہوتے ہیں آپ کا دل دوسروں کے لیے ویسا ہی درد محسوس کرتا ہے۔ یہ کوالٹی اب ناپید ہو چکی ہے۔ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد بے حس ہو چکے ہیں۔ انجم آنٹی ستمبر کا شمارہ میں کسی وجہ سے لے نہیں سکی اکتوبر کا شمارہ پہلی تاریخ کو میرے ہاتھ میں آیا یہ پڑھ کر دلی افسوس ہوا کہ لبنیٰ عروج صاحبہ اب ہم میں نہیں رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبر عطا کرے اور یہ عظیم دکھ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے، آمین۔ 27 ستمبر کو میرے امی ابو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حج کی سعادت حاصل کرنے روانہ ہو گئے ہیں۔ بس دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کا حج قبول فرمائے، آمین۔ عمیرہ احمد، نگہت سیما ہوں یا لبنیٰ عروج، قیصرہ حیات یا رضوانہ پرنس تمام مصنفات کی تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں غزالہ عزیز کا مکمل ناول بھی اچھا تھا۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ”سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا اور آپ نے جو کچھ کہا وہ سیدھا میرے دل میں اتر گیا۔ آپ کا تجزیہ اتنا زبردست ہے کہ میں حیران ہوگئی۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں ہر ساس اور بہو کے ہاتھ میں یہ پرچا تھما دوں تاکہ کہیں بہ ساس بہو کا جھگڑا نہ ہو۔ دین کی باتیں حسبِ معمول ہمارے دلوں کو روشن کر گئیں (جزاک اللہ) سلسلے وار ناول دونوں ٹاپوں ٹاپ جا رہے ہیں لیکن عکس کی کیا بات ہے۔ رضوانہ پرنس کا حقیقی فسانہ زبردست تھا۔ باجی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ کے ادارے کو ترقی عطا کرے۔“ (آمین)

عذرا کنول، ڈی جی خان سے۔ ”عمیرہ احمد ویری ویل ڈن۔ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی ایک منفرد انداز کے ساتھ خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ باقی تمام بہنوں کے ناول بھی بہت اچھے تھے۔ انجم باجی، سوری اس بار مکمل تبصرہ نہیں کر سکوں گی کیونکہ صدیق آباد میں بہت شدت کا سیلاب آگیا ہے۔ ہماری محبت دیکھیں پھر بھی پاکیزہ سے ناتا جوڑے رکھا یہاں تک کہ ہمارا سارا گھر گر کر تباہ ہوگیا ہے۔ رات کے دس بجے جب مسجد میں اعلان ہوا کہ سیلاب آ رہا ہے تو ہم سب اپنی جان کے علاوہ کچھ نہ بچا سکے ہمارے تمام کپڑے، زیورات، کیش سب پانی میں بہہ گیا۔ اس رات تو ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی ایسا لگتا تھا کہ آج موت سے کوئی نہیں بچا سکتا اتنے قریب موت کو دیکھ کر کلمۂ پاک کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پوری کالونی جمع ہوگئی تھی۔ آگے پانی تھا پیچھے کی طرف پانی تھا اور ہم لوگ بیچ میں جمع تھے۔ اسٹیشن کے اوپر کھڑے ہو کر رو رو کر برا حال تھا ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ بچے چلا رہے تھے کافی بچے پانی میں پھنس گئے تھے دو بچوں کو میرے ماموں نے نکالا تھا ان کے ماں باپ پہلے سے اسٹیشن پہنچے ہوئے تھے اپنی جان بچا کر ایسے بے حس ماں باپ دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بچوں کی جان بچی۔ انجم باجی، ایک وقت ایسا بھی آیا جب کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا یہاں تک کہ نوبت فاقوں تک آگئی پھر اگلے دن عوام کی طرف سے کھانا ملتا رہا۔ کئی دن تک خیمے میں رہائش پذیر رہے۔ ایک سوٹ دس دن تک پہنے رکھا۔ سب کچھ سیلاب میں بہہ گیا۔ حکومت کی طرف سے ابھی تک کوئی امداد نہیں ملی کہ دوبارہ اپنا گھر تعمیر کروا سکیں۔ ہمارا اتنا نقصان ہوا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ تنکا تنکا اکٹھا کر کے میرے بھائیوں نے مکان بنائے تھے کیونکہ میرے ابو ہمیں کچھ نہیں دیتے کیونکہ وہ کام نہیں کرتے۔ اب سب گر کر تباہ ہوگیا ہے۔ سیلاب کی وجہ سے امی کا ذہنی توازن بگڑ کر رہ گیا ہے۔ ایسے میں نہ جانے کیوں انجم باجی مجھے بار بار آپ کا خیال آ رہا تھا کیونکہ آپ ایک دردمند خاتون ہیں۔ اس مشکل گھڑی میں میری کچھ مدد کریں گی پلیز انجم باجی۔“ (پیاری بٹی اپنے خط میں تم نے اپنا موبائل نمبر تک نہیں لکھا اور ایڈریس بھی نامکمل سا ہے اگر میں کسی سے کچھ کہوں تو کیا ایڈریس دوں گی۔ تم اپنے مکمل ایڈریس کے ساتھ رابطہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین)

اُمِ ایمان، کوٹ چھٹہ سے۔ ”آج کل ہمارے ہاں سیلاب نے تباہی مچا رکھی ہے۔ پانی جو زندگی کی علامت ہے لیکن اس کی شوریدہ سری زوروں پر آئے تو کئی جانوں کو نگل لیتا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ اردگرد کے علاقوں میں لوگ بہت بدتری اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور نظر آ رہے ہیں۔ ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ ہمارا علاقہ تھوڑا بلند ہونے کے باعث ابھی تک محفوظ ہے لیکن خطرے سے باہر نہیں۔ آپ اور قاری بہنوں سے التماس ہے کہ اس قدرتی آفت کے جلد ٹلنے کی دعا کریں، آمین۔“ (اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین)

نکہت یاسمین، کراچی سے۔ ”کافی عرصے سے پاکیزہ کی قاری ہونے کے باوجود آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں دل غم سے بوجھل ہے۔ محترمہ لبنیٰ عروج کی تعزیت کس کس سے کی جائے خدا مغفرت کرے۔ پیاری باجی اگر رسالے میں ناقابلِ اشاعت تحریروں کا نام آدھے پونے صفحے پر شائع کر دیں تو ناقابلِ برداشت انتظار کی سولی پر لٹکتی نئی نویلی مصنفات کے سکون کا سامان ہوگا۔ میری ایک تحریر مئی میں شائع ہوئی جدت تراش کے نام سے کیا اس سال نئی مصنفات نمبر شائع ہوگا؟ مزید نئے لکھنے والوں کے لیے رہنمائی کرتی رہیں، مہربانی۔ دونوں ناولز بہترین انداز میں انسانی نفسیات کی گرہیں کھول رہے ہیں۔ تمام تحریریں جاندار ہوتی ہیں اپنے اردگرد انسانوں کی کہانیاں محسوس ہوتی ہیں۔ نئے لکھنے والیوں کی تحریریں اعزازیہ کے بغیر بھی شائع ہونا ایک اعزاز ہے مگر رسالے کی جانب سے اعزازیہ وصول کر کے خوشگوار حیرت ہوئی۔“ (جی ہاں نئی مصنفات نمبر ہر سال شائع کیا جاتا ہے اور ہم گاہے بہ گاہے اپنی نئی مصنفات کی تحریریں لگاتے رہتے ہیں)

مبینہ اکبر، سیالکوٹ سے۔ ”یہ سچ ہی تو ہے پاکیزہ کے پلیٹ فارم نے ہر رائٹر، تبصرہ نگار اور خاموش مدعی کو ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس محفل میں کسی کی بھی تکلیف ہو اپنی محسوس ہوتی ہے۔ یہ محفل ستاروں بھرے آسمان سی ہے جو چمکتے ہیں تو روشنی کا باعث بنتا ہے۔ لبنیٰ عروج کی جدائی ہم سب کے لیے ایک ایسا خلا ہے جسے کوئی پُر نہیں کر سکتا۔ اللہ ان کے گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ آنٹی میں نے بہت پہلے بھی سلسلوں میں شرکت کی کوشش کی تھی پر وقت نے ساتھ نہیں دیا۔“ (بہت دنوں بعد آئی ہو۔ اب غائب مت ہو جانا پاکیزہ کے تمام سلسلوں میں حصہ لو)

صائمہ اکرم چوہدری، اسلام آباد سے۔ ”ٹائٹل بہت زیادہ پُروقار اور مہذب لگا۔ اسکارف میں خواتین ویسے ہی بہت ڈیسنٹ لگتی ہیں۔ آج کل تو میری طرح سب قارئین پاکیزہ کھولتے ہی عمیرہ احمد کے عکس کی طرف بھاگتے ہیں۔ جس نے ہر کسی کو بے چین کر رکھا ہے۔ پاکیزہ ہاتھ میں آتے ہیں دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے جیسے بے چین طبیعت کے حامل لوگ تو انٹرنیٹ پر ہی قسط کو ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب پاکیزہ ہاتھ میں آتا ہے تو ایک دفعہ پھر پڑھ کر چسکا پورا کیا جاتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ، کردار اور مکالمے سب چیزیں ہی لاجواب ہیں۔ یقین کریں عمیرہ احمد اور عنیزہ سید دو ایسی رائٹرز ہیں جن سے میں بے تحاشا متاثر ہوں۔ وہ قارئین کی نبض پر ہاتھ رکھنا بہ خوبی جانتی ہیں۔ عکس کو دو بار پڑھنے کے بعد بہنوں کی محفل میں جھانکا۔ سخت شاک لگا لبنیٰ عروج کے بارے میں تو فیس بک سے پتا چل گیا تھا لیکن فرزانہ سلیم کے سنجیدہ سنجیدہ سے تبصرے مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ان کے خطوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی ڈیسنٹ لڑکی اتنی جلدی دنیا سے چلی جائے گی۔ اللہ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ایبٹ آباد سے تعلق رکھنے والی پروفیسر عابدہ خان سے مجھے اس محفل کے توسط سے کہنا ہے کہ میرا ہر پندرہ دن کے بعد ایبٹ آباد کا چکر لگتا ہے آپ سے ملنا ہو تو کہاں آ سکتی ہوں۔ ناہید سلطانہ اختر بہت عمدہ طریقے سے ناولِ زندگی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ کہانی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور ناہید آپا ہر قسط میں چونکا دیتی ہیں۔ رضوانہ پرنس ایک دفعہ پھر محبت بھری کہانی کے ساتھ حاضر ہیں۔ اس دفعہ بھی انہوں نے باکمال لکھا۔ نگہت سیما ایک ایسی لکھاری ہیں جو ہمیشہ چونکا دینے والے موضوعات پر لکھتی ہیں۔ ان کے ناولٹ کا بہت جلدی اختتام ہو گیا حالانکہ میرا خیال تھا کہ شاید طویل ناولٹ ہوگا۔ لبنیٰ عروج اور ان کے بارے میں لکھی گئی تحریریں پڑھ کر بہت دل اداس ہوا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ اتنی خوب صورت رائٹر اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ (تبصرے کا شکریہ)

☆ بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹا مکمل ہوا۔ اب آیئے میرے ساتھ ساتھ آپ بھی دعا مانگیں کہ اے پاک پروردگار دونوں جہانوں میں خیر اور آسانیاں عطا فرما۔ جن و انس کے شر سے محفوظ فرما اور تو میرے جسم کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرمانا اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ آمین ثم آمین۔ یا مُجیب یا مجیب یا مجیب۔

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

حمد کے لیے دل میں اِک عجیب ہلچل ہے
میرے ربّ جہاں تیرا کس قدر مکمل ہے
سانس و دل کی دھڑکن کا سلسلہ جو قائم ہے
رحمتوں کی بارش ہے اور یہ مسلسل ہے
اے جمالِ لاہوتی اے کمالِ رعنائی
حُسن تیری ہستی کا ہر طرف مفصّل ہے
سوچ اور خیالوں کی کوئی حد نہیں یاربّ
فکر تیری ہستی کو سوچ سوچ پاگل ہے
حمد کے لیے یاربّ جب قلم اٹھاؤں میں
یوں لگے حقائق کی میرے پاس مشعل ہے
اپنی حمد کے لیے مجھ کو چُن لیا یاربّ
اب عمل کے پلڑے میں یہ عمل ہی افضل ہے
حمد لے کے جب تیرے سامنے کھڑا ہوں گا
اب میری نگاہوں میں آنے والا وہ کل ہے

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: مسز نزہت اشفاق، کراچی

اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ ”یہ بارہ کلمات توریت، انجیل، زبور اور قرآن سے ماخوذ ہیں۔ جو صاحبِ ایمان انہیں ایک ورق پر لکھے اور اسے دیکھے، اس پر عمل کرے وہ اللہ کے مقرّب بندوں میں سے ہو جائے گا۔ اللہ فرماتا ہے اے فرزندِ آدمؑ!

(۱) روزی کا غم نہ کھا اس وقت تک جب تک میرا خزانہ بھرا ہوا ہے اور میرا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا۔

(۲) ظالم بادشاہ اور امیر کبیر سے مت ڈر جب تک میری سلطنت ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

(۳) کسی سے محبت مت کر اور کسی سے کچھ مت مانگ جب تک تو مجھے پائے اور مجھے جب تک چاہے گا پائے گا۔

(۴) میں نے سب چیزیں تیرے لیے بنائی ہیں اور تجھے اپنے لیے پس تو اپنے آپ کو دوسروں کے دروازے پر رُسوا مت کر۔

(۵) جس طرح میں تجھ سے کل کا عمل نہیں چاہتا اسی طرح تو مجھ سے کل کی روزی مت مانگ۔

(۶) جب میں سات آسمان اور سات زمینوں کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا، اسی طرح تیرے پیدا کرنے اور روزی دینے سے عاجز نہیں ہوں گا۔

(۷) جس طرح میں تیری روزی فراموش نہیں کرتا اسی طرح تو بھی میری عبادت مت چھوڑ اور میرے حکم کے خلاف مت کر۔

(۸) جس قدر میں نے تیری قسمت میں رکھ دیا اس پر راضی رہ اور نفس اور شیطان کی خواہشوں سے دل کو مت بہلا۔

(۹) میں تیرا دوست ہوں تو بھی میرا دوست بنا رہ اور میری محبت اور عشق کے غم سے خالی نہ ہو۔

(۱۰) میرے غصے سے بے باک مت ہو جب تک تو پل صراط سے گزر کر بہشت میں داخل نہ

ہو جائے۔

(۱۱) تو مجھ پر اپنے نفس کی مصلحت کے باعث غصہ ہوتا ہے اور اپنے نفس پر میری رضامندی کے لیے غصہ نہیں ہوتا۔

(۱۲) اگر تو میری تقسیم پر راضی ہو جائے تو اپنے آپ کو میرے عذاب سے چھڑالے گا اور اگر تو اس پر راضی نہ ہوا تو نفس کو تجھ پر مقرر کردوں گا تاکہ تیرا نفس جانوروں کی طرح تجھے جنگلوں میں دوڑاتا پھرے۔ مجھے قسم ہے اپنی عزت کی کہ تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا مگر اسی قدر جو میں نے تیرے لیے مقرر کیا ہے۔

مرسلہ: ذوالنورین، ہری پور ہزارہ

اقوالِ حضرت علی کرم اللہ وجھہ

☆تعجب ہے اس پر جو موت کو حق جانتا ہے پھر ہنستا ہے۔

☆تعجب ہے اس پر جو تقدیر کو پہچانتا ہے اور پھر جانے والی چیز کا غم کرتا ہے۔

☆تعجب ہے اس پر جو حساب کو حق جانتا ہے پھر مال جمع کرتا ہے۔

☆تعجب ہے اس پر جو شیطان کو دشمن جانتا ہے پھر اس کی اطاعت کرتا ہے۔

☆تعجب ہے اس پر جو جنت پر ایمان رکھتا ہے دنیا کو فانی جانتا ہے اور پھر اس کی رغبت کرتا ہے۔

☆تعجب ہے اس پر جو اللہ کو حق جانتا ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا ہے اور ان پر بھروسا کرتا ہے۔

مرسلہ: فرح طاہر قریشی، ملتان

چار عظیم باتیں

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا۔ چار چیزیں جس شخص کو مل جائیں تو اسے دنیا و آخرت کی ہر بھلائی مل گئی۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر سے معمور دل۔

(۲) اللہ کا ذکر اور چرچا کرنے والی زبان۔

(۳) مصیبتوں کو سہنے والا جسم۔

(۴) ایسی بیوی جو شوہر کے مال کی حفاظت کرتی اور عفت کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔

(از ترغیب و تربیت بحوالہ طبرانی)

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

اقوالِ زریں

☆جس شخص کو میرا ذکر سوال کرنے سے روک لے میں اس کو سوال کرنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں۔

(قرآن کریم)

☆جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

(حضرت محمد ﷺ)

☆دولت مندی ایک ایسی لمبی مستی ہے کہ اس سے بہت دیر میں ہوش آتا ہے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆فضول باتوں کا سننا خطراتِ نفسانی کا تخم ہے۔

(مہاتما بدھ)

☆کمینے شخص سے دوستی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اگر جلتا ہوا ہو تو چھونے سے ہاتھ جل جاتا ہے اور اگر ٹھنڈا ہو تو کالا کر دیتا ہے۔

(والمیکی)

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا

دل کی پانچ دوائیں ہیں۔

(۱) قرآن حکیم کو غور و فکر سے پڑھنا۔

(۲) خالی پیٹ رہنا۔

(۳) تہجد پڑھنا۔

(۴) بوقتِ سحری اللہ کے سامنے گڑگڑانا۔

(۵) نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا۔

مرسلہ: مسز نیلم کامران شاہد، گوجرانوالہ

قولِ سعدیؒ

اچھا سوچیں اور اچھا بولیں کیونکہ بدگمانی اور بدزبانی دو ایسی بدعادات ہیں جو انسان کے ہر کمال کو زوال میں بدل دیتی ہے۔

مرسلہ: فائزہ شہزاد، پشاور

موسمِ سرما کا تحفہ

اخروٹ

یوں تو تمام خشک میوے اپنے اندر بے پناہ غذائیت لیے ہوئے ہیں مگر اخروٹ کے مغز میں حیاتین کے علاوہ معدنی اجزا بھی وافر مقدار میں ہوتے ہیں۔ جس سے بدن کی ٹوٹ پھوٹ اور عام جسمانی کمزوری دور ہو جاتی ہے۔

جس طرح بادام حافظے کے لیے بہترین ہے اسی طرح اخروٹ کا بھی جواب نہیں۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ یہ دماغ کی شکل کا ہوتا ہے تو ظاہر ہے دماغ کے لیے بے حد فائدہ مند ہوگا۔

اگر کمزوری کی وجہ سے سر میں درد رہتا ہو، حافظہ کمزور ہونے لگے، باتیں بھولنے لگیں تو ایسے میں اخروٹ کو ضرور یاد رکھیں۔

چار پانچ منقیٰ کے دانے بیج نکال کر دو اخروٹوں کی گری کے ساتھ روز صبح چبا چبا کر کھائیں اور ساتھ میں دودھ کا بھی استعمال رکھیں تو جسمانی اور ذہنی کمزوری میں افاقہ ہوتا ہے۔ اعصابی کمزوری کے لیے بھی یہ نہایت مفید ہے۔

سردیوں میں پٹھوں کے درد کی شکایات بڑھ جاتی ہیں۔ اخروٹ کا تیل مالش کرنے سے درد میں آرام ملتا ہے۔ اکثر ماہر طبیب بالوں کی سیاہی قائم رکھنے کے لیے اخروٹ کے تیل کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں

پرانی چوٹ کا نشان رہ جاتا ہے تو اس پر اخروٹ کی گری پیس کر لگانے سے نشان دور ہو جاتا ہے۔ چہرے کی جھائیوں کے لیے بھی یہ لیپ مفید ہے۔

اخروٹ کا مربہ سرد مزاج لوگوں کے لیے فائدہ کرتا ہے۔ سرد ترین علاقوں میں اس کا حلوا اور مٹھائیاں کھانے کا رواج ان کے لیے فائدہ بخش ہے۔ خیال رہے کہ زیادہ اخروٹ کھانے سے پرہیز کریں اور گرم مزاج حضرات تو ایک گری پر ہی اکتفا کریں۔ طالب علم تو روزانہ ناشتے سے پہلے ایک دو گری اخروٹ ضرور کھائیں۔

مرسلہ: فضہ بتول، بہارہ کہو

اچھی بات

☆جب تم کسی کی مدد کرو تو کبھی اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھو۔ ہو سکتا ہے اس کی آنکھوں میں موجود شرمندگی تمہارے دل میں غرور پیدا کر دے۔

☆لاکھوں کو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں بڑی بات یہ ہے کہ ایسا دوست بناؤ جو تمہارا ساتھ اس وقت دے جب لاکھوں تمہارے مخالف ہوں۔

مرسلہ: انعم حنیف، حمیرا ہاشمی، بھکر

نارسائی

ایسا کیوں ہوتا ہے
کہ
محبتوں کے سفر میں
تمام عمر کسی کو چاہتے رہو
چاہتے رہو
اور وہ بھی اپنا ہی نہیں بن پاتا
نارسائی کا دکھ، نارسائی کا موسم
بس ہر سُو اترتا ہے
شکستہ وجود شکستہ تر ہو جاتا ہے

شاعرہ: ظلِ شاہین، رحیم یار خان





جلترنگ

انجم انصار

بڑا بول

کہتے ہیں کہ بڑا نوالہ کھالو مگر بڑا بول نہ بولو...... مگر چھوٹی آپا کو تو عادت تھی ایسے بڑے بڑے بول بولنے کی......!

ابا میاں کا اچھا بڑا ایک سو بیس گز کا مکان تھا...... آگے سڑک اور پیچھے سے گلی بھی گھیر رکھی تھی اس لیے وہ بھی اچھا خاصا چار سو گز کا مکان معلوم ہوتا تھا۔

بڑے سے لان میں جھولے لگا رکھے تھے...... اس لیے مہمان سردی گرمی...... باہر لان میں ہی بیٹھا کرتے تھے...... یوں ڈرائنگ روم بھی صاف رہا کرتا تھا۔

ہمارے اس گھر کی کشادگی کو سب ہی لوگ پسند کرتے تھے۔ چھوٹی آپا فلیٹ میں رہنے والوں کا اچھا خاصا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔

''پتا نہیں لوگ دڑبے میں کس طرح رہ لیتے ہیں...... نہ زمین اپنی نہ آسمان اپنا...... میں تو کبھی ایسے چھوٹے سے گھر میں نہیں رہ سکتی۔''

پھر چھوٹی آپا کی شادی ہوئی...... تو ان کے میاں کے پاس نہ مکان تھا نہ فلیٹ...... وہ اپنی آپا کے گھر میں ایک چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے تھے۔ چھوٹی آپا نے تین چار سال جس طرح اپنی نند کے ساتھ گزارے وہ وہی جانتی تھیں کہ نند سادہ رو تھیں مگر وہ اپنے گھر کے بڑے کمرے میں رہتی تھیں۔ یہ بات چھوٹی آپا کو پسند نہیں تھی...... یوں بھی چار سال میں آپا کے پانچ بچے ہو گئے تھے......
(جڑواں بچے بھی ہوئے تھے ناں)

آخر دولھا بھائی...... آفس سے لون لے کر فلیٹ خریدنے میں کامیاب ہو گئے جس کی مبارک باد سب نے ہی ان کو دی۔ تین کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ جو لگژری کے بہتان پر خریدا تھا اب بیچنے کے نام پر آٹھ آٹھ آنسو رلا رہا تھا۔

لوگ آتے تمسخر سے دیکھتے اور چلے جاتے...... فلیٹ میں آنے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ فلیٹ میں رہنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سامان، بچے اور خود ابلی پڑتی تھیں...... نند کے گھر پر بے شک ان کے پاس صرف ایک کمرا تھا...... مگر اسٹور صحن اور لان کو بھی وہ خوب استعمال کرتی تھیں...... چھت پر بنے ہوئے کمروں میں بھی اضافی سامان وہ چپکے سے رکھ دیا کرتی تھیں۔ اب اس فلیٹ میں آ کر وہ خاصی پریشان تھیں...... مہمان داری بھی ہر وقت کی لگی رہتی تھی...... میکے سے آئے ہوئے مہمانوں کو دیکھ کر وہ ہمیشہ نہال سی ہو جاتیں...... ہاں سسرال سے کوئی بھی آتا...... اسے دیکھ کر انہیں غصہ سا آنے لگتا۔

ڈرائنگ روم کے ساتھ خوب صورت گیلری میں گھر کے تمام غلیظ بستر بچھونے خوب صورتی سے تہ کر کے بڑی پیٹی پر جما دیتیں جس پر شام تک بچے اچھل کود کر کے نیچے گرا دیتے اور شام کو جب ناگہانی کسی مہمان کے آنے کا ٹائم ہوتا تو تمام سنگوائی ہوئی چیزیں تتر بتر ہو کر گھر میں پھیل جاتیں یوں تو پہننے کے لیے یکساں چپل کی جوڑی مل کر نہ دیتی مگر گھر میں ہر طرف جوتوں اور چپلوں کے ڈھیر نظر آتے...... سامان تو زیادہ نہیں تھا مگر کاٹھ کباڑ کی محبت میں اس میں تل رکھنے کی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

فلیٹ میں رہنے کی تکالیف تو وہ یہ سوچ کر برداشت کر رہی تھیں کہ کچھ گناہوں کی سزا دنیا میں بھی مل جایا کرتی ہے مگر ان کی سزا اس وقت شدید ہو جاتی جب ان کی نند اپنے ایک درجن بچوں کو لے کر ان کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے آ جاتیں۔

گھر کے سامنے کبھی ایک ساتھ دو ٹیکسیاں آ کر رکتیں تو وہ چکر کھا کر گیلری سے گرتے گرتے بچا کرتیں۔

چھوٹی آپا کو شور شرابے سے اتنی نفرت تھی کہ انہیں اپنے بچوں کی کھی کھی بھی بری لگتی تھی۔ جب نند کی چڑھائی ہوتی تو وہ عجیب حواس باختہ ہو جاتیں دل کا دورہ پڑتے پڑتے رہ جاتا۔

''ممانی...... السلام علیکم!'' کی گردان جب تواتر سے رکنے کا نام نہ لیتی تو جواب دیتے ان کے حلق میں گولے سے اٹکنے لگتے۔

نند کو دیکھتے ہی وہ ڈرائنگ روم کا صوفہ پڑوس میں رکھوا دیتیں تاکہ بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ بنے۔ برتنوں کا شوکیس...... دوسری پڑوسن کے ہاں بھجواتیں۔

نند کے بچے ہر مرتبہ برتن شہید کر کے جاتے تھے...... پہلی منزل والی خالہ کے ہاں سے اسٹیل کی رکابیاں منگوائی جاتیں کہ وہ بدتمیز اسی میں کھانے کے قابل تھے۔

میک اپ کا سامان بھی بھوسی ٹکڑوں میں چھپاتیں...... نند صاحبہ اور ان کی بڑی لڑکیاں میک اپ میں لت پت رہنے کی شوقین تھیں...... اور ان کا سامان ہمیشہ برباد کر کے جاتیں۔

فریزر کا گوشت وہ سبزی کے خانے میں چھپاتیں...... کہ نندوئی جب زیادہ گوشت دیکھ لیتے تھے تو فوراً حلیم کی فرمائش ہو جاتی تھی اور جب رات گئے نند کی سواری جاتی تو وہ ادھ موئی سی ہو کر گر جاتیں۔ مہمانوں کی ہڑبونگ کے لمحات ہفتوں پر محیط نظر آتے...... گھر سنگوانے اور چیزیں سیٹ کرنے میں اتنے ہی دن لگ جاتے کہ جب تک ان کا آنے کا وقت حلق کی رسی مزید تنگ کرنے لگتا۔

سسرال والوں کو دیکھ کر نہ صرف وہ نڈھال ہو جاتی تھیں بلکہ ادھ مری سی ہو جاتی تھیں۔

ٹیکسی خواہ کسی کی بھی ہوتی...... اگر ان کے فلیٹ کے سامنے ہارن دے کر وہ لمحے بھر کو رک جاتی تو اس کی آواز سن کر ان پر دورے پڑنے لگتے اور ان کے میاں جانی ان کے چہرے پر پانی مارتے ہوئے معصومیت بھرے لہجے میں کہتے۔ ''چھو...... جلد ہوش میں آؤ...... میں ابھی آپا کو فون کر کے بلاتا ہوں۔
تمہیں کیا ہو گیا ہے ہوش میں آؤ۔''

''اللہ آپا جلدی سے آ جاؤ...... میری چھو کو کیا ہو گیا...... آپ کے آنے سے کچھ تو تسلی ہو گی چھو کو۔''

کیسے کیسے لوگ

بعض دفعہ سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کی من پسند چیزیں کیوں دے دیتا ہے...... جس کے ہوتے وہ خوب تکبر کیا کرتے ہیں۔

اب شمو مامی نے چودہ لاکھ کی گاڑی کیا خرید لی تھی...... انہیں خاندان بھر کی گاڑیاں حقیر سی لگنے لگی تھیں اسی پر بس نہیں تھا...... اس میں بیٹھنے والے انہیں مہا حقیر سے لگا کرتے۔

''اللہ میں تو حق دق سی رہ گئی جب چچی جان اپنی بہو کے ساتھ اس پھٹکار ماری گاڑی میں میرے گھر آ گئیں...... میرا تو واچ مین بھی خوب ہنسا...... اور اندر آ کر کہنے لگا۔

''بیگم صاحبہ! آپ کے ہاں وہی مہمان آتے ہیں جن کو چلتے وقت گاڑی کو دھکا لگانا پڑتا ہے۔''

اب اس بے چارے نے یہ نہیں کہا کہ آپ تو اپنے مہمانوں کو دھکے نہیں دیتیں مگر ہم ان کو دیتے ہیں۔'' (ہی ہی ہی...... وہ ہنستیں۔ اور میرا غصے سے برا حال ہوتا) بڑی بھابی کی چھوٹی بہن اپنے عشق کے طفیل کسی امیر و کبیر فیملی میں کیا بیاہی گئی...... بڑی بھابی کے لہجے سے بھی ڈالر کے بھپکے آنے لگے تھے۔

''ہماری مونا کا صدقہ تو روزانہ ڈالر میں اترتا ہے، ہماری مونا تو صبح دو بجے اٹھتی ہے...... تو ملازمہ ٹرالی بھر کر ناشتا اس کے کمرے میں لے آتی ہے۔ پھر وہ شاپنگ پر چلی جاتی ہے...... رات کو روزانہ اپنے میاں کے ساتھ ہوٹلنگ کرتی ہے...... اس کے میاں نے کہہ دیا ہے اب اپنے غریب رشتے داروں سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

"مونا...... آپ سے کیوں ملتی ہے...... آپ مت ملا کریں اپنی بہن سے خواہ مخواہ بے چاری کی بے عزتی ہوتی ہو گی......" ایک دن جل کر میں نے کہہ دیا۔

"ارے واہ...... اس کا میاں تو مجھے آپا کہتا ہے...... اور کہہ رہا تھا کہ اب وہ امریکا مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔"

تب ان کی ذہنی حالت کو دیکھ کر میں خاموش ہو جاتی مگر ہماری فیملی میں سب سے زیادہ چھچھوری نجمہ باجی تھیں...... رشتہ تو ان سے نہ جانے کیا تھا...... مگر سب انہیں باجی کہتے تھے...... ڈاکٹری میں کئی سال فیل ہو کر نہ صرف وہ ڈاکٹر بن گئی تھیں بلکہ اپنے جیسے کسی نالائق ڈاکٹر سے انہوں نے شادی بھی کر لی تھی۔ پڑھنے کے دوران ہی شادی ہو گئی تھی۔ صرف ایک لڑکا تھا...... جسے دونوں میاں بیوی کھینچ تان کر وکیل بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پاکستان میں بے چارے وکیل کی نہ کوئی خاص آمدنی تھی اور نہ ہی کوئی خاص مرتبہ اس لیے نجمہ باجی اپنے وکیل بیٹے کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو گئیں...... ان سے منسلک کہانیاں اتنی زیادہ تھیں کہ لگتا تھا کہ وہ ان سے جان چھڑا کر یہاں سے بھاگی ہیں۔

کینیڈا میں جو عزیز و اقارب پہنچ چکے تھے ان سے انہوں نے کوئی رابطہ نہیں رکھا یا شاید کینیڈا میں وکیل کی بہت اہمیت ہوتی ہے کہ لوگ وکیل کے مشورے کے بغیر کسی کی بات کا جواب دینا پسند نہیں کرتے...... اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اونچے اونچے گھرانوں میں رشتہ دیکھنا شروع کیا۔

بڑے گھرانوں کے لوگوں نے انہیں بالکل بھی منہ نہ لگایا...... پاکستانی یا ہندوستانی لڑکوں کے مقابلوں میں امریکا اور یورپ کے پڑھے ہوئے لڑکوں کی شادی کا مسئلہ خاصا بڑا ہے کہ یہاں لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قبل ہی جاب اور شادی کے چکر میں پڑ جاتے ہیں......!

پھر نجمہ باجی...... (جنہوں نے اپنے آپ کو از خود ڈاکٹر نجمہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان میں تو وہ واقعی ڈاکٹر تھیں...... یہ دوسری بات تھی کہ کینیڈا میں آ کر انہیں ڈاکٹر کے بجائے ڈاکٹر کی ایک کلینک میں ہیلپر نرس کی جاب مل گئی تھی۔ جس کو جوائن کر کے وہ بہت خوش بھی تھیں) نے متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کو دیکھنا شروع کیا تو یہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئیں کہ کینیڈا میں بھی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ خاصا بڑا ہے کہ یہاں لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے قبل ہی جاب اور شادی کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ فریدہ آپا بڑی وضع دار خاتون تھیں...... ان کی بیٹی بے حد خوب صورت...... جس کے لیے وہ بھی کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا چاہتی تھی۔ اپنی ایک دوست کے توسط سے نجمہ باجی ان کے گھر پہنچیں...... ان کا لڑکا سب کو ہی پسند آیا...... سیدھا سادہ، کم گو...... جو محفل میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ جس نے لڑکی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

فریدہ آپا نے کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔

نجمہ باجی نے بڑی بے تکلفی سے کھانا کھایا اور ہنس کر کہا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ گاجر کا حلوا، مسالے والی بریانی اور سیخ کباب میرے بیٹے کی ہارٹ فیورٹ ڈشز ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم نے آپ کی پسند کے حساب سے پکایا......" فریدہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"آپ نے تو اتنا اچھا پکایا ہے کہ یقین کیجیے کھانا کھانے کے بعد بھی میری نیت نہیں بھری ہے...... اب کم از کم میں دو دن تک تو اپنے ہاتھ کا کھانا نہیں کھا سکتی۔" ان کی اس قدر تعریف سن کر فریدہ آپا نے بچا ہوا سارا کھانا انہیں پیک کر کے دیا۔

پندرہ دن کے بعد نجمہ کا فون آیا۔

"ہم آپ کے ہاں آنا چاہتے ہیں اور اپنے

غزل

دل وجاں کی تمناؤں کو میرے نام رہنے دو
محبت کی گھنی چھاؤں کو میرے نام رہنے دو
سنو تم! میں نے اس دل کے لیے دنیا بھلا ڈالی
سو اس کی دھڑکنوں، آہوں کو میرے نام رہنے دو
چمکتی شوخ آنکھوں کو نہ یوں موڑو کبھی مجھ سے
خدارا دل کی آشاؤں کو میرے نام رہنے دو
اگر تم بے وفا نکلے تو مر جاؤں گی میں اس پل
وفا کی تم سبھی راہوں کو میرے نام رہنے دو
یہی مانو کہ میری آخری پہلی یہ خواہش ہے
محبت کی پناہ گاہوں کو میرے نام رہنے دو
کرو وعدہ کہ خانَم کو کبھی تنہا نہ چھوڑو گے
تم اپنی ان کڑی بانہوں کو میرے نام رہنے دو

فریدہ خانَم، لاہور

ساتھ اپنی ایک سہیلی کو بھی لائیں گے۔

فریدہ آپا نے سوچا کہ رشتے کا معاملہ ہے...... شاید وہ لڑکی کو کسی اور کو بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہہ دیا۔

''آپ رات کا کھانا ہمارے گھر ہی کھائیے گا۔''

''اگر آپ نہ بھی کہتیں...... تو ہم کھانا کھائے بغیر نہیں جاتے...... میرا بیٹا تو کہہ رہا ہے کہ آنٹی کے ہاتھ میں جب اتنی لذت ہے تو ان کی بیٹی کو یقیناً پکانا تو ضرور آتا ہوگا۔'' وہ بولیں۔

''میری بیٹی ابھی سیکھ رہی ہے...... اسے جاب سے آنے کے بعد اتنا وقت نہیں ملتا کہ کوکنگ کر سکے، ہاں چھٹی کے دن وہ ضرور کنگ کرتی ہے۔'' فریدہ آپا نے صاف صاف بتایا۔

''ارے آپ کی بیٹی کو تو کوکنگ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، اتنی گوری ہے کہ باورچی خانے میں جائے گی تو میلی ہو جائے گی......'' نجمہ باجی نے اس قسم کی خوشامدانہ باتیں کر کے فون رکھ دیا۔

اس مرتبہ بھی وہ خوب کھانا ٹھونس کر گئیں اور بقیہ کھانا پیک کر کے ان کی فرمائش پر ان کے ساتھ گیا...... مگر رشتے کی کوئی بات نہیں کی گئی۔

دو مہینے میں وہ اسی طرح چھ مرتبہ آئیں کھانا ٹھونسا اور باقی ان کی فرمائش پر ساتھ باندھا گیا...... نہ انہوں نے رشتے کی بات کی اور نہ انہوں نے فریدہ آپا کو اپنے ہاں آنے کو کہا۔

فریدہ آپا کی اچانک کسی تقریب میں نجمہ باجی کی کزن سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو عرصے سے ایسا ہی کر رہی ہیں کہ لوگوں کے گھر جاتی ہیں، دعوتیں کھا کر کچھ عرصے کے بعد کہہ دیتی ہیں کہ ان کے لڑکے کا ابھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔

فریدہ آپا نے اگلے دن انہیں فون کر کے کہا۔

''آج ہم لوگ آپ کے ہاں آ رہے ہیں۔'' اس پر وہ بولیں۔

''آج تو ہم کہیں جا رہے ہیں...... اور یہ پورا مہینہ ہم لوگ اس قدر بزی ہیں کہ آپ کو بلا نہیں سکتے اور پھر میرے بیٹے نے داخلہ لے لیا ہے اس لیے فی الحال تو اس کا شادی کا بھی ارادہ نہیں ہے مگر وہ کہہ رہا تھا کہ امی، فریدہ آنٹی بہت اچھی ہیں ان کے ہاں ضرور جاؤں گا...... شاہی ٹکڑے تو وہی بنانا جانتی ہیں...... کیا پکاتی ہیں...... زبردست......! کسی دن فون کر کے ہم آئیں گے...... آپ تکلف نہ کیجیے گا بس شاہی ٹکڑے بنا لیجیے گا۔'' تب فریدہ جل کر بولیں۔

''میں اپنا اور اپنے بچوں کا صدقہ و خیرات جتنا کھلا سکتی تھی وہ آپ لوگوں کو کھلا دیا...... اب آپ لوگ کوئی نیا در ڈھونڈیں......''

نجمہ باجی کا مارے حیرت اور دکھ کے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''ضرور کسی رشتے دار نے یہ لگائی بجھائی کی ہوگی...... میرا سکھ تو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا...... کس قدر دکھ دیتے ہیں یہ لوگ......'' وہ سر پکڑے مغموم سی بیٹھی تھیں۔

☆☆☆



میرا انتخاب

آمنہ حماد

خوف کا ذائقہ زبان اور آنکھ میں ہمیشہ رہتا ہے...... اس کے ہاتھوں تنگ آ کر انسان خوشامدی اور ڈرپوک ہو جاتا ہے۔ خوف نہ صرف شخصیت کو کھا جاتا ہے بلکہ روح بھی اس کی زد میں آ کر کھوکھلی ہو جاتی ہے...... لیکن اگر خوف جذبۂ محبت میں ہو تو کچھ یہی رنگ نمایاں ہوتا ہے جو چراغ حسن حسرتؔ کی اس غزل میں نظر آ رہا ہے۔ جہلم سے کرن جہانگیر کا انتخاب۔

غزل

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
امیدِ وصل نے دھوکے دیے ہیں اس قدر حسرتؔ
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

❧📖❧

جذبۂ عشق نئی دنیاؤں کی دریافت کا حوصلہ عطا کرتا ہے...... ایسی دنیائیں جن کے طلسم میں اگر کھو جائیں تو جذبۂ شوق کہیں رکنے نہیں دیتا...... محبوب کی یادیں اور باتیں فیض احمد فیض کی نظم کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے میں مجسم نظر آ رہی ہیں۔ اس نظم کو شائستہ ریاض نے چکوال سے منتخب کیا ہے۔

کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پر بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
ان کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا
گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو

❧📖❧

محبت اپنا آپ ہر انسان سے منواتی ہے چاہے اس محبت کے کردار گویا ہوں یا خاموش رہیں، وہ کردار اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ محبت میں کردار کی اس اہمیت کو سلیم کوثر سمجھا رہے ہیں راولپنڈی سے انیشا زئی کا انتخاب۔

غزل

تارے جو کبھی اشک فشانی سے نکلتے
ہم چاند اٹھائے ہوئے پانی سے نکلتے
خاموش سہی مرکزی کردار تو ہم تھے
پھر کیسے بھلا تیری کہانی سے نکلتے
اِک عمر لگی تیری کشادہ نظری میں
اس تنگیِ داماں کو گرانی سے نکلتے
بس ایک ہی موسم کا تسلسل ہے یہ دنیا
کیا ہجر زدہ خواب جوانی سے نکلتے
وہ وقت بھی گزرا ہے کہ دیکھا نہیں تم نے
صحراؤں کو دریا کی روانی سے نکلتے
شاید کہ سلیم امن کی صورت نظر آتی
ہم لوگ اگر شعلہ بیانی سے نکلتے

ہمارا ماحول ہمارے دل پر اس طرح سے اپنا اثر ثبت کرتا ہے کہ ہم اپنے ارد گرد ہوتی اس خوں ریزی کا تاثر اپنے ذہن سے نہیں ہٹا پاتے اور اپنے معاشرے کے دکھ میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں کچھ یہی تاثر زہرہ نگاہ کی نظم میں نظر آتا ہے۔ اس کا انتخاب شازیہ حمیر نے کراچی سے کیا ہے۔

نظم

سنا ہے
جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے
شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ
حملہ نہیں کرتا
سنا ہے ہوا کے تیز جھونکوں میں
مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوّے کے انڈوں کو پیروں میں
تھام لیتی ہے
سنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو
سارا جنگل جاگ جاتا ہے
سنا ہے سیلاب آجائے تو لکڑی کے تختے پر
سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
منصفو! میرے ملک میں بھی
اب جنگل کا ہی کوئی دستور لے آؤ
آج کل جو خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے
وہ ختم کرو
جنگل کا دستور لے آؤ......

محبت ایک طاقت ہے اور طاقت وہ اہلیت ہے جو زندگی بدل کر رکھ دے...... محبت ایک ایسی طاقت ہے جو خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار کراتی ہے۔ اپنے خوابوں کی تعبیر میں ظریف احسن اچھے نظر آ رہے ہیں۔ لاہور سے صائمہ امین کا خوب صورت انتخاب۔

عکس

اس نے چاند
اور چاند نے اس کو دیکھا ہے
باتیں کرتے اور مسکاتے دیکھا ہے
اس منظر کو خوابیدہ سا
بدلی میں جاتے دیکھا ہے
سو ہم نے بھی
اِک دوجے کو
چاند، چکوری کی بے تابی میں
روتے ہنستے دیکھا ہے
عشاقی میں
خوب سنورتے
اور نکھرتے دیکھا ہے



زندگی کے حقائق

ہر رشتہ ایک معصوم پرندے کی طرح ہوتا ہے اگر سختی سے پکڑو گے تو مر جائے گا اگر بے پروائی سے پکڑو گے تو اُڑ جائے گا لیکن نرمی سے پکڑو گے تو ساری زندگی ساتھ نبھائے گا۔

مور ناچتے ہوئے بھی روتا ہے اور ہنس مرتے ہوئے بھی گاتا ہے، یہی زندگی کا دستور ہے۔ دکھ والی رات نیند نہیں آتی اور خوشی والی رات سوتا کون ہے۔

از: انیقہ انا، چکوال

گھر پیارا گھر

میں نے سنی کل رات یہ بات فرشتوں سے
پیار کا رشتہ اونچا ہے سب رشتوں سے
شوہر بہرہ، بیوی گونگی ہو تو پھر
اپنا گھر پیارا ہے لاکھ، بہشتوں سے

از: ارم کمال، فیصل آباد

نوٹ: (گڑیا...... اگر شوہر بہرے بھی ہوں تب بھی باڈی لینگویج سے سب کچھ جان لیتے ہیں کچھ نہ کہو تب بھی ہزار مطلب کشید کر لیا کرتے ہیں، ہاں)

میری خوشی تیرا غم

خوش رہو! اس لیے نہیں کہ آپ خوش رہنا چاہتے ہو
بلکہ! اس لیے کہ جو لوگ آپ کو خوش دیکھنا نہیں چاہتے ان کو آگ لگ جائے۔

از: فائزہ شہزاد، حیات آباد پشاور

میری تمام پاکیزہ بہنوں کے نام

راتوں کو اٹھ کر، خیالوں سے ہو کر
یادوں میں کھو کر، تمہیں کیا خبر ہے؟
میں اپنے خدا سے کیا مانگتی ہوں؟
ویرانوں میں جا کر، آنسو بہا کر
تمہیں کیا خبر ہے؟
میں اپنے خدا سے کیا مانگتی ہوں؟
تم تو کہو گے، صنم مانگتی ہوں
پیار مانگتی ہوں...... کسی دلربا کی، کسی دلنشیں کی
وفا مانگتی ہوں
یہ بھی غلط ہے، وہ بھی غلط ہے!
میں اپنے خدا سے صرف، تمہاری خوشی کی مانگتی ہوں دعا!

از: نور افشاں شیخ، شکار پور

محنت کا فائدہ

انسان پوری زندگی میں تین چیزوں کے لیے محنت بے حد زیادہ کرتا ہے۔
1۔ میرا نام اونچا ہو۔
2۔ میرا لباس اچھا ہو۔
3۔ میرا مکان خوب صورت ہو۔
لیکن فوت ہوتے ہی اللہ تعالیٰ.... سب سے پہلے اس کی انہی تین چیزوں کو بدل دیتا ہے۔
1۔ نام، مرحوم
2۔ لباس، کفن

3۔ مکان، قبر

مرسلہ: قمر شمس الحق جھنگ صدر

اعلیٰ زندگی کی چار نشانیاں

نیک نیت...... نیک گفتار
نیک کردار...... اور نیک بخت

از: سنبل ملک، تحصیل فیروز والا شاہدرہ

دل کی باتاں

جی تو چاہتا ہے کبھی آگ لگا کر دل کو
پھر کہیں دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھوں

☆☆☆

روز آجاتا ہے میرے دل کو تسلی دینے
تجھ سے جانانِ جاں تیرا خیال اچھا ہے

از: فرحت احمد، بن قاسم کراچی

پروین افضل شاہین، بھاول نگر کے نام

میں آپ کی تہِ دل سے مشکور ہوں کہ آپ نے میرے عزیز از جان بھائی کی وفات پر ان کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ ڈیئر خوشیوں کی گھڑیاں گزرنے میں تو پتا ہی نہیں چلتا مگر ایسی گھڑیاں جو ہر لمحہ دل کو چیر کر رکھ دیتی ہوں تو کسی کا ایک تسلی کا بول ہمارا مان بڑھا دیتا ہے۔

کوئی دیکھے تو سہی ان کی ہنسیوں کو محسن
کتنا روتے ہیں یہ لوگوں کو ہنسانے والے

از: سامعہ تبسم، ملتان

ہنسی

☆ ہنسنا کوئی بری بات تو نہیں مگر کچھ لوگوں کی ہنسی دیکھ کر خواہ مخواہ مرثیہ گوئی کو جی چاہتا ہے۔ ایک خاتون کسی معمولی بات پر ہنستے ہوئے بغیر اسپیڈ بریکر کے ہنستی ہی چلی جاتی ہیں مخاطب انتظار کرتا ہے کہ بات ختم ہو یعنی ہنسی تھمے لیکن ان کے آدھے جملے پر ہی وہ پھر سے ہنسنا شروع کر دیتی ہیں اتنا کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا جس پر وہ قمیص کا دامن اٹھا کر یوں آنکھیں صاف کرتی ہیں کہ دوسرے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔

از: فاخرہ گل، اٹلی

ارشد کے نام جو دنیا سے چلے گئے

کتنے برس گزر گئے تم سے جدا ہوئے
پھر تم نہ آسکو گے بتانا تو تھا مجھے
تم دور جا کے بس گئے میں ڈھونڈتی رہی
"آتے ہوئے اذاں ہوئی جاتے ہوئے نماز
اتنے قلیل وقت میں آئے چلے گئے"
کتنے برس گزر گئے تم سے جدا ہوئے

از: آریا سمین، لاہور

منہ بسورنے والوں کے نام

لڑکی، نجومی سے: میرے دو رشتے آئے ہیں ان دونوں میں سے کس کے ساتھ شادی ہوگی۔ کون خوش نصیب ہوگا۔

نجومی: دوسرے سے شادی ہوگی اور پہلا خوش نصیب ہوگا۔

جھوٹا کون

بیوی: تم نے مجھے شادی سے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہاری پہلے ہی رانی نام کی بیوی ہے۔

خاوند: میں نے بتایا تو تھا کہ میں تمہیں رانی کے ساتھ رکھوں گا۔

لطیفہ

سردار کے آٹھ بچوں میں ایک الگ ہی لگتا تھا۔ سردار مرنے لگا تو بیوی سے بولا۔ "اب تو بتا دو وہ کس کا ہے۔"

بیوی: "سردار، صرف وہی تمہارا ہے۔"

از: مصباح رضا سعید: فیصل آباد

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ سلیمہ علی...... گوادر
خود اپنے آپ کو الجھا لیا یہی تو کیا
سنوار کر تری زلفوں کو موبہ موہم نے

☆ صبا کمال...... فیصل آباد
ڈر ہے کہ رک نہ جائیں کہیں دل کی دھڑکنیں
مجھ کو دبی زباں سے پکارا نہ کیجیے

☆ ارم کمال...... فیصل آباد
جو پھول کھل اٹھے اسے ڈالی سے توڑ لو
ایسا ہمارے شہر کا دستور ہوگیا

☆ فضہ بتول...... بہارہ کہو
نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

☆ ماہ نور قیصر...... راول پنڈی
یوں تو اپنے قاصدانِ دل کے پاس
جانے کس کس کے لیے پیغام ہیں
جو لکھے جاتے ہیں اوروں کے نام
میرے وہ خط بھی تمہارے نام ہیں

☆ صبا سجاد...... دبئی
یہ تیرے خط تری خوشبو یہ تیرے خواب و خیال
متاعِ جاں ہیں ترے قول اور قسم کی طرح
گزشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح

☆ نورین ولی...... ملتان
ہمارے بعد جو آئیں انہیں مبارک ہو
جہاں تھے کنج وہاں کارخانے ہوگئے ہیں

☆ عنبرین...... گوجرانوالہ
عید آئی ہے مسرت کی پیامی بن کر
وہ مسرت جو تری دید سے وابستہ ہے
کیوں نہ ہو عید کی آمد سے مسرت دل کو
جب تری دید اسی عید سے وابستہ ہے

☆ جویریہ سہیل...... کراچی
تیری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
میرا من مور بن کے ناچتا ہے

☆ رضوانہ اسد...... کراچی
شام ہوتی ہیں تو یادیں بھی اتر آتی ہیں
جس طرح چڑیاں کہیں دور سے گھر آتی ہیں
اور لے جاتی ہے اک خواب ہوائیں اور پھر
ایک ہی شخص کی دہلیز پہ دھر آتی ہیں

☆ میمونہ عارف...... راول پنڈی
بہت عزیز ہیں آنکھیں مری اسے لیکن
وہ جاتے جاتے انہیں کر گیا ہے پُرنم پھر

☆ عرویہ ناز...... کوٹلی
قوتِ غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹنا مشکل

☆ فاطمہ عندلیب...... مانسہرہ
لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے

☆ فاطمہ بلال...... کینیڈا
شوق سے نیرنگیِ دنیا میں گم ہو جا سلیم
لیکن اتنا سوچ لے کیا یہ ترے قابل بھی ہے

☆ کرن شہزادی...... پنوں عاقل
تم سے ملنے کی دعا لب پہ نہ آجائے کہیں
چاند کو دیکھ کے یوں آنکھ چرالی ہم نے

☆ غزالہ طارق...... سرگودھا
میں فقط چلتی رہی منزل کو سر اس نے کیا
ساتھ میرے روشنی بن کر سفر اس نے کیا

☆ نگہت اعوان...... لاہور
کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

☆ عظمیٰ اعجاز...... ڈی جی خان
عقلِ انساں نے ستاروں کے بھی پر نوچ لیے
قلبِ انساں ہے مگر مائلِ پرواز ابھی
تجھ کو منزل پہ پہنچنے کا ہے دعویٰ ہمدم
مجھ کو انجام نظر آتا ہے آغاز ابھی

☆ انیقہ انا...... چکوال
کس منہ سے کہوں رشکِ عنادل ہوں میں
شاعر ہوں فصیح بے مماثل ہوں میں
حقا کوئی صنعت نہیں آتی مجھ کو
ہاں یہ ہے کہ نقصان میں کامل ہوں میں

☆ ظلِ ہما...... گوجر خان
نہ گھر ہی یاد ہے اب تو ہمیں نہ اپنا پتا
تری تلاش میں نکلے تو کھو دیا خود کو

☆ صائمہ بنگش...... کوہاٹ
شاید اس نے سچ گوئی سے توبہ کر لی
ناصر اس کی باتوں میں شیرینی ہے

☆ زینب نقوی...... پنوں عاقل
وہ جس پہ عمر لگی ہے مجھے منانے میں
اسی کا ہاتھ ہے شامل مجھے مٹانے میں
ہر ایک موڑ پہ اس نے دغا دیا مجھ کو
میں جس کو اپنا سمجھتا رہا زمانے میں

☆ نگہت حسین...... اسلام آباد
سارا الزام بصیرت پہ ہماری آیا
ہم نے اس عہد کی جب کم نظری لکھی ہے

☆ عرشیہ جنید...... کراچی
لاکھ آزار زمانے نے دیے ہیں پھر بھی
ہم نے ہونٹوں پہ تبسم کو سجائے رکھا

☆ جویریہ اعجاز...... کراچی
مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

☆ شہناز علی...... صوابی
واقف نہیں جو لوگ سفر کے اصول سے
سائے کی بھیک مانگ رہے ہیں ببول سے
میں آج تک سفر میں ہوں اس اعتماد پر
ابھریں گی منزلیں مرے قدموں کی دھول سے

☆ نگین شاہ...... لالہ موسیٰ
جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

☆ ایلیا عباس...... لاہور
چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تیری یادیں
سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں
تو جیسے مرے پاس ہے اور محوِ سخن ہے
محفل سی جمادیتی ہیں اکثر تری یادیں

☆ کائنات حلیم...... میر پور خاص
نالۂ آخرِ شب کس کو سناؤں ناصر
نیند پیاری ہے مرے دیس کے فن کاروں کو

☆ ممتاز خانم...... کراچی
ہر ایک مشکل کو دل سے نکال کر رکھا
یہ آئینہ تری خاطر سنبھال کر رکھا
جو دل دکھا بھی تو ہونٹوں سے پھول برسائے
خوشی کو ہم نے شریکِ ملال کر رکھا

☆ شاہین رحمٰن...... کوئٹہ
کیا لکھا تھا سرِ محضر، جسے پہچانتے ہی
پاس بیٹھا ہوا ہر دوست بہانے سے اٹھا
سونپ دے اپنا ہنر ان کو کہ جن کا حق ہے
وقت آیا ہے کہ اب سانپ خزانے سے اٹھا

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



باربی کیو بوٹی اور لچھا پراٹھا

اشیا: چکن، آدھا کلو (بغیر ہڈی کی بوٹیاں) نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک لہسن، (پسا ہوا) ایک کھانے کا چمچ۔ پسی ہوئی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ سفید زیرہ، (بھون کر پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ جائفل، جاوتری اور چھوٹی الائچی، (پسی ہوئی) ایک کھانے کا چمچ۔ دہی، دو کھانے کے چمچ۔ زردے کا رنگ، آدھا چائے کا چمچ۔ لیموں کا رس، دو کھانے کے چمچ۔ تیل یا گھی۔ حسبِ ضرورت۔

ترکیب: چکن میں نمک، ادرک لہسن، لال مرچ، سفید زیرہ، جائفل، جاوتری، چھوٹی الائچی، زردے کا رنگ اور لیموں کا رس لگا کر ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کوئلے دہکائیں یا اوون کو پندرہ منٹ پہلے 180c پر گرم کرلیں، مسالا لگی ہوئی بوٹیوں میں دہی ملا کر سیخوں پر لگائیں چاہیں تو کوئلوں پر سینک لیں یا اوون میں مکمل پکنے تک رکھیں۔ (بیس سے پچیس منٹ) بوٹیوں کو سیخوں سے نکال کر پراٹھے میں املی کی چٹنی کے ساتھ رول کرلیں۔

لچھا پراٹھا بنانے کے لیے: آدھا کلو میدہ لے کر اس میں آدھی پیالی سوجی، چٹکی بھر نمک، ایک کھانے کا چمچ گھی اور ایک کیلا میش کر کے ڈالیں۔ آدھی پیالی دودھ ڈالتے ہوئے اچھی طرح ملائیں اور گوندھ کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے ململ کے گیلے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ چھوٹے چھوٹے پراٹھے بیل کر ڈالتے ہوئے سینک لیں۔

رمشا خلیل، کراچی

تنوری تکے

اشیا: گوشت، (پتلے پارچے) آدھا کلو۔ پیاز، (باریک لچھے) ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ کچا پپیتا، آدھا پاؤ۔ زیرہ، ایک چھٹانک۔ تل، ایک چھٹانک۔ خشخاش، ایک چھٹانک۔ چنے بھنے ہوئے، آدھا پاؤ۔ لہسن، ایک پوتھی۔

ترکیب: پیاز اور دوسرے مسالے باری باری گھی میں سرخ کر کے نکال لیں۔ اب انہیں پیاز کے ساتھ سل پر باریک پیس لیں پھر ان میں پہلے پپیتا پیس کر ملائیں پھر پیاز ملائے ہوئے مسالے بھی شامل کر دیں اور اس مرکب کو خوب اچھی طرح ملالیں تاکہ اس کے تمام اجزا اچھی طرح گھل مل جائیں۔ اب پسی ہوئی ادرک، لہسن، نمک اور دہی بھی ملادیں۔ یہ مرکب گوشت کی بوٹیوں پر اس طرح لگائیں کہ بوٹیاں پوری طرح لتھڑ جائیں۔ انہیں کم از کم تین، گھنٹے تک اسی طرح رہنے دیں تاکہ گوشت کے ریشے مسالے جذب کر کے جلد گلنے کے قابل ہوجائیں۔ پھر انہیں کسی تھالی یا چوڑے برتن میں پھیلا کر تنور میں رکھ کر دم پر لگادیں۔ اس تھالی پر ڈھکنے یا سرپوش کی قسم کا کوئی نہ کوئی برتن ضرور ہونا چاہیے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سرپوش کو اٹھا کر تکوں کی حالت کا

اندازہ لگاتے رہیے اگر سرخی پر آگئے ہیں تو تھالی تنور سے نکال لیں اور گرم گرم تناول فرمائیں۔

مہوش رفیق، کراچی

ثابت ران

اشیا﴾ گوشت، سوا کلو (چھوٹے بکرے کی ٹانگ یا دستی کا سالم ٹکڑا صاف کرالیں)۔ سرکہ، ایک پیالی۔ کالی مرچ، 3/4 چھٹانک۔ ادرک، آدھا چھٹانک۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب﴾ گوشت کے ٹکڑے کو کانٹے سے اچھی طرح گودلیں۔ اب ادرک کو باریک پیس لیں۔ اس میں کالی مرچ اور نمک پیس کر ملادیں۔ یہ سب پسا ہوا مسالا سرکے میں ملادیں۔ یہ سرکہ گوشت کے اوپر اچھی طرح مل دیں، جو بچے وہ بھی اس پر ڈال دیں اور گوشت کو ایک دو گھنٹے تک ایسے ہی رہنے دیں۔ پھر ایک برتن میں گھی ڈال کر اس میں گوشت کا ٹکڑا ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر سرخ ہونے دیں۔ جب یہ سرخ ہوجائے تو اس میں اتنا پانی ڈال دیں کہ وہ ٹکڑا گل جائے۔ گلنے پر اسے دوبارہ سرخ کریں اور نکال کر ثابت کا ثابت ڈش میں رکھ کر پیش کریں۔

آمنہ خلیل، کراچی

تکہ بوٹی

اشیا﴾ گوشت، آدھا کلو۔ دستی کا بغیر ہڈی چوکور ٹکڑے کرلیں۔ دہی، ایک چھٹانک۔ گرم مسالا پسا ہوا، ایک چمچ۔ نمک، لال مرچ، حسبِ ذائقہ۔ ادرک، 3/4 چھٹانک۔ لہسن، چھ جوے۔ دھنیا خشک، ایک چمچ۔ زیرہ سفید پسا ہوا، ایک چمچ۔

ترکیب﴾ گوشت کے ٹکڑوں کو ابال لیں۔ نیم گل جائیں تو پانی خشک کرکے اتارلیں۔ سب مسالا پیس کر دہی میں ملادیں اور گوشت کے ٹکڑوں کو ٹھنڈا کر کے ان پر اچھی طرح لگادیں۔ یہ ٹکڑے سیخ پر چڑھادیں اور کوئلوں پر کباب کی طرح سینک کر سرخ کرلیں۔ ساتھ ساتھ ان پر چمچ کے ساتھ ذرا ذرا گھی ٹپکاتے جائیں۔ سرخ ہونے پر اتارلیں اور کٹی ہوئی پیاز اور سلاد کے ساتھ تناول فرمائیں۔

ثمینہ سلیم، حیدرآباد

دہی چانپ

اشیا﴾ چانپ، آٹھ عدد۔ (ہلکا سا کچل لیں) دہی، ڈیڑھ پاؤ۔ لہسن، دس جوے۔ (ان سب کو پیس کر دہی میں ملالیں) ادرک، دو انچ کا ٹکڑا۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ ہری مرچ حسبِ ذائقہ ہلدی آدھا چمچ (پیس کر دہی میں ملالیں)۔ کالی مرچ، دس عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ پیاز، دو عدد۔ (باریک کاٹ کر بادامی رنگ میں تل لیں)

ترکیب﴾ چانپوں پر دہی اور مسالا اچھی طرح لگالیں اور انہیں تقریباً ایک گھنٹے تک رکھ چھوڑیں پھر گھی گرم کرکے انہیں دہی کے ساتھ تل لیں۔ جب سرخ ہوجائیں اور گل بھی جائیں تو اتارلیں۔ نکالتے وقت اوپر تلی ہوئی پیاز ڈال دیں۔

راحیلہ خان، حیدرآباد

بھیجہ

اشیا﴾ بھیجے بکری کے، چار عدد۔ (گرم پانی میں صاف کرلیں) ادرک، (پیس لیں)۔ ایک انچ کا ٹکڑا۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی (کاٹ لیں)۔ پودینا، پاؤ گٹھی۔ ہری مرچ، حسبِ منشا۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب﴾ برتن میں پہلے گھی ڈال کر پھر پسی ہوئی ادرک ڈال کر تلیں اس کے بعد بھیجے ڈال دیں اور احتیاط سے چند منٹ تک تلیں پھر کٹا ہوا ہرا دھنیا مسالا اور نمک ملائیں اور برتن کا ڈھکن بند کرکے ہلکی آنچ پر چند منٹ پکائیں۔ سالن تیار ہے۔ گرم گرم پیش کریں۔

رداحنیف خان، کراچی

☆☆☆

روحانی مشورے



ادارہ

شادی کے بعد کی دعائیں

ہر لڑکی کو منگنی و شادی کے بعد پچھلی دعاؤں کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے اکابر علما و مشائخ سے منقول یہ دعائیں اپنے ورد میں رکھنی چاہئیں۔

"اے اللہ! میرے اور میرے شوہر کے دل میں محبت اور الفت ایسے بھر دے اور ہمارے دلوں کو ایسے ملادے جیسے محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کے دلوں کو ملادیا تھا اور اے اللہ! میرے اور میرے شوہر کے دلوں کو ایسا ملادے جیسے محمد ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے دلوں کو الفت و محبت سے ملادیا تھا۔"

"اے اللہ! جس طرح تو نے اپنے کرم سے ہمیں دنیا میں اکٹھا فرمادیا، جنت میں بھی ہم دونوں کو اکٹھا فرما۔"

"اے اللہ! مجھے اپنے شوہر کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔"

"اے اللہ! تو مجھے اپنی اطاعت اور اپنے شوہر کی جائز باتوں میں اطاعت کرنے والی بنا اور نیک بنا اور اے اللہ!...... مجھے شوہر کو خوش کرنے والی بنا، جب بھی وہ مجھے دیکھے تو خوش ہو اور شوہر کے مال، عزت اور راز کی حفاظت کرنے والی بنا، آمین یا ربّ العالمین۔" یہ دعائیں تہجد کی نماز کے بعد اور ہر فرض نماز کے بعد اسی طرح رمضان المبارک میں افطاری کے وقت، دورانِ حج و عمرہ، حجازِ مقدس کے مبارک مقامات پر اور چلتے پھرتے خوب مانگنی چاہئیں، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں عطا فرمادیں تو پورے خاندان کو اور آنے والی نسلوں کو دنیا و آخرت کی بھلائی مل گئی۔

1۔ ہر فرض نماز کے بعد دعا ضرور قبول ہوتی ہے اس لیے فرض نماز کے بعد اہتمام سے دعا مانگنی چاہیے۔

2۔ دعا شروع کرنے سے پہلے پروردگار عالم کی خوب حمد وثنا بیان کرے، پھر نبی کریم ﷺ پر درود شریف بھیجے، پھر اپنے لیے، گھر والوں کے لیے، تمام مسلمان بہن، بھائیوں کے لیے اور سارے عالم کے مسلمانوں کے لیے دعا مانگے، پھر کافروں کی ہدایت کے لیے دعا مانگے، جہاں مسلمان پریشانیوں، بلاؤں اور مصیبتوں میں ہیں ان کے لیے بھی عافیت کی دعائیں مانگے۔

3۔ کم از کم روزانہ بیس منٹ دعا مانگے، اگر ایک ساتھ نہ ہوسکے تو تقسیم کرلے، ایسے وقتوں پر جو زیادہ مصروفیت کے نہ ہوں مثلاً فجر کی نماز کے بعد پانچ پانچ منٹ، عشا کی نماز کے بعد دس منٹ، تہجد میں اٹھنے کی توفیق ہو تو اس میں بھی خوب دعا مانگے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ سہیلیوں، بہنوں سے فون پر بات کرتے ہوئے کتنا وقت لگ جاتا ہے، شادی، دعوتوں، محفلوں میں کتنا وقت ہم اپنا کھودیتے ہیں لیکن بیس منٹ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے مالک رحیم وکریم آقا سے دعا مانگتے ہوئے اکتاتے ہیں، حالانکہ وہ آقا ایسا ہے کہ مانگنے والے تھک جائیں لیکن وہ دیتے دیتے نہ تھکے۔

دنیا میں جس سے بھی مانگا جائے وہ ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ طے کرلیں کہ کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں مانگوں گی، کسی بھی طرح کی ضرورت ہو تو اللہ

تعالیٰ ہی سے مانگے، شوہر سے، بھائی سے، بیٹوں سے کسی سے بھی کچھ نہ مانگے، انسان سارے کے سارے خود ہی محتاج اور فقیر ہیں، وہ کسی کو کیا دیں گے، جس کے پاس جو کچھ ہے اسی اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اللہ کی ذات غنی ہے، اسی سے مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ پانی کی پیاس لگے تو بھی پہلے اللہ تعالیٰ سے مانگے۔

بیوی رات کو اٹھ کر اللہ سے یہ دعا مانگے

میاں بیوی میں محبت پیدا کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے دعائیں کرتے رہیں، ''انشاء اللہ تعالیٰ چند دنوں میں ایسی محبت پیدا ہوجائے گی ۔۔۔۔۔کہ جس کا دونوں کو وہم وگمان بھی نہیں ہوگا۔ (یہ دعا تہجد کے وقت مانگیں) یاد رکھیے! اینٹ سے ملانے کے لیے سیمنٹ کی ضرورت ہے، لکڑی کو لکڑی سے ملانے کے لیے کیل کی ضرورت ہے، کاغذ کو کاغذ سے ملانے کے لیے گوند کی ضرورت ہے لیکن دو دلوں کو ملانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ظاہری تدبیر بیوی کی طرف سے ''اطاعت'' شوہر کی ہر بات پر ''جی ہاں'' ''جی ہاں'' ''اچھا'' ''اچھا'' ''آئندہ نہیں ہوگا'' ''آئندہ نہیں ہوگا'' ''جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی کروں گی'' ''جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی کروں گی'' اطاعت اور فرمانبرداری، محبت پیدا کرے گی۔

اللہ تعالیٰ سے اولاد مانگنے کی تین دعائیں

1۔ جس شخص کی اولاد نہ ہو یا نرینہ اولاد نہ ہو، وہ ذیل کی دعا کثرت سے مانگا کرے۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ہ

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ، اور تو بہترین وارث ہے۔''

اگر ہو سکے تو دو رکعت ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کی نیت سے پڑھے اور پھر دعا مانگے، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے جو شخص تنہائی میں دو رکعت نماز پڑھے، جس کو اللہ اور اس کے فرشتوں کے سوا کوئی نہ دیکھے تو اس کو جہنم کی آگ سے بری ہونے کا پروانہ مل جاتا ہے۔

اور جو شخص دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ وہ دعا قبول فرمالیتا ہے، خواہ فوراً یا کسی مصلحت سے کچھ دیر کے بعد مگر قبول ضرور فرماتا ہے۔

2۔ حضرت زکریاؑ نے طلب اولاد کے لیے دعا مانگی تھی۔ جس کو اللہ تبارک تعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو حضرت یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔

اللہ کی محبت، ہماری طمانیت اور خوشی

ہر مسلمان اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو لانے کی کوشش کرے، ہر وقت اس کے خیال و تصور میں رہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ بار بار اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مقدسہ کو بیان کرے اور خود اللہ تعالیٰ سے ان صفات کا یقین و دھیان مانگتا رہے۔

اٹھتے بیٹھتے کہتا رہے کہ اے اللہ! تیرے سوا کوئی دل لگانے کے قابل ہی نہیں۔

اے اللہ! تو ہی نے مجھے پیدا کیا، تو ہی نے مجھے آنکھ، ہاتھ پاؤں اور عقل و سمجھ دی۔

اے اللہ! مجھ پر مزید کرم کردے، میرے دل میں اپنی محبت بسا دے، میرے دل کو غیر کے اثر سے پاک صاف کردے۔

اے اللہ! تیرے بنانے سے ہی ہمارے سارے کام بنتے ہیں، صحت و تن درستی تو صرف تیرے حکم سے ہی نصیب ہوتی ہے۔

اے اللہ! تیرے سوا کوئی پیدا کرنے والا نہیں، اولاد دینے والا نہیں، تیرے سوا کوئی اطمینان و سکون دینے والا نہیں۔

اے اللہ! تمام تر حالات پر صرف اور صرف تیرا ہی قبضہ ہے، اچھے برے تمام حالات، تیرے حکم ہی سے آتے ہیں۔

اے اللہ! ہمارے حالات بھی درست اور اچھے کردے، ہماری بگڑی بنا دے، ہماری پریشانیوں کو سکون سے بدل دے۔

بار بار کی اس طرح کی مناجات سے ہمارا دل حقیقی معنوں میں اس پاک ذات کی جانب راغب ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور قرب کے پھل ہمیں بھی نصیب ہوں گے۔

ہر نماز کے بعد کی دعا

اے میرے خدا! اگر تو نے مجھے اپنے در سے دُھتکار دیا تو میں کس کے در پر جا کر پناہ پکڑوں گی؟

اے اللہ! اگر تو نے مجھے اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول نہیں فرمایا تو میں کس در سے امید رکھوں گی۔

اے معافی کو پسند کرنے والے! مجھے اپنے گناہوں کی معافی دے کر ٹھنڈک عطا فرما اور معافی دینے کے بعد گناہوں کے بخش دینے کی حلاوت (مٹھاس) نصیب فرما۔

اگرچہ میں اس کی اہلیت نہیں رکھتی لیکن بے شک تیری ہی ذات ہے جس سے ڈرا جائے، تجھ ہی سے معافی طلب کرنا تیرے شایانِ شان ہے۔''

اس کے بعد جو جی چاہے اپنے لیے، شوہر کے لیے، اولاد کے لیے اور سارے عالم بھر کے مسلمانوں کے لیے مانگیں اور تجربہ ہے کہ جب یقین کے ساتھ مانگیں تو دعائیں بہت زیادہ اور بہت جلد قبول ہوتی ہیں۔

*



شوابے ہومیو کلینک



from Nature for Health



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

کمر میں خم

تنویر احمد فاروقی ...... کراچی

سوال۔ جناب طبیب صاحب میری کمر میں کُب واقع ہو گیا ہے۔ میں جھک کر چلتا ہوں جو کہ میری عادت بن چکی ہے۔ کمر کے جھک جانے یا میری بے خیالی یا لاشعوری طور پر خود سے جھک جانے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں جس کی وجہ سے میرے بزرگ اور بھائی صاحب کہتے ہیں کہ تم جھک کر کیوں چلتے ہو؟ میں سوچتا ہوں کہ کہیں ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں کمزوری یا لچک تو واقع نہیں ہوگئی ہے جس کی وجہ سے میں اس حالتِ زار میں مبتلا ہوں۔ میری عمر سترہ برس ہے۔ براہِ کرم اس ضمن میں آپ میرے لیے کوئی نسخہ یا ورزش تجویز فرمائیں۔

جواب:۔ آپ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی کمر کا ایکسرے یعنی ریڑھ کی ہڈی کا ایکسرے کرائیں اور اس کی رپورٹ ہمیں بھیج دیں یا خود لے آئیں۔ انڈا، دودھ کا استعمال کریں اور ورزش خصوصاً کمر کی ضرور کریں۔ رسّی کودا کریں اور ہمیشہ سیدھا بیٹھیں کہ کندھے پیچھے کی جانب ہوں۔ اسی طرح سیدھے سینہ نکال کر چلا کریں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کیا کریں۔ مہینے میں ایک دفعہ Tuberculinum 200 ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کے 10 قطرے آدھا کپ پانی میں لیں اور 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ Calc Fluor 30 استعمال کریں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

دسمبر 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ________

پتا: ________

____

بُرے کام کے بُرے اثرات

ایک ظالم مگر دُکھی انسان ...... کراچی

اس فعل کے باعث میں ایک متعدی و دیگر امراض کا بھی شکار ہوں جن میں حافظہ کی کمزوری، معدہ کی خرابی اور گیس کی شکایت وغیرہ شامل ہیں۔ نیز میں دائمی نزلے کا بھی شکار ہوں۔ بلغم بہت آتا ہے اس کے علاوہ کان کی تکلیف میں بھی مبتلا رہتا ہوں۔ یہ تکلیف مجھے عرصہ دو سال سے ہے۔ میرے کانوں کے باہر کان کی لو کے قریب یا بیرونی کان کے سب سے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا دانہ ہو جاتا ہے جو خود بخود کچھ عرصے بعد غائب ہو جاتا ہے نیز کانوں سے صفائی کے باوجود براؤن رنگ کا ایک مادّہ نکلتا ہے جس سے ایک عجیب سی بُو آتی ہے۔ سب سے اہم مسئلہ جو مجھے درپیش ہے وہ میری کم ہمتی ہے۔ اس دور میں جبکہ دُکھی انسانیت کی خدمت کرنے اور وطن سے محبت کا حق ادا کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن جب میں اپنے جسم کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں کہ کاش میں اس قابل ہوتا کہ خود اپنا ہی دفاع کرسکوں۔

ان تمام حالات میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کے ساتھ ساتھ علاج کے لیے میں نے استخارہ کے نتیجے میں ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کا انتخاب کیا ہے۔ آپ سے مدد کی درخواست ہے براہِ مہربانی میرے سوال کا جواب پاکیزہ کے ذریعے ضرور دینا میں عمر بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔

جواب:۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کے کنٹرول میں ساری کائنات کو دے دیا ہے پھر آپ یہ کیوں محسوس کرتے ہیں کہ آپ کسی اور کے کنٹرول میں ہیں۔ وجہ صرف ماحول کی خرابی میں نہیں آپ کے اپنے اندر خرابی ہے۔ اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی ذات کریم پر رکھیں، پانچ وقت نماز کی پابندی کریں، کبھی کبھی نفلی روزہ بھی رکھ لیا کریں، اچھے لوگوں کی کتابیں پڑھیں، فلموں سے اجتناب برتیں، اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کریں، ورزش بھی کریں، رات کھانے کے بعد ٹہل لیا کریں اور سونے سے کم سے کم دو گھنٹے پہلے کھانا کھا لیا کریں اور یہ ادویات استعمال کریں۔ Kali Phos 30 ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی 5, 5 قطرے تھوڑے سے پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں اور Alfalfa Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔



ذہنی پراگندگی

طالب علم معین الدین شیخ ...... نواب شاہ

عرض یہ ہے کہ میں ہومیو پیتھی کا فرسٹ ایئر کا طالب علم ہوں اور اس بیماری کے لیے دوا چاہتا ہوں جو میرے ایک دوست کو لاحق ہے اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ صحیح مشورے سے نوازیں گے۔ رات کو سوتے میں کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ ساتھ پس وغیرہ بھی ہوتی ہے، ذہن کمزور رہتا ہے، منہ پر دانے ہیں جس میں پیپ ہو جاتی ہے، فلم وغیرہ دیکھنے سے پس خارج ہو جاتی ہے، ویسے بدن بھرا ہوا ہے، صحت بھی ٹھیک ٹھاک ہے کوئی کمزوری وغیرہ نہیں ہے۔ ایلو پیتھک علاج کروا چکا ہے پر کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے، سارے بدن میں تھکاوٹ رہتی ہے اور بدن درد کرتا ہے، سستی بہت رہتی ہے اور سارا دن سونے کو دل کرتا ہے، کسی کام میں دل نہیں لگتا، بے چینی رہتی ہے۔

سردیوں کی خصوصی بیماریوں سے کیسے بچا جائے؟

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ سردیوں کا موسم بڑا ہی صحت بخش ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھوک بڑھ جاتی ہے اور خوب کھایا جاتا ہے جس کا قوتِ مدافعت پر اچھا اثر پڑتا ہے اور بیماریاں کم ہوجاتی ہیں۔ مچھر اور مکھیاں بھی کم سے کم ہوتے ہیں جس سے بیماریاں بھی کم پھیلتی ہیں۔ ایک حد تک یہ بات بالکل دُرست ہے لیکن دوسری طرف دیکھیں کہ کچھ بیماریاں بڑھ جاتی ہیں۔ نزلہ، کھانسی، دمہ، ٹھنڈ لگنے سے بخار، دست، حملۂ قلب، گردے کا انفیکشن اور بد ہضمی وغیرہ۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ درجہ حرارت کی کمی کے بعد گرم کپڑوں کا استعمال نہ کرنا خصوصاً نوجوان بچوں میں۔

2۔ موسم کی سبزیوں اور پھلوں کا استعمال نہ کرنا جیسا کہ کینو، موسمبی وغیرہ جو وٹامن سی کے حامل ہوتے ہیں اور نزلہ زکام سے بچاتے ہیں۔

3۔ چونکہ پیاس کم لگتی ہے اس لیے پانی کم سے کم پیا جاتا ہے۔ یوں گردے اور پیشاب کے امراض بڑھ جاتے ہیں (پتھری، انفیکشن وغیرہ)

4۔ نہاتے بھی کم ہیں جو جلدی امراض میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

5۔ آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کا استعمال بھی نہیں چھوڑتے جو کہ گلے و نزلہ کے مرض میں اضافے کا باعث ہے۔

6۔ ڈرائی فروٹ کا ایک حد تک استعمال بڑا مفید ہے لیکن حد سے زیادہ استعمال ہاضمہ اور دل کے لیے مفید نہیں ہے۔

7۔ مرغن غذاؤں کا استعمال بھی بڑھ جاتا ہے اور سردی کی شدت کی وجہ سے نہ ورزش ہوتی ہے اور نہ کوئی ورزشی کام لہٰذا یہ وزن میں اضافہ، کولیسٹرول و شوگر میں اضافہ کا باعث بھی ہے جو ہارٹ اٹیک، انجائنا اور بلڈ پریشر میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

8۔ چائے اور کافی کا استعمال ایک حد تک بڑا مفید ہے لیکن حد سے زیادہ استعمال ہاضمے کی خرابی، معدے کی تیزابیت، قبض، بھوک کی کمی اور وزن کی زیادتی کا سبب بنتا ہے۔

بچاؤ:۔

ان سب چیزوں سے بچاؤ بہت آسان ہے بس صرف مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

1۔ پانی کے استعمال میں بہت زیادہ کمی نہ کریں۔ بڑے 6 سے 8 گلاس اور بچے 4 سے 6 گلاس پانی ضرور پئیں۔

2۔ کافی اور چائے کی 1 سے 3 پیالیوں سے زیادہ استعمال نہ کریں۔

3۔ موسم کے پھل اور سبزیاں ضرور غذا میں شامل کریں۔

4۔ ورزش کو ضرور معمول بنائیں۔

5۔ مرغن غذاؤں اور خشک میوہ جات کا استعمال اپنے کام اور ورزش کے حساب سے رکھیں۔

6۔ وزن کو ہرگز نہ بڑھنے دیں۔

7۔ درجہ حرارت میں کمی کے ساتھ ہی گرم کپڑوں کا استعمال بڑھائیں۔ یاد رکھیں سردی سر، کان، گردن، چہرہ، ہاتھ اور پاؤں سے بھی لگتی ہے۔ لہٰذا سردی کی شدت میں ان کو بھی ڈھانپنے کا بندوبست ضرور کریں۔

8۔ جو لوگ یا جن کی فیملی میں بلڈ پریشر، دل کے امراض اور ذیابیطس ہے وہ لوگ خصوصاً ان امراض کی علامتوں پر گہری نظر رکھیں اور اپنے خون کو چیک کراتے رہیں۔

***